

فقیرانہ آئے

رفیق احمد بایجواہ

بک کارپوریشن، حیدرآباد، ۴۰ رازد و بازار لائونڈری

1409

1409

مکتبہ اسلامیہ



۱۴۰۹

مکتبہ اسلامیہ

س

صداکری حط

رفیق احمد باجوہ

بنک کارپوریشن رجسٹرڈ ۲۰ اردو بازار لاہور

59231

جملہ حقوق میری بیٹیوں اور پوتیوں کے نام محفوظ ہیں

مصنف _____ رفیق احمد باجواہ

پبلشر _____ ایم حفیظ اللہ انبالوی

بک کارپوریشن رجسٹرڈ

اردو بازار لاہور

تعداد _____ ایک ہزار

مطبع _____ آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس

اردو بازار لاہور

قیمت _____ ۵۰ روپے

۶۱۹۸۶

فہرست

صفحہ	عنوان	بر شمار
۷	اٹھتے ہیں حجاب آخر	۱
۱۶	ایک نعت	۲
۲۲	اولین آئینی تھا ضا کیا ہو	۳
۳۵	کس کی زباں کے پھر ہم نہ اگر سنا سکے	۴
۴۶	کیا نہیں کوئی غزنوی کارگر حیات میں	۵
۵۳	فیصلہ تیرا، تیرے ہاتھوں میں ہے	۶
۶۱	سلسلہ روز و شب، نقش گر حادثات	۷
۷۰	علاج کچھ اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں	۸
۷۸	کھیل بچوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا	۹
۸۸	یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا	۱۰
۹۷	جناب صدر! آپ زیر امتحان ہیں	۱۱
۱۰۷	سو جا راج دلارے سو جا	۱۲
۱۱۸	جناب صدر! چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے	۱۳

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۲۶	سرمدہ مفت "نذر" ہوں	۱۲
	جناب صدر! صدر کیا ہوگا	۱۵
۱۳۶	امرہم شوریٰ بینہم یا "امرہم" شوریٰ بینہم	
۱۳۶	پرانی سیاست گرمی خوار ہے، مگر؟	۱۶
۱۵۵	جناب صدر! ایک جام اور	۱۷
۱۶۶	جناب صدر! اب رزم حق و باطل بھی ہے اور حلقہ یاراں بھی	۱۸
۱۷۵	جناب والا! حاکمیت اللہ ہی کی ہے لٹائیے نہیں لوٹائیے	۱۹
۱۸۵	جیتوں تو پیا میرے، ہاروں تو پیا تیری	۲۰
۱۹۲	یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے	۲۱
۲۰۰	جناب صدر! یہ دوریاں یہ فلصلے	۲۲
۲۰۸	ہائے! اس زودیشیاں کا پشیاں ہونا	۲۳
۲۱۵	جتنی لے دے ستاریاں والی	۲۴
۲۲۶	مُشتری ہوشیار باش	۲۵
۲۳۲	کچھ ہم سے سنا ہوتا کچھ ہم سے کہا ہوتا	۲۶
۲۴۰	فقیرانہ آئے صدا کر چلے	۲۷
۲۴۶	رکو! کہ یہ چال قیامت کی چال ہے	۲۸
۲۵۵	شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات	۲۹
۲۶۶	جناب صدر! شرح صدر درکار ہے	۳۰
۲۷۵	وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے	۳۱
۲۸۱	چلے بھی جاؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے	۳۲

صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۲۹۱	بتوں سے امیدیں خدا سے نومیدی	۳۳
۳۰۱	پلا مار کے بجھا دے دیوا	۳۴
۳۰۹	ویر میر یا کرسی کندی آ	۳۵
۳۱۸	جناب صدر! تاریخ نے قلم اٹھا لیا ہے	۳۶
۳۲۶	اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے	۳۷
۳۳۶	کی نہ بتوں نے وفا تو خدا یاد آیا	۳۸
۳۴۳	عن صلاتھم ساھون	۳۹
۳۵۴	عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے	۴۰
۳۶۲	جی سکتے ہیں بے روشنی دانش و فرہنگ	۴۱
۳۷۰	مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری	۴۲
	ایک بجٹ ، دو چھٹیاں !	۴۳
۳۷۹	کوئی بتلاؤ ، کہ ہم بتلائیں کیا	
	یا نارا کوئی بردا	۴۴
۳۸۸	محترم وزیر باتدبیر راجہ ظفر الحق کی نذر	
	”ترامیم = آئین کے آئینہ میں“	۴۵
۴۰۰	” آئینہ ایام = ترامیم کے جلو میں“	



اُٹھتے ہیں محبِ با آفر

اے طبعِ جولان، اے گرفتگی، لہو و شیفنگی، لب، مزید کھل کھیل۔ بطرز کمنہ،
 با انداز نو، بطریق کتھک، بطور سمبھا۔ ہر چند کہ تمدن، تصوف، شریعت، کلام
 بتانِ عجم کے بچاری ہو چکے، اُمتِ روایات میں کھو چکی، تاہم کنایہ حاکمیت کے احترام
 اور تیری عقلی و جسمی سالمیت کے لئے لازم و ضرور ہے کہ تو سنگ سنگ کھل کھیلے۔
 مزید کھل کھیل کہ تحفظ افتد ار کا یہ انداز جیولس سیزر سے بھی بہت پہلے انسانوں کو
 غلام رکھنے کے ماہر آریوں نے بہ فیضِ شوچی اپنالیا تھا۔ اور بادشاہت ہو کہ
 فسطائیت، جمہوریت ہو کہ پاپائیت، یہ نسخہ ہمیشہ کارگر رہا کہ عوام الناس کو
 ماضی فراموش، بے خبرِ حال اور بے پروائے مستقبل رکھنے کے لئے آدرشوں کے
 آئینے بہت اونچے لٹکائے جائیں۔ اتنے بلند کہ کسی صورت بھی یہ فرشتی اپنی صورت
 دیکھ نہ پائیں۔ اسی صورت حال سے متحیر رہیں کہ ان آیلنوں میں مزین چھت
 نظر آتی ہے، منقش فرش کیوں نظر نہیں آتا۔ سہیل ”رنا“ نظر آتا ہے، سامانِ
 دفاع میں سے کسی بندوق کی لیبی تک بھی کیوں نظر نہیں آتی۔ کیا سارے میدان
 آزاد بندوں کی نذر ہو گئے کہ عظیم ترین جشن بھی چادر اور چار دیواری کی زد میں آگئے۔
 چادر اہلِ ردانے لپیٹ لی، اہلِ وفانے اوڑھ لی یا اہلِ دفانے پھاڑ ڈالی۔

چار دیواری کس کے مصرف میں لائی گئی۔ منڈی کے، جیل کے یا تفریح گاہ کے۔ آزادی
 دن بھر ناچی، تسلط نے رات بھر دیئے جلائے مگر کوئی راز نہ کھلا۔ کوئی عقدہ کشا
 نہ ہوا، کوئی انگ نمایاں نہ ہوا، کسی بھی بھاؤ سے پلو نہ چھٹا۔ بیتے دنوں پہ کیا
 گزری، حال کا گزارا کس پر ہے۔ آئندہ گزرنے سے پہلے کیا تقاضے کر رہا ہے۔ ذرہ
 ذرہ کان لگائے بیٹھا رہا مگر کسی نے بیان نہ کیا۔ درِ داخلہ پر درِ یوزہ گر اور درِ
 خارجہ پر درِ دیدہ نگاہ بیٹھے رہے۔ پوری فضا پتلونیں اتار شلواریں پہنتی بحرِ فلسفہ
 لسان و لباس میں اپنے عکس معکوس کو غش غش کرتے دیکھتی رہی۔ پاؤں تھرکے،
 جھانجھان نہ چھنکی۔ آسن جھے، آسن بھرنے آئی۔ لے جھی، سرنہ لکھے۔ ہونٹ تھرکے، نغے
 نہ پھوٹے۔ جہان شاہیں دن بھر مترنم کرگسوں کی زد میں رہا، مجاہدوں کی چپ راست
 سے آشنا نہ ہو سکا۔ چمن زار محبت میں بیلِ خاموش گل ہائے خنداں کا منتظر من
 ہی من میں گریہ ہائے بے اختیار کو لوریاں دیتا رہا۔ صفا مقبروں پر تبدیل ہوتے
 پہروں پر پھڑ پھڑاتا رہا اور شبِ ویران کے شہباز جامِ بیماری دانش کھنکاتے
 اد نکھتے اور ہوکتے رہے۔ سمندروں کی لہریں سراٹھھا اٹھا کر ہر محوِ خٹک سے سوال
 کرتی رہیں، ہم کس سے ٹکرائیں، ہمارا سینہ شگاف کون کرے گا۔ فضائیں تندی
 بادِ مخالف سے پوچھتی رہیں، کس کو اُدنچا اڑاؤ گی۔ سرچشموں نے دریا بہ دریا، ایم
 بہ ایم، جو بہ جو تلاش کر دائی۔ ماسوا شاہ مقیم کے حجرے پر عرض کرتی ہوئی ”جی“
 کے اور کوئی نہ ملا۔ کوئی، جو لباسِ حق و باطل میں تمیز کر داتا، ضیاعِ طبعِ موزوں کی
 نشان دہی کرتا ”جاہِ الحق“ کی خبر دیتا۔ باطل کو ”ذھوقا“ ٹھہراتا اور صیقلِ صوار
 ہوتا۔ بے حق شیدا ایمان تو حید نے بہ اندازِ لعب ہی سہی، لغزہ حق لگایا کہ اللہ
 کے سوا الہ کوئی نہ ہو۔ مگر مدعیانِ وحدتِ اختیار سے تائید نہ ہو سکی۔ لا الہ الا اللہ
 سوائے مغرب رہا، الا اللہ کا سوائے مشرق۔ تیخِ ایمان درمیان اور جسدِ ایقان مارے

خوف کے دوش تا کر زردہ احتیاط میں ڈوب رہا۔ دانش کارِ لاکھ حاصل کا حاصل ضرب
یہ رہا کہ جانوروں کے حلقوں کا توڑم اگر نہیں خراش زدہ کر دے تو ہار مونی کا تقاضا
یہی ہے کہ نغمے نابالغوں کے سپرد کر دیئے جائیں۔ کہ مائیں لوریاں دے کر بچوں کو سلا
سکتی ہیں تو بچے مادرِ خواہیدہ کے عالمِ خواب کو ترغیم آمیز کرنے کے لئے مضرب کیوں
نہیں اٹھا سکتے۔ طوطا اگر معترض نہیں ہوتا کہ مجھ سے توپ کیوں چلواتے ہو تو ہم تماش
بینوں کو کیا حق ہے کہ میاں مٹھو کے کاروبارِ دل آویز میں مٹھل ہوں۔ جو قوم جشنِ ارتعاش
زندگی نہیں مناسکتی، مرگِ مرتعش اُس کا ماتم ہی کرتی رہتی ہے۔ مگر وہ کبھی مر کر زندہ
نہیں ہوتی اور ”موتوا قبل انت موتوا“ کی معرفتوں سے آشنائی کر کے اغوا برائے ایجاب
و قبول ہو ہی جایا کرتی ہے۔ سہرے ڈولی سے خانہ آبادی اور اغوا کے ایجاب و قبول میں
بڑا فرق ہوتا ہے۔ گڈے گڑیا کی شادی تو رچائی جاسکتی ہے، گڑیا کی گود ہری ہوتی آج
تک کسی نے نہیں دیکھی۔ تمناؤں میں اُجھائے اور کھلونے دیکر بہلائے گئے مغویہ اور
اغوا کنندہ یا گڈے گڑیوں کے میکے و سسرال والے یومِ شادی و اغوا کو ہر سال جتنی
جی چاہیں خوبصورت گرہ دیں، تسبیح روز و شب بکھری ہی رہے گی۔ لاکھ کو سنجو گتا!
یہ ورطہ سنجوگ تھا۔ نہ جے پال کا سر اُٹھے گا، نہ پرتھوی راج کی نگاہ جھکے گی۔ لاکھ جوگ
اُدھارو، صاحبان کا دوپٹہ سر کا اور مرزا کی پگڑی لڑھکی ہی رہے گی۔ سیدا کھیڑا راجہ
عدلی کے حضور گڑ گڑانا رہے گا۔ اور رانجھے کی گود میں سجنے کی متمنی ہیر آغوشِ لمحہ میں
سمٹتی ہی رہے گی۔ میاں محمد کے انگوروں کی بیلین کیکروں کے سہارے لیتی رہیں
گی اور خوشے زخائے رہیں گے۔ رانجھے کی بانسری پر کید و رقص کرتے، بھینسین منڈلاتی،
کھیڑے بارائیں چڑھاتے اور ہیر لے چلے بابلا، بلبلائی رہے گی۔ ہر گھر کا مجازی نائب
خدا شجرِ ممنوعہ کے ذائقے بیان کرتا رہے گا۔ ہر گھر کی حوا اسی شجرِ ممنوعہ کے پتوں سے
آرائشِ حُسن کرتی اور اولادِ آدم و حوا دجنا ظلمنا انفسنا پکارتی، حسبِ

تقاضائے اہلیساں یہ کہہ کر جنت سے نکالی جاتی رہے گی کہ تمہاری آزادی کا تقاضا ہائی
 جیکروں نے کیا ہے۔ حلوے کے ڈھیر پر بیٹھے موعظاً ملاً انتظار حور میں اونگھتے رہیں گے
 اور حوریں کھجوروں کے خوشے سنبھالی ہوئی بندیوں سے ان پر گٹھلیاں پھینک کر ریشخندی
 کرتی رہیں گی۔ کہ اے میرے ریشائیل، حدود آرڈی ننس حفظ ہوا کہ نہیں۔ ما ادرک
 مالیلة القدر کی نوبت گونجتی رہے گی۔ اور ہر کوئی ادراک رضا و قضا
 مقدر کا حدی خواں بنا یہی سوچتا رہے گا کہ تقاضا ہائے نیم شبی کیا ہیں۔ شراب سیخ
 یہ ڈالوں یا شیشے میں۔ اوقاف حواس باختہ میں دار و مانگوں یا دُعا۔ گریڈ بڑھوانا
 ہو تو تسبیح ہمہ صفت کس وقت نکالنا مناسب ہوگا، قبل از ظہر یا بعد از عشاء۔
 قربت مستور کے لئے در قضا بخشش پر قیام نہاں موزوں رہے گا یا قیام لیل۔ شب وصل
 با وضو گزار سی جائے یا با تیمم۔ خواہشات نفس میں ڈوبے ہوئے غیر منزل، غیر مدثر،
 آقائے دو جہاں، بزبان الہی المنزل والمدثر ویلسن و طہ، کے یہ مالا تفعلون،
 خیالات و تصورات میں اندر سمجھا کی رنگ رلیاں سموئے ہوئے یہ معطر و مخمور
 دریودھن، اگر نیت خفی کا ادراک کر پائے۔ تو حسرت و یاس دلو و لعب بیک وقت
 یوں نمود و نما پا کر فکر و دانش کی جملہ راہوں کو مسدود نہ کر دیتے۔ کسی فرد یا قوم کا
 متضادم کیفیات میں محصور ہو جانا انہیں ہانک کرنے کے اعتقادوں کی طرف لے
 جایا کرتا ہے اور وہ اپنے حاکموں، اپنے راہ نماؤں کی طرف یوں دیکھتے رہ جاتے
 ہیں جیسے معصوم بچہ اپنے اُس سگے باپ کی طرف دیکھے جو بیک وقت اُسے
 جھڑک رہا اور اس کی سوتیلی ماں سے پیار کر رہا ہو۔ محبوب خاوند کی موت اور
 اکلوتے بیٹے کی پیدائش کے لمحات اگر مختلف نہ ہوں تو اس بیوہ ماں کی جو حالت
 ہوگی، وہی اس قوم کی ہوگی جو بیک وقت قنوطیت و شادمانی کو نبھا رہی ہو۔
 ہر ایسی کیفیت میں نئے اعتقاد در دِ رزہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ نئے اعتقاد ایمان

و اتفاقاً لیوا ہی نہیں ہوتے ، سماج ، تہذیب ، ثقافت - رسوم و رواج تک کو بھی
 کا عدم قرار دے دیا کرتے ہیں۔ لوگ جس کو خدا مان رہے ہوتے ہیں ، اس کے خلاف
 علمِ بغاوت بلند کر دیا کرتے ہیں۔ یہ اعتقاد کی تبدیلی ہی ہے جو بت پرستوں سے
 بت تڑوا دیتی ہے ، خدا پرستوں کو مُنکر خدا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اعتقاد تبدیل ہو
 جائیں تو انسان ، معاشرہ ، ریاست تحریباتِ نو سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ تبدیلی
 اعتقاد تبدیلی مذہب سے بھی بڑا سانحہ ہے۔ اعتقاد بدل جائے تو کوئی چیز کسی فرد
 کی بھی اپنی نہیں رہتی۔ اعتقاد اُس وقت تک نہیں بدلتے جب تک یاس و شادمانی
 متصادم نہ ہوں۔ منعموم عید اور شادمان فاتحہ خوانی کے بعد لاکھ ٹولیں ، سابقہ انسان
 کہیں نظر نہیں آیا کرتا۔ ریگن کی دلائی ہوئی امیدیں بھی ریگ صحرا کی طرح پھسلتی
 دکھائی دیتی ہیں اور ہر انسان کا اندرونی معاشرہ واپڑا ، واسا اور پاسکو کی زد میں
 یوں آجاتا ہے کہ چند ہی سانحاتی کرامتوں کے بعد روشن چراغوں میں بھی روشنی
 نظر نہیں آیا کرتی۔ جو یوم عید الاضحیٰ ابدیہ ہو کر بچھڑ جایا کرتے ہیں ، وہ کوفہ و کربلا ہی
 کے مسافر ہوتے ہیں۔ ان کے بعد معاشرتی و اخلاقی و عباداتی معیار و اعتقادات تو
 گجا ، آئینی اعتقاد بھی بدل جایا کرتے ہیں اور خیر "من الف شہروالی
 رات پھر کبھی نہیں آتی ، دن البتہ روزانہ غروب ہوتے رہتے ہیں۔ راتوں کو
 چراغ تو لج اللیل فی النهار کی تفسیر لکھنے کے لئے ضرور جلتے ہیں مگر
 مفسرین کو ڈوبتا ہوا دن اور طلوع ہوتی رات کبھی نظر نہیں آتی۔ حجاب اٹھیں بھی
 تو خطاب نہیں ہوتا۔ افلاک سے نالے اٹھتے ہیں ، زمین سے کوئی جواب نہیں ملتا۔
 ہر مفسر ہر فقیہ کی دانش ملت واحدہ کو ایک نیا فرقہ عطا کر دیتی ہے اور سچائی
 تاویلوں میں گم ہو جاتی ہے ، اصول جزئیات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ علم کے سیاہ بادل
 سیلاب لانے کی حد تک بارش برساتے ہیں ، عشاق کے جھونپڑے ٹپکنے لگتے ہیں اور

عشق کی آگ گیلی راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ رسم اذان رہ جاتی ہے روحِ بلا لی پُراز
 کر جاتی ہے۔ فلسفہ رہ جاتا ہے، تلقینِ غزالی مفقود ہو جاتی ہے۔ لوگ تیغِ جانستاں
 نزدیکِ رگِ جان رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ تڑپنے پھر کٹنے کی توفیق چھن جاتی ہے۔ نہ
 سوزِ صدیق میسر آتا ہے نہ دلِ مرتضیٰ۔ میخانے سنان ہو جاتے ہیں۔ میکدے ویران
 ہو جاتے ہیں اور صرف ایسے ساقی باقی رہ جاتے ہیں جن کے بڑھے ہوئے ناخنوں
 میں لقمہ ہائے غیر کے اٹکے بلکہ پھنسے ہوئے ریزے بوڑھے اٹھے ہوں اور وہ آبدست
 لئے ملتجی ہوں کہ روزہ سے ہوں، حضور اگر تیمم پر ہی اکتفا فرما سکیں تو چار گھونٹ
 افطاری کے لئے بچا سکوں گا۔ یہی وہ عالم ہوتا ہے جب علماء اور اولیاء میں ٹھن
 جاتی ہے اور حاکمانِ وقت بکارِ خاص فقیہانِ وقت کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔
 بالآخر قاضی و کلا کے دلائل کی اعانت کے محتاج ہو جاتے ہیں اور قانون کی بجائے
 شرحِ قانون نافذ ہو جاتی ہے۔ دانشِ قانون سازی ریاکاریِ شارح سے جان بچاتی
 پھرتی ہے۔ اور شرع اور شرح میں تمیز مفقود ہو جاتی ہے۔ یوں آہستہ آہستہ
 نئے عقائد جنم لے لیتے ہیں۔ جو ان حالات میں اپنے اعتقادی شعور کو زندہ رکھے،
 اصولوں پر سودا بازی نہ کرے، الحاد کے سیلابِ نو کے سامنے بند باندھتی ہوئی چٹان
 بن جائے، وہی حسینؑ کا نام لیوا ہے، وہی یارِ غارِ ثور کا پیروکار ہے، وہی شبِ
 ہجرتِ پیغمبرؐ کے بستر میں سونے والے سے صحیح ارادت رکھتا ہے۔ باقی سب قاتلِ
 شیوہِ آذری اور ہلاکِ جادوئے سامری، قربتِ الہی اور شرکتِ دانشِ خداوندی
 کے ایسے دعویدار ہیں جیسے ذبحِ اسمعیلؑ کی عرض سے استعمال ہونے والی چھری بنانے
 والا لوہا یہ دعویٰ کر ڈالے کہ میں جانتا تھا اللہ تعالیٰ کو حضرت اسمعیلؑ کو ذبح کروانا
 مقصود نہیں۔ اس لئے ہی میں نے چھری کو کُندر کھا تھا۔ اور حسینؑ کی قاتلِ تلوار کا
 سانحِ دعویٰ کرے کہ میں اللہ کی رضا کا دانا تھا، اسی لئے تو میں نے تلوار ایسی

خوب خوب سان پر لگوائی کہ ایک ہی وار میں کاٹ مکمل کر گئی۔ چھری بنانے والا
 لوہا رتیخ ساز سے کئے تیری بنائی ہوئی تلوار سے حسینؑ کا کلا کٹا، تو مردود ہے۔ اور تیخ
 ساز جو اباً دلیل لائے، تو دروغ گو ہے، چھری اگر کند تھی تو دنبہ کیونکر ذبح ہو گیا،
 اُس کی شہ رگ پر اُون بھی تھی۔ یوں چھریوں اور تلواروں کے مکتبہ فکر بن جائیں۔ حضرت
 اسماعیلؑ کا ایثار اور امام حسینؑ کی قربانی فراموش کر دی جائے۔ بیرم خاں کو
 سفرِ حج کی رعایت بیسرا جائے۔ جو دھابائی حرم سرا کی بالانشین کھلوائے اور
 ابوالفضل و فیضی بہ فضل جل جلالہ و بہ فیض دانش غیر معتقد آئینِ اکبری تصنیف
 کرتے رہیں۔ پر جا بیداری کے دکھ جھیل کر سکھ کی نیند سوئے، بابر بہ عیش کوش
 رہے اور شیر شاہ تعاقب بہایوں کی سیکمیں بناتا رہے۔ اور ہر چھوٹا بڑا حاکم وقت
 یہ بھول جائے کہ جس کی نیند تک اُس کے اپنے بس میں نہیں، وہ شب و روز کی تقدیر
 پر کیونکر دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے مُنہ تک لے جائے جاتے ہوئے لقمے
 سے مکھی اپنا حصہ چھین کر لے جائے اور وہ اسے واپس حاصل نہ کر سکے، اس بے اختیار
 کو اپنے حُسنِ اختیار پر ناز کا کیا جواز حاصل ہے۔ جس کا اپنی ہی ہوا نہ سرکنے کی وجہ سے
 پیٹ پھول جاتا ہو کیا اس کے حکم میں بھی وجود حکم تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ جب سب
 انسان ہر صبح اپنی غلاظت اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہیں تو پھر ایک انسان کو
 دوسرے انسان پر بلا جواز بالادستی کیوں حاصل ہو اور جواز متعین کرنے کا حق کسی
 انسان کو کیوں دیا جائے۔ لو لعب میں غلطاں مایوس و قنوطی لوگ آگاہ ہوں کہ
 اللہ کے قوانین اللہ کے آئین کے پیشتر و نہیں ہیں۔ ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ
 نے آئینِ اسلام عطا نہیں کیا تھا، آئینِ اسلام نے اس معیار و مرتبہ کے انسان عنایت
 کئے تھے۔ اسلام کا آئین طرز حکومت و سیاست و قیادت و سیادت اگر نافذ نہ
 ہو تو ہر کوئی کارِ لا حاصل میں کھویا ہوا ہے۔ اللہ آئین ساز پہلے ہے اور قانون ساز

بعد میں۔ اس نے اصول پہلے قائم کئے، جزئیات بعد میں نافذ ہوئیں۔ جس قانون کے اپنے مکتبہ فکر کا آئین نافذ نہیں، وہ قانون محنت ہونے کے سوا اور کچھ بھی ثابت نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ آئین کو قانون پر بہ طور بالا دستی حاصل ہوتی ہے۔ بے آئین قانون فقط وہ معطل شدہ قانون گو ہوتا ہے جس کی جگہ عارضی طور پر پٹواری کام کر رہا ہو۔ صرف قوانین اسلام کے نفاذ سے اللہ کی حاکمیت تسلیم نہیں ہو جاتی، آئین اسلام ہی واحد ایسا آئین ہے کہ اللہ کی حاکمیت نافذ کرتا ہے۔ جب تک حاکم اللہ کے احکام کا پابند نہیں، کوئی مملکت، کوئی معاشرہ، کوئی ریاست، کوئی قانون، کوئی فرد، کوئی توضیح۔ کوئی توجیہ، کوئی شرح آزاد نہیں۔ بلکہ حاکم کی حیثیت بھی اس ممتحن کی سی ہے جس کے کمرہ امتحان میں تمام زیر امتحان افراد پستول نکالے بیٹھے ہوں اور وہ بے چارہ زیر خوف جان تختہ سیاہ پر سوالات کے جوابات لکھ رہا ہو۔ اور کارروائی ملک بھر کی سہولت کے لئے رنگین ٹیلی کاسٹ ہو رہی ہو۔ دنیا بھر کے لوگو! قبل اس کے کہ افواج الہی کو لعب منصفانہ کے لئے ٹیک اور حکم ہو، اپنے اپنے آئین میں یوں ترمیم کرو کہ اللہ کے سوا کوئی الہ، کوئی حاکم، کوئی قانون ساز نہ رہے۔ اور تازہ خدا ہائے اوطان جو مذاہب کے کفن پہنے مسند آرائیں، اگر اپنے وجود مصنوعی کو قائم بھی رکھیں تو بھی ہر دینی حاکم عبدیت الہی کا اتنا ہی پابند ہو جتنا کہ سورج، چاند، ستارے، زمین، سمندر، ہوائیں، فضا میں اور افلاک ہیں۔ کیا تمہارے یہ حاکم جن میں کسی کا بھی قدم تاج سات فٹ سے زیادہ نہیں، ان سے زیادہ قوی ہیں کہ نافرمان بنے بیٹھے ہیں۔ جب دنیا کا کوئی حاکم سورج، چاند ستاروں، سمندروں پہاڑوں بلکہ ذرہ کی قوت سے زیادہ قوت نہیں رکھتا تو پھر ان سے زیادہ تابع فرمان الہی کیوں نہیں۔ اگر ایک لمحہ سورج احکام الہی کا پابند نہ رہے تو یہ حاکم بمع رعایا کہاں جائیں گے۔ اللہ کو انسانوں سے کب تک فقط شکوہ ہی رہے گا

کہ تم سے تو پہاڑوں کے پتھر ہی اچھے ہیں جو آج تک نافرمان نہ ہوئے۔ خدا بنا دیئے
گئے، پھر بھی پتھر ہی رہے کبھی دعویٰ خدائی نہ کیا۔ جب بھی کہا، منہ کے بل گر کر بھولتے
احد ہی کہا۔ پتھر دل انسانو! قبل اس کے کہ تم پتھر بنا دیئے جاؤ اور کوہِ سلیمان تم پر
ٹوٹ پڑے، حاکمیتِ الہی قائم کرو کہ سرزمین و افراد آزادانہ سانس لے سکیں ورنہ
قبروں کے پھولوں سے زینتِ شب وصل حاصل کرنے کی عادت تمام پرانے رشتے
یوں توڑ دے گی جیسے سسرال میں شبِ عروس کے سچے ہوئے گھر کے دروازے
پر میکے میں بھونچال آجانے کی خبر لئے خبرگیر دو ہتھریں مار مار کر کہہ رہا ہو، کوئی بھی
تو نہیں بچا۔



ایک نغمہ

قید حیات و بندِ غم و غالبِ خستہ، واردات و ایجاداتِ زمانہ ہوں تو انسان
 لاکھ مصاحبی شاہ پر اترائے، ارتکابِ جرمِ قمار بازی جسم و جان کا یہ سزا یافتہ زیرِ
 حراست ہی رہتا ہے۔ عالم خود فریب میں عمر بھر نظرِ زوجہ کی نذر رہنے والے اگر
 کوچہ رقیب میں مونچھوں کو بل داتاؤ دے کر اعلانِ آزاد منشی فرمادیں تو کان
 پر قلم رکھنے والے منشی جی باوجود تمام تر جراتِ تردید مجتمع کر لینے کے وہ قلم کہاں
 سے ڈھونڈیں جو شلوار میں ازار بند ڈالنے کے لئے استعمال ہوتی ہوئی نیفہ
 میں اٹک گئی۔ بالخصوص جب دستورِ زمانہ یہ ٹھہرا کہ اسے نکالا ہرگز نہ جائے اور
 بے شلوار بے ازار گزارا پر ہی اکتفا کر لیا جائے۔۔۔۔۔۔ بزعم خود انسان اول
 آخر، سرتاپا، پابہ پا آزاد رہا ہے مگر حقیقتاً یہ اتنا ہی آزاد ہے کہ سردیوں
 میں آزادانہ ٹھہڑ سکتا ہے، گرمیوں میں حسبِ خواہش جھلس سکتا ہے۔ تارے
 شمار کرنے پر روزانہ سے وسط اگست ۱۹۸۱ء تک کسی پابندی کی افواہ تک
 بھی نہیں سُنی گئی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سُننے اور برداشت کرنے پر
 کوئی پابندی نہیں۔ زمین سے آسمان تک دیکھتے رہیے، اقوام متحدہ تک نہیں
 روکے گی، اور راستے میں کوئی علم کوئی ترانہ نہیں۔ دل سے نکلتی ہوئی کسی

اہ کے پر نہ بھی ہوں تو بھی طاقت پر داز پر کوئی قدغن نہیں۔ روز و شب آپس
 بھریں، کسی قانون کی نیوری پر بل نہیں آئے گا۔ ہر ظفر علی خاں لاکھ پابند سلاسل
 ہو۔ آپس فلک پر رنگ لانے کے لئے ہمیشہ آزاد رہی ہیں اور انشاء اللہ
 آزاد رہیں گی۔ آمین، تم آمین۔ ہر انسان کو آزادی ہے کہ وہ جب چاہے اپنے
 آپ کو کوس لے، گالی بھی دے لے تو کسی قانون کا کام و دہن بد مزہ ہو کر نہیں
 چنگھاڑے گا کہ خود کو گالی دینے والے کے لب اتنے شیریں ہوتے ہیں کہ کوئی
 رقیب بے مزہ نہیں ہوتا اور ہر رفیق مزہ لیتا ہے۔۔۔۔۔ کوئی دریچہ، کوئی دروازہ
 نہ ہو پھر بھی عالم تصور میں باہر جھانک سکتے تو کجا، پھلانگ تک لگا دینے کے لئے
 ہر فرد آزاد ہے، مختار کل ہے۔ آپ اپنا خدا ہے۔۔۔۔۔ ہر انسان خاموش رہنے
 کے لئے آزاد ہے۔ اس موضوع پر تو چھو وید بھی تحریر کر دیئے جائیں تو کوئی معترض
 نہیں ہوگا۔ بلکہ احتمال ہے کہ چانکیہ ایوارڈ عطا ہو جائے۔۔۔۔۔ ہر انسان دوسرے
 انسان کا اطاعت گزار ہو جانے کے لئے ہمیشہ سے آزاد رہا ہے۔ سیاسی ایجاب و
 قبول تاریخ کے کسی بھی دور میں ممنوع نہیں رہا۔ جس کی جی چاہے خوشامد کیجئے،
 قصیدہ گوئی کو عادتِ ثانیہ بنا لیجئے۔ قانون کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیئے، اس
 کی تھالی کے بینگن بنے رہیئے، آپ آزاد ہیں اور آپ کی اس آزادی پر کسی
 مملکت کا کوئی قانون چسپ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ جاگتے ہیں لوگ غلطی بھی
 کرتے ہیں اور شرارت بھی۔ اس لئے کسی انسان کی بیداری مکمل آزاد نہیں، عالم
 خواب ہر کسی کا آزاد ہے۔ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ نہ پرسش، نہ
 سزا، نہ کرایہ، نہ ٹیکس، نہ پاسپورٹ، نہ ویزا، نہ کوئی ریکورڈنگ ایجنسی، نہ
 سفارت خانہ۔ وقت اور فاصلے آپ کے مستحضر، جی چاہے بادشاہ بن جائیئے،
 من بھائے تو گداگر۔ شرط ہے کہ سوتے رہیئے، بیدار ہوئے تو کچھ بھی نہیں رہے گا۔

آنکھ نہیں کھلنی چاہیئے۔ پوری دنیا اور اس کی کیفیات آپ کی قلمرو میں رہیں گی۔
 آنکھ کھل بھی جائے تو جاگتے میں خواب دیکھنے کی علت استوار کیجئے۔۔۔۔۔ نہ معلوم
 دانش و سیاست انسان یہ کیوں نہیں جان پائی کہ عالم خواب ہی ضامن آزادی
 انسان ہے۔ اس کی آنکھ کھل جائے تو پابند و گرفتار و رعیت و غلام بن جاتا ہے۔
 یوم بیدار سے شب خواب منانا زیادہ حقیقت پسندی ہے۔ جو لوگ شبِ عروس
 مناتے ہیں وہ راتوں کی نیند ہی نہیں گنواتے، کپڑے بھی اُتروا بیٹھتے ہیں اور
 صبح دم خانہ غسل میں گنگناتے پھرتے ہیں کہ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں
 نکلا۔ کیا نالہ دل، کیا بوئے گل اور کیا دودِ چراغ۔ اتنی بھی عقل نہیں کہ ان حالات
 میں دروازے بند کر لینا، چٹھنی چڑھا لینا، چراغ بجھا دینا اور بہر و پیر کا عدم بھر
 لینا ہی دور اندیشی اور ضمانتِ تعیش ہے۔ ورنہ بتِ نازک بدن کے پاؤں کا دکھنے
 لگنا، کوؤں کا مور کی چال چلنا لازم ہو جائے گا اور علتوں کے مداوا کے لئے ہر
 گھر کے لئے خارجہ پالیسی وضع کرنا از بس ضروری ہو جائے گا کہ کھلے دروازے
 تو سفرِ کوچہ رقیب کی دعوتِ نمایاں ہوتے ہیں۔ ہر داخلہ پالیسی باز کے لئے
 یہ ضروری ہے کہ ہر اہل خانہ کو مستی گیت کے اندر ہی رکھے۔ محصور خواہشات و
 جذبات و بابِ گفتار و عمل کے قلعہ کے دامن میں حنوری باغ کی نشوونما کرے
 اور اس میں اپنے ہر اقبالِ فکر اور سکندرِ بخت کو دفن رکھے۔ آخر الذکر سے منہ
 موڑتا اور اول الذکر پر فاتحہ پڑھتا رہے۔ لوگو! آزادی ملک اور آزادی افراد
 میں امتیاز کسی دستورِ سیاست نے آج تک قائم نہیں کیا۔ آریہ پدھاریں یا
 غوری و غزنوی تشریف لائیں، تغلق و لودھی کی سواری آئے، مغلوں کا جاہ و
 جلال فیل سوار ہو یا کلائیو کا جہاز ساحل برصغیر کو چھوئے، بے چارے عوام
 دراوڑے ”ہمیشہ امی شاہی سواریاں دے پوش پوش کر دے آگے آگے“

ای رہے، انسانی حاکمیتیں اور بادشاہتیں بدلتی رہتی ہیں۔ آزاد مملکتیں اور غلام افراد بہر حال وجود میں آتے ہیں۔ عوام پر عوام کی حکومت ہو یا جلال پادشاہی ہو، جب تک حاکم آزاد رہے گا، محکوم کم و بیش غلام ہی نظر آئے گا۔ جب تک راعی کسی کا محکوم نہ ہو، رعیت کبھی آزاد نہیں رہ سکتی۔ رعیت کی آزادی کے لئے راعی کا غیر آزاد ہونا از بس ضروری ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ لوگو! حاکم تو کیا پیغمبرؐ بھی اگر عبیدہؓ نہ ہو تو انسانوں میں مساوات و اخوت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی حکم رہے گا کہ مشرق سے نکلنے ہوئے سورج کو دیکھتے رہیے ما ڈوبتے ہوئے تاروں کا ماتم ہرگز نہ کیجئے۔ ساون آئے تو اپنے حالات کے مطابق کوئل کی کوک سینے یا فرقت یار میں غزل خواں رہیے۔ کوئل کے دکھ کو ہرگز نہ جانیے نہ اس کی پروا کیجئے کہ بھنورا کون کون سا رس چوس گیا۔ ورنہ آزادی سلب و سلب کروا بیٹھئے گا۔ آپ کا اپنا گھر ہے، یہاں صرف استراحت آپ کا حق ہے، فرش پر فریٹے یا قوم پر۔۔۔۔۔ جب بھی کھائیے قیلوہ ضرور فرمائیے، اس کے لئے ”دوپہر“ کوئی شرط نہیں۔ ایسا نہیں کیجئے گا تو بھوک مر جائے گی۔ بھوک کا مرجانا ہی انسان کے مرجانے کی علامت ہے جو انسان اپنی بھوک سے آزاد نہیں، اسے پیٹ بھر کھانے کی اجازت دینا، دنیا کے طلب کے خلاف دستوری سازش ہے کہ کائنات کے نظام مطلق کو صرف طالب و مطلوب کے تقاضے ہی منسلک رکھے ہوئے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز دوسری چیز سے کچھ مانگ رہی ہے۔ کوئی انسان کوئی قوم مانگ سے آزاد نہیں۔ لہذا مانگ کو نہ صرف قائم رکھئے بلکہ سیندور بھرا رکھئے کہ جس کی مانگ بگڑ جائے، وہ اگر بیوہ نہ بھی کہلوائے تو بھی پیا پر دیس ضرور گئے ہوتے ہیں۔ جو اس نکتہ سے بہرہ ور نہ ہوا، وہ فلسفہ سیاسی غیر جانبداری سے غیر آگاہ رہا۔ لوگو! رعایا کے لئے صاحب تاج اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ عورت کے لئے سرتاج۔

ورنہ رعایا یتیم کہلوائے گی اور مملکت یتیم خانہ۔ دانشورو! جسے مملکت کہتے ہیں، اس کا حاکم آزاد ہوتا ہے۔ مملکت خود آزاد ہوتی تو مملکت نہ ہوتی۔ مملکت کی آزادی کے لئے حکم کا محکوم ہونا اور تقسیم ارض کا نہ ہونا از بس ضروری ہے۔ دنیا میں ارض تو کجا ارضی بھی تقسیم ہوتی ہو اسے آزاد قرار دینا خود فریبی نہ بھی ہو تو خلق فریب کے لئے فریب خلق ضرور ہے۔۔۔ ہر مچھ میں مگر مچھ اور ہر جنگل میں شیر کی حکومت اس لئے قائم نہیں ہوتی کہ مورخوں بصورت ناچتا ہے۔ لوگو! تم غور کیوں نہیں کرتے، کیا تمہارے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ آخر انسان ازل سے ہی نا آشنائے رموز تاریخ کیوں ہے۔ آزاد دنیا اور بندگان آزاد کی دنیا میں امتیاز جاننے کے لئے رمزِ خفی سے آشنائی ضروری ہے کہ جو آزاد ہوتا ہے، وہ بندہ نہیں ہوتا اور جسے بندہ کہتے ہیں، وہ کبھی آزاد نہیں رہا۔ آزاد ہوتا تو بندہ نہ کہلواتا۔ انسان نادان ہر گرفت سے آزاد ہو تو بھی گرفتہ ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں عام انسانوں کے لئے سیاسی آزادیوں کے قوانین میں سیاسی پابندیاں پنہاں ہیں۔ جیسے قانونِ حفظِ حقوقِ مزارعاں کے تحت ہمیشہ مزارعاں ہی بے دخل ہوتے ہیں اور قدغنِ کرایہ ایکٹ ایزادی کرایہ و بے دخلی کرایہ داران کا جواز مہیا کرتا ہے۔ انسان بڑا خود فریب ہے۔ آزاد گھومنے پھرنے کا خواہاں و مقدر اپنے لئے خود ایک عمارت تعمیر کر لیتا ہے۔ اور سرِ شام بہ رضا و رغبت اس میں داخل ہو کر دروازے اندر سے مقفل کر کے خود کو مقید کر لیتا ہے۔ اہل خانہ میں کوئی بروقت مقید نہ ہو تو اسے بد چلن، آوارہ، اوباش گردانتا ہے۔ فطری طور پر از خود مقید ہو جانے والے اس حیوانِ ناطق کے لئے اسی قدر آزادی کافی ہے کہ دروازہ باہر سے مقفل نہ کیا جائے، کوئی داخل نہ ہو سکے۔ اور یہ جب چاہے ایسی گلیوں اور بازاروں میں نکل سکے جہاں اسے یہ کہہ کر روکا جاسکے کہ اب تم سرکاری گھر جاؤ گے۔ انسان رسوم و رواج سے آزاد

نہیں، قانون سے آزاد کیوں کر ہوگا۔ اگر پابندی مقصود نہ ہو تو قانون کا جواز کیا باقی رہ جاتا ہے۔ جس مملکت میں حاکمین و عمال پابند نہ ہوں وہ فلاحی مملکت نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے دانشِ مستور یہ جواب لائے کہ حاکم بھی پابند ہو تو پھر آزاد کون رہے گا اور صرف آزادی کیا ہوگا۔ میرے پاس اس کا جواب ہے بھی تو جواز نہیں کہ میں مادر پدر آزاد نہیں اور یہ مادر پدر آزادی ہی ہے جو اس طرح سقوطِ مشرقی پاکستان کا باعث بنی کہ آج نرانہ سنتے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے ہر انسان کی نرم و گرم اُون پر بچوں نے مہندی سے عید مبارک لکھ دیا ہو اور اس کی گردن میں پٹکا ڈالے بغرض حج اکبر اُسے دانا دربار لئے جا رہے ہوں اور وہ چلا رہا ہو کہ میں تو مینارِ پاکستان جاؤں گا۔ مینارِ پاکستان جس کی بلندیاں ہمہ وقت سیاست دانوں سے سوال کرتی ہیں کہ اے سابقہ اہلیانِ اقتدار! حالیہ طلبگارانِ اقتدار، پاکستان کا مطلب اگر لا الہ الا اللہ ہے تو کوئی بھی غیر اللہ الہ کیوں ہے۔ آؤ پکاریں "ایک لعبد" کہ اسی میں نظریہ پاکستان کی بقا ہے۔



اولین آئینی تقاضا کیا ہو

دوستو! قبل اس کے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ کی ہر واسکٹ شور مچا دے کہ خلقِ خدا ہزار جنبد، ڈھانچہ نہ جنبد، تمکینِ فکر سنبھالو اور اللہ کی حاکمیت کا مطلب واضح کرو۔ ورنہ جاپان سے روٹ وزیر و مشیر و الٰہین شوریٰ و مہران مشاورتی کونسل بھی منگوائے جاسکتے ہیں۔ کہ جاپانیوں سے بھی زیادہ جاپانی روٹ اتحاد و ایمان و تنظیم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جسے دیکھ کر ہر محبِ وطن کو یہ افسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم اتنے سال جاپان کیوں نہ گئے۔ آج جب کہ اقبالؒ کے ایک مصرع کے مصداق غسالِ کابل سے آچکے، ٹوکفن جاپان سے، والے حصے سے بھی قطع نظر شاید ممکن نہ رہے۔ اگر پاکستانی اتحاد و تنظیم و ایمان جاپان نہ جالیسے ہوتے تو شاید زمانہ ”ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا“ کو اپنی مرضی کے معنی پہنانا نظر آتا۔ اور یہ تنفیج نہ نکالی جاتی کہ دین، آئین و دستور و عقیدہ ہی کو کہتے ہیں اور بقول علامہ اقبالؒ ”لا دینیت کنیزا ہرمن، دوں نہاد“ مردہ ضمیر اور دیوبے زنجیر ہوتی ہے۔ اس لئے ”لا اللہ کہہ کر کوئی آئین میں اپنا کردار متعین کروالے تو نہ کسی باسی ”گرٹھی“ میں ابال آنا چاہیے اور نہ کسی خالی ہنڈیا کے کنارے جل اٹھنے چاہئیں۔ یہ جو سیاسی لاجول پڑھ رہے ہیں، جان رکھیں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ

اندر سے ڈر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آنکھ سے صرف بند ہونے، کان سے صرف پکڑے جانے اور زبان سے صرف چکھنے کا کام لے رہے ہیں۔ یہ لاکھ طالبانِ اقتدار ہوں، ایسوں کو کون اقتدار میں لانا ہے۔ ایسے اقتدار پسندوں کو تو فضا میں جانوروں تک کو دکھا دکھا کر ”فہم لایرجعون“ کا راگ الاپا کرتی ہیں۔

دوستو! یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہم ”راجوں“ ہونے کا عملی مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان تضادات کو ختم نہیں کرتے جن کا زمانے نے ہمیں مردہ شکار بنا دیا ہے۔ اشخاص کی مخالفت، کینہ پروری یا شخصیتوں کی محض حمایت سے کام نہیں چلے گا۔ الزام و بہتان تراشی یا اقتداری رقابت اُن مسائل کا حل نہ دے سکے گی جن سے ہم دوچار کر دیئے گئے ہیں۔ قلب و ذہن کے جس فکری تضاد میں ہم گرفتار ہیں، وہی ہمارے آلام و مصائب کی اصل وجہ ہے۔ اخباری بیانات کی جزوقتی سرخیاں اطلاعات ضرور بہم پہنچاتی ہیں، نہ حقائق آشنا کرتی ہیں نہ راہ نمائی کرتی ہیں۔ ہم آئینی بحران سے گزر رہے ہیں۔ اور اس امر سے قطع نظر ثبوت دانش نہ ہو گا کہ نظمِ آئین و قوانین و ضابطہ حیات قائم کرتے وقت عقائد کو بالائے طاق رکھ دینا اپنی دنیا کو اپنے عقیدہ پر ترجیح دینا ہی نہیں، اسے یہ اجازت دینا بھی ہے کہ اپنی تیغِ جانستار کو دین کی رگِ جاں پر جمائے رکھو اور اعلان کرتی رہو کہ خدا کو اب زمین پر کوئی حق و اختیار نہیں رہا کہ یہاں اس کے اشرف المخلوقات خلیفہ نے اپنی سلطنت قائم کر لی ہے۔ ہمارا اس سے واسطہ یا تو قبل از پیدائش ہو گا یا ہو سکتا ہے بعد از موت ہو اور کیا خبر، ہو بھی کہ نہ ہی ہو۔ ہم تو جا پانی رو بٹ ہیں، پرزے گھس جائیں گے تو ڈسپوز کر دیئے جائیں گے۔ انسانی اذہان و قلوب میں جب

ہو س اقتدار اور تجوریوں گھس جاتی ہیں تو انسان شعور کی چابیاں گم کر بیٹھتا ہے۔ فکر بے حواس اس کا سرمایہ حیات قرار پاتی ہے اور وہ انتہائی غیر مطمئن انسانیت کا چوکھٹا اٹھائے ہانکیں لگاتا پھرتا ہے کہ ترقی پسند دستور ترمیم کروالو! ٹوٹے پھوٹے آئین ٹھیک کروالو! اپنے چوکھٹوں کے ”چب“ نکلوالو! لیکن بغیر دین کے اصولوں کا ادراک حاصل کئے اپنے ذاتی مقاصد کے لئے دین کی جھولی میں دنیا کی تمام مکروہات ڈال کر دینداری کا ہر وہ پ دھارنا ایسا قبیح عمل ہے جیسے کوئی حضرت عیسیٰ کے لئے کنواری دو لہنیں جمع کر رہا ہو۔ یوں ہو گا تو لوگ پیچھا چھڑوانے کے لئے سرگرم ہو جائیں گے اور پیران کلیسا کی پیری ناکام ہو کر منہ دیکھتی رہ جائے گی۔ پاکستان میں آئینی طور پر اسلام ریاست کا دین ہے۔ اس دین کا بنیادی اصول صرف یہ نہیں کہ کائنات پر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے بلکہ یہ ہے کہ کائنات پر صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے، باقی فقط عبدیت ہے۔ اشرف و محبوب و مکمل ترین انسان بھی ”عبدہ“ ہے۔ عبدیت طلب استعانت و صراط مستقیم کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اور یہ دین ہی ایک ایسا آئین، دستور اور ضابطہ حیات واضح کرتا ہے جو اس حاکمیت اور عبدیت کے مابین فاصلوں کو کم کرتا اور وقت کو شکست آشنا کرتا ہے۔ لمحات کی شکست و تسخیر ہی ارتقائے علم انسان کی انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے آئینی اصولوں کو عرصوں میں محدود اور فاصلوں میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اس صیرفی، کائنات کے پر فوج کر اپنے جسم پر سجالینا اور حاکم وقت ہونے کا دعویٰ کر ڈالنا کائنات پر اللہ کی حاکمیت سے ٹکرا نا ہے۔ جس عمل میں آج کی تمام دنیا الجھی ہوئی ہے۔ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کا یہ انداز بڑا پرکار ہے کہ کائنات پر تو اس کی

حاکمیت کا زبانی اقرار کر لیا جائے اور در پردہ اپنی قلمرو میں اپنی حاکمیت
 کا اعلان کر کے اس حاکمیت کے لئے سرچشمہ عوام کو قرار دیا جائے۔ عوام
 جو بے چارے انتخاب سے آئندہ روز ہی اس سرچشمہ کے ہر سوتے کو الٹا
 بہتے ہوئے پائیں۔۔۔ آئین و دستور کی زبان میں اللہ کی حاکمیت سے بندوں
 کو حق حکومت حاصل نہیں ہو جاتا۔ ان کے کندھوں پر اللہ کی حکومت قائم
 کرنے کا بوجھ دیا جاتا ہے، اسی لئے اس انتظامی سربراہ کو خلیفہ کہتے ہیں
 جس کے ذمہ اطاعت الہی اور اس کا نفاذ ہوتا ہے۔ خلیفہ ہونے سے یہ مراد
 نہیں کہ خدا نے اپنے اختیارات تفویض کر دیئے ہیں۔ قانونی زبان میں وہ
 اپنے پرنسپل کا ایجنٹ نہیں ہوتا، نہ اُسے مختار نامہ عام کی سی دستاویز حاصل
 ہوتی ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ کا کارندہ ہو۔ معذرت
 کے ساتھ، نائب ہونے کی اصطلاح غالباً ملوکیت کے زمانہ کی ایجاد ہے۔
 جس نے بات بالآخر ظل اللہ اور ظل الہی تک پہنچا دی اور حاکمان وقت
 سایہ خدائے ذوالجلال بن بیٹھے، جو ضالین ہونے کی واضح مثال ہے۔۔۔
 لفظ قانون کو لاکھ حسین لبادے پہناؤ، پھولوں سے سجاؤ یا اطلس و کجواب
 کی قباؤں اور خلعتوں میں چھپاؤ یا اسے صرف بااعتماد اہل کار کی واسکٹ
 کی جیب میں رکھو، اس سے مراد حاکم کی مرضی ہی رہتی ہے۔ قانون کی
 بالادستی و حکمرانی حاکم کی مرضی کی حکمرانی و بالادستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جب
 تک بندوں پر بندے یا بندوں کے کسی گروہ کی مرضی کا تسلط رہے گا، اللہ کی
 حاکمیت کی نفی ہوتی رہے گی۔ اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کئے بغیر رضی اللہ تعالیٰ
 عنہ، کا لقب پانا ممکن نہیں۔ خلفائے راشدین کا یہ آئینی منصب تھا۔
 رضی عنہ، ہو گے تو وہ راہنی ہو گا۔ "اللہ ملک السموات والارض وما بینھن

وهو على كل شيء قدير، نیز ” وشا ورهم فی الامر اور ” امرهم شورىٰ بینهم ” سے
 ہرگز یہ مراد نہیں لی جاسکتی کہ باہمی مشورہ سے اللہ تعالیٰ کے آئین و قوانین
 و اصول ہائے ضابطہ حیات کو بھی بدلا جاسکتا ہے یا ان سے روگردانی
 کی جاسکتی ہے اور پھر وشا ورهم یا شورىٰ بینهم کے ساتھ ” والذین استجابوا
 برہم و اقاموا الصلوٰۃ اور مما رزقنہم ینفقون ” کی شرط بھی لازم ہے چنانچہ
 جو لوگ اپنے پروردگار کا فرمان قبول نہیں کرتے، اقامت صلوٰۃ نہیں کرتے،
 اور جو کچھ انہیں رزق کیا گیا ہے اس میں سے خرچ نہیں کرتے یعنی اصول
 ” قل العفو ” کی پابندی نہیں کرتے اور وہ لوگ جو ان ہی اصولوں سے
 متعلقہ آیات کے مطابق نرم خو نہیں ہوتے، مبدخو اور سخت دل رہتے
 ہیں، معاف نہیں کرتے اور مصمم ارادہ کے حامل نہیں ہوتے، بڑے
 بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز نہیں کرتے، غصہ آئے
 تو معاف نہیں کرتے، ان کا باہم مشورہ کر لینا سود مند ہونے کی ضمانت
 نہیں ہو سکتا۔ ورنہ سورۃ الشوریٰ میں یوں ارشاد نہ ہوتا ” فمما رزقنا من اللہ
 لنت لہم۔ و لو کنت ظالماً علیٰ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنہم و
 استغفر لہم و شا ورہم فی الامر، فاذا مزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب
 المنزلیں ” یہ حکم نہ دیا جاتا ” فما اوتیتم من شیء فمما رزقنا من اللہ
 وما عند اللہ خیر و البقی للذین امنوا و علی رہم یتوکلون۔ والذین یجتنبون
 کثیر الاثم و الفواحش و اذا ما غضبوا ہم یغفرون۔ والذین استجابوا لربہم
 و اقاموا الصلوٰۃ و امرہم شورىٰ بینہم و مما رزقنہم ینفقون ” یہ امر بھی غور
 طلب ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی قطع اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی
 اطاعت کا ذکر ہوا تو فرمایا ” یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و

اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوا الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون
باللہ والیوم الآخر، ذلک خیر و احسن تاویلاً، اول تو اولی الامر کے الفاظ
استعمال کرنے میں عظیم دانشمندی پنہاں ہے۔ ورنہ حاکم اور خلیفہ بھی عربی
ہی کے الفاظ ہیں۔ دوم تنازعہ یا اختلاف رائے طے کرنے کا طریقہ بتا کر یعنی
یہ حکم دے کر کہ اختلافات کو اللہ اور رسول کے متعین کردہ اصولوں کی
راہ نمائی میں طے کرو، یعنی یہ نہ دیکھو کہ مصلحت وقت کیا ہے، یہ معلوم کرو
کہ اللہ و رسول کے احکامات کیا ہیں، اختلافات کو قائم رکھنے اور فکری
گروہوں کے قیام کی نفی کر دی گئی۔ یہ اصول اپنی نوعیت میں آئینی اور دستوری
ہے اور اللہ کی حاکمیت قائم رکھنے کا بنیادی ستون ہے۔ انسانی اذہان کا،
دانشوروں کا، مفکرین کا، جیورسٹ کا، فقہا کا آپس میں اختلاف رائے ہو
جانا امکانی امر ہے۔ ہم نے اتنی بڑی دانش کے حامل سنہری اصول کو فراموش
کر کے اولی الامر کی اطاعت کو ہر حکمران وقت کی اطاعت سے منسوب کر لیا
اور انگریز حاکموں تک کی اطاعت کو لازم قرار دے دیا۔ اور ”ماکان لمومن
لامؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امران یكون لھم الخیرۃ من امرھم ومن
یعص اللہ ورسولہ فقد ضلّ ضلاً مبیناً“ کے واضح حکم کو فراموش کر دیا۔ یعنی
کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا
رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو
کوئی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ صریحاً گمراہ ہو گیا۔ یہ حکم
آئینی و دستوری طور پر ہمارے پیش نظر نہ رہا حالانکہ ہمارے آئینی اداروں
کے لئے اس کی حیثیت مشعل راہ کی تھی۔ اور اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کے
لئے اس کی پابندی از بس لازم تھی۔ اس تنبیہ سے بھی ہم نے آنکھیں بند

کر لیں کہ ”ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ریجکم“ یعنی آپس میں تنازعہ نہ کرنا،
ایسا کرو گے تو تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا، تمہاری ہوا
بگڑ جائے گی۔ ان آئینی و دستوری لائحہ عمل مقرر کرتے ہوئے اصولوں سے
یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ کی حاکمیت سے مراد افراد کا ہی نہیں ریاست و
حکومت کا بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات اور قائم کردہ اصولوں کا فرمانبردار
ہو جانا ہے۔ یہ زمین صرف اللہ ہی کی ہے، حکم صرف اللہ ہی کا نافذ ہو گا، آئین
اسلام کے وہ نادر ضمن ہیں جن کی تمثیل عقل انسانی آج تک پیش نہیں کر
سکی۔ یوں اللہ ہی کی حاکمیت قائم ہو کر اسلامی ریاست صرف ریاست
عدل و احسان ہی رہ جاتی ہے۔ انسانوں کی حاکمیت قطعی ختم ہو جاتی اور مساوات
قائم ہو جاتی ہے۔ دین کو لفظ مذہب کے محدود معانی میں نہیں سمویا جاسکتا۔
اس سے مراد آئین و دستور و ضابطہ حیات و اصول و عقائد ہیں۔ عقیدہ
کے احاطہ میں تسلیم کے لئے نزدیک دلیل مانگا کرتے ہیں، نہ اسے پرکھنے کے لئے اپنی
فانی عقل سے دلیل لایا کرتے ہیں۔ من و عن اسے مکمل و صحیح تسلیم کر لینا ہی
اس کا بنیادی تقاضا ہے۔ اسلام ہمارا دین ہے، ماسوشلزم ہماری معیشت
ہے اور مغربی جمہوریت ہماری سیاست کے اصولوں کو بیک وقت نافذ کر
کے ہم نے تصادم کی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک اسی تصادم کا
نتیجہ تھی۔ عوام نہیں، آئین کے ضمانت آپس میں ٹکرا گئے تھے۔ ایک طرف
اسلام ہمارا دین ہے اور دوسری طرف سوشلزم ہماری معیشت اور مغربی
جمہوریت ہماری سیاست تھی۔ ایک طرف طاقت کا سرچشمہ عوام اور دوسری
طرف طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کے مکاتب فکر کا فرنا تھے۔
ایک کو پیپلز پارٹی کہتے تھے اور دوسری نے پی این اے نام پایا۔ فکری طور پر

لڑائی دستوری ضمانت کی تھی۔ جس نے بالآخر ایک طرف اپنے مصنف کا گلا دبوچ لیا اور دوسری طرف پابندیوں کی پابند ہو گئی۔ کسی شخص یا اشخاص پر الزام عائد کرنے سے پہلے ہمیں اپنی اس فکر کو پرکھنا چاہیے جسے ہم متفقہ کہتے ہیں، ورنہ تضادات پر اتفاق کی راہ میں کئی اور مشکل مقام آنے والے ہیں۔۔۔۔۔ اللہ ہی کی حاکمیت قائم ہونے سے حکومت و حاکم اللہ تعالیٰ اور عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں اور یہ زبیریں اصول قائم ہوتا ہے کہ کارندہ خدا اگر خدا کے احکامات کے خلاف کوئی حکم دے تو اطاعت اللہ کے بندوں پر فرض نہیں۔ اس دستوری ضمن کی تشریح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ کی اور غور سے دیکھیں تو واقعہ کربلا اسلام کے آئین کے اس ضمن کی خلاف ورزی کے خلاف ایک مصمم احتجاج تھا۔ تقاضا حصول اقتدار و مرتبت و عہدہ کا نہ تھا، یہ تھا کہ اللہ کے بندوں پر زبیر کی نہیں، صرف اللہ کی مرضی کا تسلط رہنا چاہیے۔ یہ نہیں کہا جا رہا تھا کہ میں خلیفہ بنا چاہتا ہوں، یہ کہا جا رہا تھا کہ تمہارا اس طرح خلاف آئین اسلام خلیفہ بن جانا ہمیں منظور نہیں۔ ایک بدو نے چادر کے واسطے سے ایک اہم آئینی نکتہ کی نشان دہی کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بطریق احسن اپنا آئینی فرض نبھایا۔ زبیر ڈٹ گیا اور اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا گیا۔۔۔۔۔ اللہ ہی کی حاکمیت قائم ہو تو وعد التوں کو یہ اختیار ملتا ہے کہ حکومت کے کسی حکم کو حتیٰ اگر نافذ العمل آئین کے ضمن کو خلاف احکام و رضائے الہی قرار دے کر عدم قرار دے دیں۔ مگر انسانی ذہن و فکر کا یہ انتظام ہے کہ آئین کے پیش لفظ میں جو کچھ تحریر کیا جاتا ہے، اسے آئین کے ضمانت ختم کر دیتے ہیں، مزید برآں آئین کے ضمانت کو نہایت پرکاری سے قوانین کے ماتحت قرار دے کر پہلے مجروح کر

دیا جاتا ہے، پھر آئین کا شیڈول اس کی روح قبض کر لیتا ہے۔ آئین کی
 فاتح خوانی اس کے نفاذ کے روز سے ہی شروع ہو جاتی ہے اور باقی ماندہ ڈھانچہ
 قوم پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ہم کسی خوفناک آئینی ہیولے کو صدر بنا کر
 وزیر اعظم کو چابی سے چلاتے رہتے ہیں اور کبھی وزیر اعظم کو بلائے آسمانی جان کر
 صدر کو خوبصورت کھلونا بنا لیتے ہیں کہ سیل ڈالے، بٹن دبایا اور چلا لیا۔
 ہماری آزادی بے راہ ہو کر مادر پدر آزادی بن جاتی ہے اور ہم قلعوں، تھانوں
 جیلوں میں اس وقت تک بند رہتے ہیں جب تک ہماری یہ آزادی بونہ
 دے اٹھے۔ سیاہ جھنڈے ہمارا قومی مقدر بن جاتے ہیں۔ قومی جھنڈے
 صرف سرکاری گاڑیوں پر رہ جاتے ہیں اور ڈنڈے پولیس کے ہاتھوں
 میں برسنے لگتے ہیں۔ سرکاری گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں تہ سبز ہو جاتی ہیں اور
 عوام کی سیاہ رہ جاتی ہیں۔ ہر طرف وہل بجنے شروع ہو جاتے ہیں۔ پوچھو!
 کیوں مار رہے ہو تو ارشاد ہوتا ہے ”ٹونا“ اتار رہے ہیں۔ مرہم کی پوچھو
 تو معلوم ہوتا ہے ابھی تو تیار ہوگی۔ ابھی تو نسخہ شاہی حکماء کے زیر تجویز
 ہے۔ یہ سبھی کچھ آئینی بے راہ روی کی وجہ سے ہے کہ اللہ کی حاکمیت صرف
 لکھنے کے لئے نہیں قائم کرنے کے لئے بھی ہے۔ آئین اسلام خالق کائنات
 کا تجویز کردہ ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ یہ کارندہ خدا، یہ اشرف المخلوقات
 اپنے کردار میں نظام کائنات سے ہم آہنگ رہے۔ آج کی انسانی دنیا کا
 سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ انسان نظام کائنات سے ہی نہیں، اصول ہائے
 ارتقائے کائنات سے بھی ٹکرا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے اللہ نے اپنی حاکمیت
 قائم کرنے کے طریقے نہیں بتائے، حالانکہ انسانوں کے مکاتب فکر نے بھی
 کبھی طریقے نہیں بتائے۔ طریقے بتانے بھی نہیں چاہیں، صرف اصول متعین

کرنا چاہئیں۔ طریقہ مقرر نہ کرنے میں اللہ اور رسولؐ کی قابلِ سجدہ دانش پنہاں ہے۔ جمہوری، بادشاہی، فسطائی نظاموں میں کیا کوئی اور طریقہ ہے۔ یہ بالواسطہ و بلاواسطہ انتخابات، پارلیمانی و صدارتی نظام، اشتراکی اور سرمایہ دارانہ جمہوریت، جداگانہ و غیر جداگانہ طریق انتخاب، وحدانی و وفاقی طرز حکومت کیا ایک ہی طریقہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ڈیموکریسی بندوں پر بندوں کی حکومت کو کہتے ہیں۔ اللہ کی حاکمیت ہو تو بندے بندوں سے آزاد ہو جاتے ہیں یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے، ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات "بندوں کے ہاتھ میں نظام تو ہوتا ہے، بندے اپنی مرضی مسلط نہیں کرتے۔ جس طرح تھیو کریسی پاپائیت، فسطائیت کی اپنی توضیحات ہیں۔ اس طرح اللہ کی حاکمیت بھی ایک دستوری اور آئینی اصول ہے جس کی دانش آئین کے ہر ضمن میں آشکار و کارفرما ہونا چاہیے۔ اُسے صرف پیش لفظ تک محدود رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی نام نہاد مجبوبہ کو تحریک اغواء کے لئے تحریر کیا ہو اخط بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرے۔ اللہ کی حاکمیت کے تحت قائم ہونے سے تمام آئینی ادارے اللہ کے احکامات کے پابند ہو جاتے ہیں اور سرِ موخرانہ نہیں کر سکتے۔ جو اللہ کے حکم کے مطابق حکم نہیں کرتے، وہ "کافر، ظالم اور فاسق" ہو جاتے ہیں، ان کے احکامات کتنی سخت تہیہ ہے۔ اللہ کی حاکمیت ہو تو سرکار مدعی نہیں ہوتی، اللہ اور رسولؐ مدعی ہوتے ہیں۔ اگر کچھری میں آواز لگانے والا سرکار بنام فلاں کی بجائے، اللہ بنام فلاں یا رسول اللہ بنام فلاں پکارے تو یہ احساس پیدا ہونے پر کہ اللہ اور رسولؐ میرے خلاف مدعی ہیں، طرز کی طبیعت پر کتنا رقت آمیز اثر ہوگا۔ ہو سکتا ہے۔ اہل کار کا یوں آواز لگانا ہی کسی کو تائب

ہونے پر آمادہ کر دے۔ سرکار بنام فلاں والی آواز تک حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، کے اصول کی نفی کر رہی ہے۔ یہ بندوں کی حاکمیت اور سرکار کے غیر مؤثر ہونے کی وجہ سے ہی ہے کہ پورا معاشرہ سعادت حسن منٹو کی کالی شلوار بننا جا رہا ہے۔ اہل حرم کے سو منات دھرنا مارے بیٹھے ہیں اور کارگر حیات میں غزنوی کی آمد کے کوئی آثار نہیں۔ جلوس در جلوس اور دربار بہ دربار مذہبی پیشوا موجود ہیں مگر سر خسرو سے بوئے سلطانی نہیں جاتی۔ شاید اس لئے کہ دین کے علمبردار خود بندوں کی حاکمیت کے قائل ہو گئے ہیں۔ طاقت کی بحالی کے لئے عوامی سرچشموں کے کنارے آب خورے تھامے کھڑے ہیں اور نہیں دیکھ رہے کہ عوام تو خود خشک لب ہیں۔ وہ دن آگے ہیں کہ پابہ زنجیر قضیہ سیاست جاری ہے اور تخت شاہی سے مراعات سمجھا رہا ہے۔ پاکستان غیر متحد، غیر منظم و بے یقین ہوتا جا رہا ہے اور اتحاد و ایمان و تنظیم نے جاپان میں ڈیرہ ڈال لیا ہے۔۔۔ اللہ ہی کی حاکمیت آئین کی روح ہو، تو اسلام کے قانون سازی سے متعلق اصولوں کو رو بہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ اسلام کے یہ اصول بھی اپنی نوعیت میں منفرد ہیں اور ایک ایسا نظام عدل وجود میں لاتے ہیں جو اپنے اوصاف میں آفاقی اور موجودہ نظام عدل سے قطعی مختلف ہے۔ ہمارے قانون سازوں نے اس کا ادراک حاصل کرنے کی تا حال کوئی نمایاں کوشش نہیں کی۔۔۔۔۔ اللہ ہی کی حاکمیت نہ ہو تو قوانین تو کجا، اصول ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ اھدنا الصراط المستقیم“ تک صرف زبانی اور انفرادی اقرار ہو کر رہ جاتا ہے، اور عملاً ساقط ہو جاتا ہے۔ جن پر بندوں کی حاکمیت و قانون مسلط ہے، وہ تو حکومت الہیہ میں داخل ہی

نہیں ہوئے۔ ان کے متعلق یہ خدشہ لایعنی تو نہیں ہوگا کہ وہ عملاً "ناٹ مسلم" ہو کر نہ رہ جائیں۔۔۔۔ اس سے بھی زیادہ خطرے میں وہ لوگ ہیں جو اللہ اور بندوں کو بیک وقت حکم تسلیم کرتے ہیں۔ کیا اللہ کی وحدانیت، اللہ ہی کی حاکمیت تسلیم کئے بغیر بھی جزو ایمان رہ سکتی ہے۔ اگر آئینی طور پر اللہ ہی کی حاکمیت کا رفرما ہو تو کمیونسٹ ہونا مسلمانوں کی ہر آبادی کا مقدر ہو کر رہ جائے گا اور صورت حال دانشوروں یا انسانی حکمرانوں سے سنبھالے نہ سنبھلے گی۔ اللہ ہی کی حاکمیت کے بغیر اسلامی معاشی نظام کے اصول موثر طور پر نافذ نہیں کئے جاسکتے اور مغربی کیپٹلیزم کا تو مقدر ہی بالآخر کمیونسٹ ہو جانا ہے۔ اسلام میں "اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں" کا اصول وارد کر کے بندوں کی حاکمیت کا عدم اور اللہ ہی کی حاکمیت قائم کی گئی ہے۔ مسلمان ہو کر بندوں کی حاکمیت کا علمبردار ہونا نئی شلوار قمیص پر انگریزی سوٹ کی پرانی واسکٹ پہننے کا سا عمل ہے۔ یہ کوئی معمولی سا عمل نہیں کہ اس سے درگزر کیا جائے کہ یوں تو عقیدہ توحید کے لئے بالواسطہ خطرہ پیدا ہوتا ہے، مگر جن کی نگاہ میں بت خانہ ہوا نہیں کیا کہیں۔ اسلام کا نظام حکومت بندوں کے اللہ ہی کی حاکمیت تسلیم کر لینے کو کہتے ہیں اور بندوں پر صرف رضائے الہی ہی کے تسلط کا دوسرا نام ہے۔ اسلام کے پردے میں خود کو نافذ کرنے کے متمنی سیاست دان وغیرہ سیاست دان ایک طرف ڈھانچوں کی تلاش میں ہیں، دوسری طرف چلمن سے سر نکال کر آواز سے دیٹے جارہے ہیں کہ چاہے ہمارے ڈھانچے نکل آئیں، ہم ڈھانچہ دینے نہیں دیں گے۔ گویا انسان اپنے اقتدار کے لئے لڑ رہے ہیں اور پاکستان انتباہ کر رہا ہے کہ میرے نظریہ کے مطابق اللہ کا آئینی و قانونی اقتدار قائم کر کے تم نے بندوں کو اپنے حکم کی گرفت سے آزاد کیا تو "تزرع الملک"

اپنی پیشانیوں اور میرے پورے تحریر پاؤں کے جس معاشرہ اور ملک میں
 صرف اللہ ہی کی حاکمیت ہو، اس میں مفلس و مسکین، یتیم و بے وسیلہ
 شہری اہم ترین قرار پاتے ہیں۔ با وسیلہ لوگ طبعاً فقر اختیار کر لینے پر
 آمادہ ہو جاتے ہیں اور منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا پارا تک نہیں رہتا۔
 انسان مادی وسائل کا محتاج نہیں رہتا اور بلا روک ٹوک اپنی صلاحیتوں کو
 بروٹے کار لانے کا اہل ہو جاتا ہے۔ مگر ہم کہ کشتہ سلطانی و مملاتی و پیری
 ہیں، اس افادیت کا ادراک نہیں کر رہے اور بے شعوری سے مفر ہیں
 کہ ہمیں پابند کنیز ہرمن، دوں نہاد، مردہ ضمیر و دیوبے زنجیر ہی رکھا
 جائے۔



کس کی زباں کہے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے

کس کو کلام ہو گا کہ معمارِ قوم کی وفات کے بعد سیاستِ پاکستان مسلسل ابہام، جمود، ریشہ دوانیوں، سازشوں اور کوتاہیوں کا شکار رہی۔ کبھی غیروں نے بہکایا تو کبھی اپنوں نے ڈس لیا۔ اگرچہ شہروں کی رونق بڑھی۔ صنعتیں قائم ہوئیں، کارخانے کھلے، تجارت نے منافع کے انبار لگائے، دفاتر وسیع ہوئے، نئے دارالخلافے آباد ہوئے۔ کاروں، سکورٹروں، موٹر سائیکلوں میں یوں اضافہ ہوا کہ برساتی مینڈک بھی ٹرا کر رہ گئے۔ گھر، لباس، دسترخوان، حتیٰ کہ غسل خانے تک ماڈرن ہو گئے۔ سڑکیں تعمیر ہوئیں، اپل بندھے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹرانسٹیز، وی۔سی۔آر سمجھی آبادیوں تک یوں اثر انداز ہوئے کہ گھریلو ملازمین تک کو بھی اپنی اولاد پر ڈرامائی اور افسانوی کرداروں کا گمان ہونے لگا۔ باپ بیٹے، شاگرد و استاد تک کے درمیان گفتگو میں بھی فلمی مکالمے اور اشتہاری فقرے در آئے۔ سبزی فروشوں نے جنگلے تعمیر کئے۔ کباب فروشوں کی کوٹھیوں میں نئے ماڈل کی کاریں پارک ہوئیں۔ مگر سیاسی افلاس، ذہنی و فکری ناپختگی، بے شعوری و بے اطمینانی یوں بڑھی کہ ہر اتحاد منتشر، ہر ایقان غیر محکم اور ہر تنظیم غیر منظم ہو کر رہ گئی۔ تخلیق ناپیدا اور تنقید دستور حیات بن کر رہ گئی۔ ہر سیاسی

تحریک نے اپنی کوکھ سے مارشل لا برآمد کر کے اپنے ہاتھ ہونے کا اعلان کر دیا۔ بجائی حقوق کی ہر فریاد تعطیل حقوق کی چوکنی منہ میں لے کر خاموش ہو گئی۔ آئینی ایجاب و قبول یوں ٹوٹتے رہے کہ ”پیپر میرج“ اور ”مٹھہ کے معاہدے“ بھی کبھی یوں نہ بکھرے ہوں گے۔ جو بھی سربراہ مملکت بنا، یہی نوید لایا کہ آئینی امید سے ہوں۔ ہر فرمان شاہی نے یہی اعلان کیا کہ بوجہ نافرمانی و ناکردہ کاری رعایا کو دستوری طور پر عاق کیا جاتا ہے۔ اتنی ایمر حنیایا نافذ ہوئیں کہ ناروا ضرورتیں بھی نظریہ بن گئیں۔ ہر ارتقا کو نظر کھا گئی اور ہر تعمیر نذر چڑھا دی گئی۔ ہر آئین کا مصنف یا اپنی تصنیف کو کھا گیا یا تصنیف اپنے مصنف کو نگل گئی۔ آئین پر دستخط کرنے کی ہر تقریب کے انعقاد کے ساتھ ساتھ ہی اس کی تنسیخ کی مہریں یا باڈی کارڈوں کی وردیوں میں چھپا دی گئیں یا عدالتوں کی میزوں پر سجادی گئیں۔ ہر آئینی حلف اٹھانے والے نے دل ہی دل میں یہ عہد کیا کہ میں حاشیہ بردار اس آئین کی دستاویز تنسیخ کا گواہ حاشیہ بنوں گا۔ ہر انسانی اللہ نے نیت یوں ہی باندھی کہ لا الہ الا اللہ میں ہی اللہ ہوں۔ ہر نائب خدا یوں ہی کار فرما ہوا جیسے اللہ طویل رخصت پر ہوں اور یہ ہی ”ایکلنگ خدا“ ہو۔ اس تمام تر صورت حال کے اصل ذمہ دار کون لوگ تھے۔ وہی بیدنی طاقتوں اور سازشی بیوروکریسی کے مستثنیٰ کھلونے، وہی افہام و تفہیم سے نا آشنا، اجتہاد کے بنیادی اصولوں سے نابالغ، الحاد پرست، آفاقی واردات کو حدودِ زمان و مکان میں مقید رکھنے کے عادی، اُفروسی زندگی کے مردہ ضمیر منکر، یہود و نصاریٰ کے پروردہ اسلام پسند، ضمیر اسلام پر دشمنانِ اسلام کے چڑھائے ہوئے عجمی غلاف، روایات میں کھوئے ہوئے خرافاتی، کلیسا نواز سوماتی، مطالبِ قرآن اور مقاماتِ کلماتِ ربِّ ذوالجلال

پر جہے ڈالے ہوئے زنا رپوش، بغل میں قرآن اور سر پر لغت ہائے عجم اٹھائے
 ہوئے دین فردش، صہیونیت کے ہاتھوں میں اپنی انگشت شہادت تھمائے ہونے
 فرزدان تہذیبِ آدم گش، پردہ تہذیب میں چھپے ہوئے غارت گر، نوع انسان
 کے پرکار شکاری، مصنوعی نگوں کے ریزہ کار، خیرہ ذہن شہریار، انت تئی بختوں
 کے تمھیں کش موجد، وہی راہ زنان تمکین و ہوش، ساقیان عزیز مصر، درہائے
 زلیخائے سیاست کے قفل بردار، برادان یوسف کی تحریر کردہ تمھیں خون آلود
 کی فرد برآمدگی کے گواہان حاشیہ، وہی ساربانان قارون، وہی فرعون نو
 کے کہنہ مشق خدا ساز، نمرود کے لدے لدوائے لکڑ ہارے، وہی حزب اقتدار
 کے قابیل اور حزب مخالف کے ہابیل جو بہ فیض پرکاری مداخلتِ سیاسیات
 خارجہ کتاب در کتاب، صفحہ در صفحہ، ذہن در ذہن ہی نہیں، گلی گلی، کوچہ
 کوچہ یوں انجمن آراہیں کہ مسجد و مکتب تو کجا سرکاری پالیسی ساز اداروں کے
 در و دیوار بھی حیران و ششدر ہیں کہ جن کا بہت چرچا تھا وہ بت شکن کیا
 ہوئے۔ یہ دشمنانِ دین و رفیقانِ دنیا کہاں سے آگئے کہ جدھر دیکھو سو "منات"
 کی کار فرمائی ہے۔ لات و عزیٰ کی فکر برپا ہے۔ فتح مکہ کا یہ ماڈرن انداز تاریخ
 کے کون سے باب میں تحریر ہوگا کہ ابوسفیان کے گھر میں پناہ لینے والا کوئی
 بھی مسلمان نہ ہوا۔ جس سے رفع یدین کروایا، اسی کی آستین سے بت برآمد
 ہوئے۔ پایا تو شناختی کارڈ پر ابو جہل کی تصویر چسپاں تھی، دیکھا تو پاسپورٹ
 پر ابو لہب تحریر تھا۔ پورے ملک میں آزر اپنے تجدیدی آرٹ کی نمائش ہمارے
 ہوئے ہے۔ جدھر دیکھو، بنام ترقی بطرز غلامی دیواستبداد دہاڑ رہا ہے۔
 مفلسوں کا افلاس ہے کہ بہ ذوق سرمایہ داری تل رہا ہے۔ نگاہِ شفقت
 بھی خدائی کی زکوٰۃ بن کر رہ گئی ہے۔ عفتِ ایمان طوائفِ خیال کی آرائش گاہ

میں سچ رہی ہے۔ جلد ہر نگاہ اٹھاؤ بادِ صنوبر بہمن گھنٹیاں بجا بجا کر اعلان کر
 رہے ہیں، ہماری زنا راٹوٹ ہے ”اعتصموا و تفرقوا“ جس میدان میں جاؤ
 کوئی نہ کوئی بازی گراپنے رستے کو ”جبل اللہ“ قرار دے رہا ہوتا ہے۔ ہر ذہنی
 تفریح گاہ میں گم شدہ قلمدان کے متلاشی سیاست دانوں کے کارندے فکری
 ”ہیروئن“ فروخت کرنے میں مصروف ہیں۔ آئین پیغمبر کو اپنی ذات بے صفات
 کے لئے خطرہ جان یہ ہوشیار تضاداتی، وفاقی، جمہوری، اشتراکی، اسلامی بے
 فکرے عوام کے سرچشمہ خیالات و احساسات کو یوں رنگ آمیز کر دیتے ہیں جیسے
 رادھا ہولی کھیلتی ہوئی گوپیوں میں پھنس کر یوں انگیا جائے کہ کرشن مراری
 بھی اس کا یہ روپ دیکھ خوف زدہ ہو، مرلی پھینک، بھری جننا میں گود جائے
 اور تمام بگلے بھگت رام رام پکار اٹھیں۔ جوں ہی کسی کے ایمانِ خوابیدہ کے
 انگریزی لینے کے انداز رونما ہوں، یہ طیبیانِ عطائی اور مسیحیانِ مصلوب ”زہر بے
 تریاق“ لسخوں میں تحریر کئے ایک ہاتھ نبض پر اور دوسرا پیشانی پر رکھ کر بڑے
 اجملاہ انداز میں ذرا زبان دکھانے کو کہتے اور بے ساختہ اعلان فرما دیتے ہیں کہ
 عزیز تیمار دارو، بوجہ پندہئی تکلم زبان مریض دراز ہو گئی ہے۔ اور اسی باعث
 بشمول معدہ، اس کے جملہ اعضائے رئیسہ، جن کی حیثیت ایک پشتی وفاق
 میں صوبوں کی سی ہوتی ہے ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں، جسے زبان
 سیاست میں احساس محرومی کہا جاتا ہے۔ لہذا یہ دو زہر بے تریاق“ جسے
 آئینی اصطلاح میں صوبائی خود مختاری کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چناب و راوی
 کے دو آب کے ساتھ کسی ابر آلود، بے ستارہ و ہلال رات کی تاریکی میں، آب
 اٹک و سندھ سے کُلی کروانے کے بعد استعمال کرواؤ۔ اس کی زبان لٹک
 جائے گی تو متفکر نہ ہونا کہ اعضائے رئیسہ کی آزادی کے یہی آثار ہوتے

ہیں۔ آہستہ آہستہ اسے اقتدار میں عدم شرکت کا مزید احساس ہونے لگے گا اور یہ آہستہ آہستہ تراہیم کا تقاضا کرتے کرتے از خود مختار و علیحدگی پسند ہو جائے گا۔ ٹوٹ پھوٹ جائے گا، بکھر جائے گا تو سمجھ لینا صحت یاب ہو گیا۔ دن نکلنے ہی سے گہری عینک لگو کر اس کے لئے عدالتوں کے عالیہ احاطوں میں واردات قتل اور درس گا ہوں میں اسلحہ کے اجباروں کی خبریں مہیا کرنا، اور کوڑے کھانے کا سلیقہ سکھانا کہ اس کے لئے اس نوع کی ذہنی اور جسمانی ورزش کی اس وقت تک اشد ضرورت ہے، جب تک اس پر یہ راز افشا نہ ہو جائے کہ انصاف کے گھر تک پہنچ جانے کا اصل حاصل جبرم کا عدالت تک پہنچ جانا ہی ہوتا ہے۔ یہ یقین نہ کر لے کہ جسم میں رگ و جان کی ضرورت حکمت فرسودہ ہے، روح محض ایک مفروضہ ہے، اعضائے رئیسہ کے وسائل مشترک نہیں ہوتے۔ یہ تسلیم نہ کر لے کہ اعضائے رئیسہ دراصل وہ جاگیر جہانگیر ہے جو ذہن انسان کو اس کی سازشی آمرانہ پرکاریوں کے صلے میں عطا ہوتی ہے۔ قلب ریاست تو صرف عمارت سیاست کے ڈرائینگ روم کا الیکٹرانک کلاک ہے۔ اصل اطمینان تو حاکمیت و آمریت کے اس بیڈ روم میں ہی ملے گا جسے سیاسی دماغ کہتے ہیں۔۔۔۔۔

انسانی ضمیر تو جسم کا آزاد قبائلی علاقہ ہے، اسے ہرگز مملکت میں شامل نہ سمجھو۔ فقط ان ہی مخصوص افعال کے لئے خاص رکھو جن کے لئے یہ آج کل استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ اس مریض زیر علاج کی یہ وفاقی و صوبائی تقسیم جو بظاہر نسلی و لسانی ہے، دراصل اس کے حواسِ خمسہ کی تقسیم ہے۔ سپر تفریق کے طفیل احساسِ لمس تو ۱۹۷۰ء میں ہی جاتا رہا تھا۔ باقی چار حواس صرف اس لئے زیادہ حساس ہیں کہ نقل و وفاقی اور اصلاً صوبائی ہیں۔ ایسے

حواس کا بیک وقت بیدار و کار فرما ہونا انسان کے ابہام و ادہام زدہ ہونے کا پیش خیمہ ہیں۔ لہذا کوئی فکر قومی نہ ہونے پائے، کوئی سیاسی جماعت ملک گیر نہ ہو، کسی تحریک میں پورا ملک شریک نہ ہو سکے۔ یک جہتی کا ذریعہ اگر اسلام بھی ہو تو اسے بھی رسوا کر ڈالو۔ ہر اتحاد توڑنے کے لئے قائم کرو اور ہر انتشار کو مستحکم رکھو۔ خاص احتیاط رکھو کہ یہ مرہن جب تک ہمارے زیر علاج ہے، جسے چکھے اُسے چھوٹے نہیں، جسے سونگھے اُسے دیکھے نہیں اور جسے دیکھے اُسے سُننے نہیں۔ ورنہ اس مفلوج کے اندر زلزلے لرزنے لگیں گے۔ خدا لگتی کہو، ایسے اطبا کا زیر علاج بار بار "ایکسٹینسو کیئر" کے اس وارڈ میں داخل ہو گا یا نہیں جسے سہل ادائیگی کے لئے مارشل لاکتے ہیں۔ کیا یہی وہ طریق علاج نہیں جس کے نتیجے میں پاکستان تخت لخت ہوا۔ مزید خدا لگتی کہو کہ ہماری اس قسمت کا تاریخ ماتم کرے، اس پر رشک کرے، ماحسد کرے، مذاق اڑائے یا روٹے کہ مارشل لاک نافذ ہو تو ہماری سیاست جو ہمیشہ اندرونی و بیرونی یورو کریسی کے اشاروں پر ناچتی اور ان ہی کی تھاپ پر آسن جاتی ہے، نعرہ زن ہوتی پائی گئی ہے کہ جمہوری کوششیں بار آور ہوئیں۔ ہم اس مارشل لاک کے معاون ہوں گے، اس سے اپنا احتساب کروائیں گے، اسی سے اپنے انتخابات کروائیں گے، جس سیاست کو انتخابات کروانے کے لئے فوج کی نگرانی کی ضرورت ہو، اس کی فوج نگران ہو جائے یا سیاست میں آدھکے تو کس کو طعن دیں۔ بازوئے شمشیر زن کو، یا سیاسی ذہنوں کی عظیم جنگ کو۔ سیاست دان ہی اگر مطالبہ کریں کہ ان کے انتقال کردہ اقتدار کا انتقال بعد از نظر ثانی فوج ہی کے ہاتھوں ان کے نام درج ہو۔ سیاسی اقتدار کی جمعندی میں ان کا نام فوج ہی کے قلم سے تحریر ہو تو سیاسی پٹوار خانوں

کا کالعدم ہو جانا کس کے نام لکھیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہماری موت یا بند ماری
 سیاسی آنکھ فیڑ پلے آپریشن کے بعد اس وقت کھلتی ہے جب ہمارا نام خانہ
 ملکیت سے خانہ ناجائز کاشت بے لگان میں لکھا جا چکا ہوتا ہے۔ اور پھر ہم
 برسوں صحت گرداوری کی درخواست کی پیروی میں لگے رہتے ہیں۔ تنگ آکر ہم میں
 سے کچھ معذور خدا کے گھر کو دیکھنے کے لئے عمرہ کا قصد کر لیتے ہیں اور کچھ خدا کی شان
 دیکھنے کے لئے انگلستان کے قصد پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے،
 اسلام کو دیکھو تو دوسری طرف سے کوئی عشوہ طراز زلفِ نارسا کو بل دے کر اشارہ
 کناں ہوتا ہے کہ اس "لام" کو دیکھو۔ اور ہم بڑبڑاتے رہ جاتے ہیں، اسلام ہمارا
 دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ اور
 مارشل لاء کی کار فرمائی ہمارا تو مقدر بن چکا ہے کہ مشرقی و مغربی صہیونیت نواز
 طاقتوں، ان کے اہل کار و انشوروں اور تجربہ کار کارکنوں کا یہ عمل جاری رہتا ہے
 کہ وہ غلط کام صحیح طریقے اور صحیح کام غلط طریقے سے کرانے کے علاوہ ہر عمل میں
 عمداً ایسی خامیاں رکھوا دیتے ہیں کہ جب چاہیں ان کی نشاندہی کروا کر مضبوط تر
 حکومتوں کو بھی چلتا کرتے ہیں۔ آم چوس لیتے ہیں اور گٹھلیاں اٹھا پھینکنے کے
 دام بھی وصول کر لیتے ہیں۔ آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جو عمل جمہوریت ہماری سیاست
 اور سوشلزم ہماری معیشت کے اصولوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ اسی کی زد میں
 نفاذ اسلام کے عمل کو لایا جا رہا ہے۔ حالیہ انصاری کمیشن، کی سفارشات اسی
 پرکاری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اہل رائے کا اسلامی معیار مقرر کئے بغیر انتخابات کا
 اہتمام لادینی بنیادوں پر ایوانِ دین تعمیر کرنے کی کوشش لا حاصل کے سوا کچھ
 بھی نہیں۔ مشاورت کے دائرہ کار و اختیار پر کسی اسلامی قدغن کا نفاذ نہ کرنا امارت
 کو کھوکھلا کرنے کا پرکار عمل ہے۔ امور میں باہم مشورہ فرمان الہی ہے مگر مغربی

طرز انتخاب میں "وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بِمِنْهُمْ" یا "مَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" کا مرحلہ کب آتا ہے
 اور کن عوامل کی بنا پر ایسے انتخابات کو اسلامی مشاورت کے تقاضوں سے ہم آہنگ
 قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ سفارشات حالات سے سمجھوتہ کرنے اور حق و باطل کی
 آمیزش کی آئینہ دار ہیں۔ حالات کا برپا کرنا اور فکری انقلاب لانانہ ان
 کے مافی الضمیر میں ہے نہ ان کا مقدر ہو سکتا ہے۔ ان میں شخصی ذہنی
 تحفظات کی بھرمار ہے جن کی موجودگی میں اللہ ہی کی حاکمیت کا قائم ہونا
 ناممکن ہے۔ جو الجھنیں یہ سفارشات پیدا کریں گی، اسلام کے لئے کسی
 کا تمام تر خلوص بھی ان کو سلجھانہ سکے گا۔ منفی حیرت کی فراوانی کے سوا ان
 کا ما حاصل اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کلیسا طوعاً و کرہاً اسلام قبول کرے گا۔ مگر
 صلیب نہیں اترے گی۔ اللہ جس نے فرمایا ہے کہ اسلام میں پورے کے
 پورے داخل ہو جاؤ، یقیناً انصاری کمیشن سے زیادہ دانا ہے۔ کاش کوئی
 سمجھتا کہ فرمانِ افرنگ سے فرمانِ الہی کہیں زیادہ دانشمندانہ ہے۔ جس حق
 کے آنے سے باطل نہ جائے اُسے لانے والے سے کوئی کوتاہی ضرور ہوتی ہے
 ضرور ہو رہی ہے۔ یہی عمل اس سے پیشتر "آئین برطاق" کے ساتھ بھی ہو چکا۔
 یقین نہ ہو تو عوامی حقوق سے متعلق ضمن نمبر ۸ کا مستثنائی شیڈول پڑھ
 لیں کہ ساٹھ سے زائد مارشل لاء کے ضابطے اور دیگر قوانین جو عوامی حقوق
 کو بلکہ اسلامی اقدار کو غصب کئے ہوئے ہیں، آئینی دسترس سے محفوظ کر
 دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی دعویٰ یا رسائی تھا۔ یوں اس کی عملداری عوام
 کو مطمئن نہ کر سکی۔ سوشلزم روٹھ گئی اور اسلام بیزار ہو گیا۔ اسی طرح
 فیڈرل شریعت کورٹ ایکٹ نے عائلی قوانین، مالی و مالیاتی قوانین، ٹیکسوں
 سے متعلق قوانین، نام نہاد زرعی اصلاحات، بینکوں اور انشورنس سے

متعلقہ قوانین اور آئین کو مستثنیٰ قرار دے دیا۔ اگر یہ غیر اسلامی نہیں ہیں تو اس استثناء کا مقصد۔ اور اگر غیر اسلامی ہیں تو پھر شریعت کو رٹ کے قیام سے کیا مراد۔ ہر کوئی جانتا ہے، سوڈا اور سٹہ آج بھی آئینی و قانونی تحفظ میں ہیں۔ شرعِ مملکت میں جسے اللہ کے قانون کے مطابق سزا نہ ہو سکتی ہو، وہ انسان کی مقرر کردہ حدود کی رو سے لائق تعزیر بھی ہے اور مستحق سزا بھی۔ آج کے قوانین و آئین اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم بھی ہیں اور متضاد بھی۔ آج کے قوانین کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو قانون ہے اُسے حق تسلیم کرو۔ جبکہ اسلام کا فرمان ہے جو حق ہے صرف اسی کو قانون تسلیم کرو۔ آج کے قانون، آئین اور انصاف کے ہر ضمن کی بنیاد سرمایہ داری ہے۔ ان کے صنم کدوں میں ”ایوان سیزر“ کی شمعیں روشن ہیں۔ قانونی و آئینی دفاتر قیہ روم کی تربیت گاہوں کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور تربیت گاہیں فقط پرورش ذہن کسریٰ و زرتشت کے لئے خاص کر دی گئی ہیں۔ قراردادِ مقاصد صرف آئینی دار ہے۔ سنت رسولؐ عالمانِ دین نے متنازعہ کر رکھی ہیں۔ ان تنازعوں کے ہوتے ہوئے اس قرارداد کا غیر موثر رہنا لازم ہے۔ شرح کو نافذ کرنے، اس کے نفاذ پر اصرار یا شرع کو شرح کے تابع کر دینے کا عمل ”امرِ ربی“ کو ذہن انسان کے مطیع کرنے کے ناروا و ناگوار و ناپسندیدہ عمل کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اسلام کو ریاست کا فقط مذہب قرار دے کر اس کی بغلوں میں مغربی جمہوریت اور سوشلزم کی بیساکھیاں دینا سیکولر پُرکاری ہے۔ آئین و قوانین میں کہیں ”قل العفو“ ”لیس للانسان الا ما سعى“ ”قیام صلوٰۃ“ ”ایتائے زکوٰۃ“ کے آفاقی اصولوں کی روح موجود نہیں۔ قوانین زکوٰۃ نے صرف زکوٰۃ کی ملوکی شرح نافذ کی ہے۔ آئینی و قانونی نظام

زکوٰۃ نافذ نہیں ہوا۔ یہ سب کچھ ان ہی متذکرہ بالا پر کار مشیروں کا کیا دھرا ہے۔
 اسلام سے اس قدر اخلاص رکھنے کے مدعی اتنے باختیار حاکم کے ہوتے ہوئے
 نہ معلوم خوشامد، تعریف یا انتہائی مصلحت اندیشی کا درس دے کر یار
 لوگ ہاتھ دکھا گئے یا یہ سب کچھ نظریں بچا کر ہو رہا ہے۔ بہر حال ان حالات
 میں اچھا نہیں ہوا جب ایک سپر طاقت کا حکم صادر ہو کہ پاگل خانے
 کی دیواریں مزید بلند کرو اور دوسری لانچ دے رہی ہو کہ اے صید زبون
 شہریاری، عربوں کی محتاجی چھوڑ، تیل کی ریاستوں کے عقبی دروازہ کو
 مضبوط کرنے سے مغربی یورپ کی رگ جان تو محفوظ ہو یا نہ ہو، تیرا تیل
 ضرور نکل آئے گا۔ اس لئے عرب نواز نہ بن، ارب آشنا ہو۔ تو چاہے
 تو میں اربوں کے خرچ سے ریل بچھا دوں، سڑکیں بنوادوں۔ ہر قصوری کو
 قصوری و کشوری بنادوں، فولادی اؤنٹ مہیا کر دوں۔ میرے پاس تو انائی
 کے فیل بھی ہیں اور اصحاب فیل بھی۔ ان کی خراب آنکھوں اور جسمانی
 کھجلی کی طرف نہ دیکھ۔ میرے سرمہ ہندو کش، سلیمانی سلانی اور مشکیزہ
 گرم آب کی طرف دیکھ۔ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا۔ ”لا الہ الا کوئی
 الہ نہیں پکارنے کی بجائے ”الہ کوئی نہیں“ پکار۔ جذبہ جہاد فی سبیل اللہ
 کو آثار قدیمہ کے عجائب گھروں کو بطور عطیہ دے دے۔ تلوار نہیں اختیار
 سنبھال۔ لوگ امن فوج بنا لیتے ہیں تو امین فوجی مجھے کیوں قبول نہ ہو۔
 مگر یہ اسلام پسندی مجھے ہرگز گوارا نہیں۔ بیرون در ان علامتوں کے
 ہوتے ہوئے درون در یہ علثیں کسی محب وطن کو زیب نہیں دیتیں۔ مگر
 کاش حب وطن بازاروں سے خریدی جاسکتی۔ متذکرہ بالا تجاویز اور مشورے
 دینے والے کاش اس امر کا احساس کریں کہ بتدریج ہی سہی، نوید انقلاب

اسلامی کو ان طور طریقوں سے مسدود کرنا نہ دینی مفاد میں ہے، نہ قومی و
 ملکی مفاد میں۔ اسلامی نظامِ حکومت و سیاست کو انسان زدہ کرنے
 کی ہر کوشش اللہ کی حاکمیت سے ٹکرانے کی غیر دور اندیشانہ حرکت ہے۔
 کسی مخلص مسلمان کے خلوص سے قطع نظر کر کے اپنی ہنگامی ضروریات کے
 لئے اُسے بے راہ کرنا صالح عمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ آخر ہمیں افرنگ کا
 اندازِ فکر اور انسانی اذہان کی خیالی تخلیقات وحی الہی سے بھی زیادہ کیوں
 عزیز ہیں۔ اور اگر کسی کی نظر میں کوئی مخلص نہیں ہے تو بھی اس کے
 ساتھ مخالفت میں اسلام کو رگیدنا یا اس سے منحرف ہو جانا کیا صحیح طرزِ فکر و
 عمل ہوگا۔ اسلام کا آئین اگر نافذ ہو اور اس کے مسلمہ اصولوں کے مطابق
 اگر انتخابات ہوں تو راقم خود کو اہل نہیں پاتا۔ پھر بھی مُصر ہوں کہ آئین و
 شرع پیغمبر ہی فائدہ ہونا چاہیے۔ دیگر تمام مکتبہ ہائے فکر باطل ہیں۔ جو کچھ ہو رہا
 ہے، جو کچھ برپا ہے، اس کا ذکر گراں تو گزرتا ہوگا مگر میں ہم وطنوں سے
 بھی اور ان سے بھی جن کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہے، دریافت کرتا ہوں ے

تم ہی نہ سن سکے اگر، قصہ غم سننے کا کون
 کس کی زباں کہے گی پھر، ہم نہ اگر سنا سکے



کیا نہیں کوئی غزنوی کارکہ حیات میں

بچے کھچے کچھ سیاسی بچے اور انتخابی مینجے ” ایک تھی چڑیا اڑنے والی،
 دانہ دُلکا چکنے والی “ کی طرح میدانِ سیاست سے کالعدم ہو کر فراست سے
 عاری جس طرح باورچی خانوں اور عوامی دسترخوانوں پر ٹھونگ رہے ہیں۔ دینائے
 دانش کا اتنا بڑا سانحہ ہے کہ اس سے دوچار ہو جانے کے بعد شعوری سالمیت
 اور عقلی وحدت کا مستحکم ہونا ممکن ہی نہیں۔ صورت حال اگر یوں ہی رہی
 تو امیدِ انتخاب آنت خواب بن کر رہ جائے گی۔ اور ” تا پھر نہ انتظار میں
 نیند آئے عمر بھر۔ آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں “ کا عالم
 اگر مثلِ سراب رونما نہ بھی ہوا تو بھی یقین ہونے لگے گا کہ ” ہیں خواب
 میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں “ حرص اقتدار کی دیوی کے پاؤں رکتے
 رہیں گے۔ اقتدار کا جسم ٹوٹتا رہے گا۔ کوچہ رقیب کے تمام پردے گرا
 دیئے جائیں گے۔ جو بھی نکلا تیری بزم سے پشتیمان نکلا کا عالم ہوگا اور اعلان
 ہوگا کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرتے ہو، تو شاہ باس، ضرور کرو۔ قبل اس کے
 کہ تم انتخابات کی نفی کرو، تم منفی ہو چکے ہو گے۔ یا اگر تم انتخاب نہیں چاہتے
 تو ہم تم سے بگاڑ نہیں چاہتے۔ تم کو جو منظور نہیں، ہم کو بھی منظور نہیں۔
 بچھرو نہیں۔ اس رات کی بات جانا چاہتے ہو، تو پہلے اس رات کی بات بتاؤ

جب تمہارے خناسِ سیاست نے مُخنّث ہونے کا اقرار کیا تھا۔ اور تم کوہ مری کی مرغوب فضاؤں میں حفاظتی حراست کے باوجود اظہارِ تشکر فرما رہے تھے کہ آپ نہ ہوتے تو ہم مارے جاتے، آپ نہ ہوں گے تو ہم مارے جائیں گے۔ اب بھی تقاضائے انعقادِ انتخاب بطرزِ عرضِ التوائے انتخاب اس امر کا شاہد ہے کہ سیاست کے پٹھے بہت کمزور ہو چکے ہیں اور معمولی پٹختنی سہارنے کے بھی اہل نہیں۔ مغربی جمہوریت کی گود میں پلے ہوئے سیاسی سوداگر محض ریلوے اسٹیشن کے خوانچہ فروش بنتے جا رہے ہیں۔ عاشقی میں عزت سادات جاتی تو کئی بار دیکھی تھی، سیاست میں مرگِ مفاجات کا حالیہ عمل موجودہ دور ہی کی دین ہے۔ سیاسی جگر گوشے مارے بھوک کے بلک رہے ہیں اور اقتدار ہے کہ صرف ہڈیاں ابال رہا ہے۔ ملت بیضا جو کبھی غرباء کے دم سے زندہ تھی، زکوٰۃ اور اوقاف کے پالے ہوئے علماء سے سورۃ یٰسین سن رہی ہے۔ وہ انسان جس کے لئے کائنات مسخر کی گئی تھی، خلافتِ ارضی جس کا پیدائشی منصب تھا، اپنے ہی پیدا کردہ حالات کے ردِ برو دست بستہ دو زانو ہو کر بلک رہا ہے کہ گذارشِ احوال واقعی مقصود ہے۔ بوجہ دستورِ زبان بندی قوتِ گفتار سلب ہو چکی۔ حافظہ مفروب اور ذہن مجروح ہے۔ سوائے آیت الکرسی کے اور کچھ یاد نہیں۔ بڑبڑاتے ہیں تو ہڑبڑا جاتے ہیں اور ہڑبڑا اٹھتے ہیں، تو بڑبڑانے لگتے ہیں۔ تخت کے منلاشی، ”تختہ بندم کردہ ای“ چلا رہے ہیں۔ قصرِ دریا سے بچے تھے، وسعتِ صحرا میں پھینک دیئے گئے اور اپنے ہی پسینے سے تر دامن کو سکھاتے اور دکھاتے ذرہ ریگ میں تمازتِ آفتاب کے دعویٰ دار ہیں۔ آتشِ نمرود سے دامن بچا یا تھا۔ عرقابِ فرعون میں

ڈبک گئے۔ نظریہ پاکستان نامنطور، بنگلہ دیش منظور جن کی سیاست کا
 ما حاصل رہا وہ ہر گنگا کے گنگا رام اور ہر جمنا کے جمنا داس، اہل حرم کے سونے
 بنے، جذباتِ اہل وطن کے منجمد ہو سے یتیم کئے دستارِ امامت ڈھونڈتے
 پھر رہے ہیں۔ اقامتِ قضا ہو جاتی ہے، مقتدی سلام پھیر کر چلے جاتے ہیں
 اور یہ خالی صفوں کو خطبہٴ سیاست سناتے رہ جاتے ہیں کہ اسلام کے نظامِ
 سیاست میں سیاسی پارٹیوں کا وجود لازم ہے۔ سیاسی پارٹی اگر بندوں کے
 اقتدار کے لئے وجود میں آتی ہے تو پھر ایسی پارٹی بازی لا الہ الا اللہ کی نفی
 ہے اور لا الہ الا اللہ سیاسی پارٹی بازی کی۔ نوبت بہ این جا رسید کہ عہدہ
 طلبی اور ہم جوئی کے رسیا مغربی جمہوری نظامِ سیاست کو عین اسلام قرار
 دیا جا رہا ہے۔ انفرادی ملکیت و سرمایہ داری و زرکاری کا لازمی جز قرار
 دیتے ہوئے کچھ لوگ رتی بھر بوجھ بھی اپنے ضمیر پر محسوس نہیں کرتے۔ یہ فلسفہٴ
 سیاست اپنایا جا رہا ہے کہ ہزاروں منکر معروف قرار پا جائیں، لاکھوں
 معروف کی نہیں ہو جائے، انسان اہل الرائے ہی رہتا ہے۔ نیک و بد میں
 تمیز کو رجعت پسندی قرار دے دیا جاتا ہے۔ گویا اللہ کا یہ اعلان کہ ہم نے
 انسان کو بہترین تقویم سے پیدا کیا مگر یہ جانوروں سے بدتر ہو کر رہ گیا،
 محض شاعرانہ مبالغہ ہے۔ کافر و مومن و منافق میں امتیاز اللہ نے
 لغو ذبا اللہ اپنے مخصوص مفادات کے پیش نظر قائم کر رکھا ہے، دانش و
 عمل انسان کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ دینِ اسلام کچھ بندوں اور خدا
 کے درمیان پرائیویٹ معاملہ ہے، نظمِ سیاست انسان و ریاست
 ارہنی پر اس کا انطباق ضروری نہیں۔ امیرِ ریاستِ اسلام کی سخی زندگی اس
 کے امیر المومنین ہونے کے حق پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ سیاست کی

پیشہ وارانہ اجارہ داری، بندوں کی حاکمیت، اہل رائے کا شرابی ہونا اور
 عمال و ارکان شوریٰ کا عالم سکرات میں مگن رہنا اسلام کے اصول ہائے سیاست
 کی خلاف ورزی نہیں۔ مغربی جمہوریت کا سرمایہ دارانہ سیکولر نظام دین اسلام
 سے متصادم نہیں۔ گویا "رضیت لکم اسلاماً دیناً" سے مراد ہی لادینی ریاست
 تھی۔ اللہ کا تکمیل دین اور تمام نعمت کا دعویٰ درست بھی ہے تو بھی انعام
 دیتے وقت مغربی جمہوریت اور سوشلزم، بندوں کی حاکمیت اور عوام کے
 سرچشمہ لجمینا کے کچھ ریزے اور قطرے گر گئے تھے جو لب صد عجز و نیاز و احترام
 ہم نے چوم کر اپنے طباق میں رکھ لئے۔ المحکم اللہ، الملک اللہ، الارض اللہ
 کے اعلانات تو محض ہم بندوں پر رعب ڈالنے کے لئے فرما دیئے گئے تھے
 ورنہ ہمارے سوا اللہ تعالیٰ کا گزارا ہی کیسے ہو سکتا ہے۔ ہماری حاکمیت قائم
 نہ ہو تو اللہ کی حاکمیت کیوں کر قائم کی جا سکتی ہے۔ یہ تمام اختیارات دراصل
 بندوں کو ہی دینا مقصود تھے۔ اظہار قصد اس لئے نہ کیا کہ بندے مارے خوشی
 کے بھنگڑا ڈالنے نہ لگ جائیں۔ لیس الانسان الاماسعی اور قل العفو محض
 پیار و محبت بھرے کناٹے ہیں جیسے مائیں بچوں کو ڈراتی ہیں کہ ہوم ورک
 نہ کیا تو کھانا نہیں ملے گا اور بوڑھی ہو جائیں تو یہ تمنا کرتی ہیں کہ باروزگار
 بیٹا صرف جیب خرچ پس انداز رکھے اور باقی تمام تر تنخواہ ان کی ہتھیلی پر رکھ
 دے۔ تم از قنہم ینفقون والی بات صرف ان اشیا کی فہرست کی طرف
 اشارہ ہے جو گھر والیاں مٹھی میں چھپائے ہر یکم تاریخ کو خاوندوں کی
 رجعت کا انتظار کر رہی ہوتی ہیں۔ التقا، قیام صلوات، ایتائے زکوٰۃ،
 روزِ حشر اور حیاتِ اخروی پر ایمان محض زیب داستان کی باتیں
 ہیں۔ انسان دنیا میں از خود صرف پک نیک منانے کے لئے آیا ہے۔

مجسم با بر یہ عیش کوشش ہے جسے زندگی میں صرف یہی ایک کام سہرا انجام
 دینا ہے کہ ہمایوں کی بیماری میں نے لے لی ، کہ ہمایوں ایسے انسانِ اکبر
 کی پیدائش کا باعث ہو جو جلّ جلالہ ہونے کا اعلان کرے۔ جو دھا بانی
 کو حرم سرا میں بسالے ، دین الہی ایجاد کرے ، ابو الفضل و فیضی کی
 پرورش کر کے آئین اکبری کا نفاذ کرے اور دنیا کو انارکلی و نور جہاں کا
 رسیا جہانگیر عطا کر کے سیکولرازم زندہ باد کہتا افرنگ کو تجارتی مراعات دے کہ
 چلتا بنے اور ابا بعد سیاسی حصول اقتدار کے لئے بھائیوں کے قتل اور باپ
 ننگ کی آنکھیں نکلوانے کا رواج اتنا عام ہو کہ لوگ مجدد الف ثانی کی بجائے
 میکا دلی اور میکالے کو دانشور تسلیم کر لیں۔ پردہ تہذیب میں غارت گری ،
 آدم کشی رسم زمانہ بن جائے۔ نیشنلزم اور نیچرلزم کے اختلاط سے کاذب پیغمبر
 ننگ پیدا ہونے کا سامان ہو چکا ہو۔ پس پردہ نوائے قیصری پر رقصاں اصلاً
 دیو استبداد سیاست دانوں کا روپ بھرے پیش پردہ اپنے کرتب دکھانے
 لگیں تو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تلوار نہ بھی اٹھے تو بھی فکری جہاد کے لئے
 قانون کو حرکت میں آنا ہی پڑتا ہے۔ ہر چند کہ مارشل لاء کے مقاصد بھی مارشل
 ہی ہوتے ہیں ، ہنگامی قوانین و انصاف کی بے دریغ شیلنگ اس کا خاصہ
 ہوتا ہے۔ مگر تہذیب مغرب کے ناسور کے علاج کے لئے جو نشتر درکار
 ہیں وہ ان بازاروں میں نہیں ملتے جن میں فقط ابن الوقتوں نے اپنے
 شوکیسوں میں باتیں سنانے والی مینا اور قسمت کا حال بتانے والے
 طوطے سجا کر پس پردہ سیاست کاری کے دفتر کھول رکھے ہوں۔ یہ
 کارگہ فطرت میں نمایاں طور پر سجے ہوتے ہیں مگر صرف دل کی آنکھوں
 کو نظر آتے ہیں۔ دل کی آنکھوں کا عمل یوں مختلف ہوتا ہے کہ تیز روشنی

میں کھلتی اور اندھیروں میں چند دھیا جاتی ہیں۔ اسلام کے ضابطہ حیات اور پیغمبر اسلام کے پیغام کے منفرد ہونے کا اس سے بڑھ کر ثبوت کیا ہوگا کہ ہاتھ منہ دھونے سے لے کر طرز حکومت، سیاست، تعلیم و تربیت، معاشرت، معیشت تک کے ضوابط و اصول اس حد تک منفرد اور انسان ساختہ و پرداختہ طریقوں سے یوں مختلف ہیں کہ ہر حرکت و عمل میں مسلمان کی پہچان ہے۔ مگر ابن الوقتوں کی مصلحتوں اور حق و باطل کی آمیزش نے اس انفرادیت کو تباہ و برباد کر دیا۔ مسلمان اپنی پہچان ہی نہیں گنوا بیٹھا، اسلام کو نقش آلود کر چکا ہے۔ محمد رسول اللہ کے مکتبہ فکر کے تربیت کئے ہوئے فرد و معاشرہ اور روسو، ہیکل، مارکس، ارسطو، افلاطون اور سقراط کے پرورتنے ہوئے معاشرہ میں اتنا ہی فرق ہے جتنا اللہ کے تخلیق کردہ انسانی بچہ اور جاپان کی بولتی ہوئی گڑیا میں ہے۔ ان مفکرین نے انسان کو مشین بنا دیا ہے اور مشین کی کوئی اخلاقی قدر نہیں ہوتی، کوئی معاشرتی فکر نہیں ہوتی۔ احساس سے عاری انسانی اذہان کا ابطال اگر انسانی قلوب کو مسخ کرے تو وہی کچھ ہوا کرتا ہے جو دنیا میں آج کل ہو رہا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے سیاست دان حق و باطل، اصلیت و مہنوعیت حقائق و منظرات میں امتیاز کئے بغیر حرص اقتدار میں اپنی فکر کو اقتداری رقابت کے پیچ و خم میں الجھا بیٹھے ہیں اور اشرف المخلوقات محض اپنے گرد جالابنتی ہوئی مکڑی بن کر رہ گیا ہے جو کتاب اختلاف کو مٹانے، سچائی کے اقتدار اور باطل کے زھوق کے لئے نازل ہوئی۔ اسی کے واسطے سے دانش خداوندی پر عقل انسان کو ترجیح دے کر ہر مسلمان چلتا پھرتا تنازعہ بن گیا ہے۔ جہاں عقل فانی دانش لافانی پر حاوی کی جا رہی ہو، کامل کو ناقص کی گرفت میں دیا جا رہا ہو، اصولوں کو جزئیات کے نار و الجھتے داب دیا گیا ہو، وہاں آئینی و دستور

معاملات کی لطافتوں اور دانش کل کے منظر ات کو اجاگر کرنا نگاہِ مرد مومن اور فکر و فراست و عمل و عزمِ مسلمان کا متقاضی ہے۔ ضابطہ اسلام اور احکامِ الہی کو من و عن و بے چون و چرانا فذند کرنا اور ان میں دیگر مکتبہ ہائے فکر و عمل کی آمیزش کرنا ایسا ہی ہے جیسے دن کی روشنی میں بچے آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ”اندھی اندھے“ کے کھیل میں مصروف ہوں۔ آئین اسلام کے عدم نفاذ کی وجہ سے دانش خداوندی سے فیضیاب کرنے کی بجائے لوگوں نے اپنی دانش فروخت کرنے کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ اجتہاد کی مخلصانہ کاوش بھی الحادی فکر کے نرغے میں آجانے کے خطرے سے ہمہ وقت دوچار رہتی ہے۔

شرع پیغمبرؐ کی شرح اس انداز سے کی جاتی ہے جیسے چاندنی رات میں چمکا ڈریں تلاشِ رزق میں سرگرداں ہوں۔ اصل مسئلہ عقل کا زنگ اتارنے کا نہیں، نورِ عشق سے دلوں کے اندھیرے دور کرنے کا ہے جو آئین و قوانین اسلام کے من و عن نفاذ کے بغیر ہرگز ممکن نہیں۔ ہے کوئی مردِ خدا جو اپنے خدا کی قدرت پر بھروسہ کر کے یہ جرأت مندانہ اقدام بھی کر سکے۔ محبوبس قلعہ اسلام کے ہر گوشہ سے یہ آواز آرہی ہے کہ ہ کیا نہیں کوئی غزنوی کارگر حیات میں۔ بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سو منات۔ کوئی ہے جو اثبات میں جواب دے سکے۔



فیصلہ تیرا، تیرے ہاتھوں میں ہے

تمام ایسے افراد کی طرف سے جنہیں پاکستان عزیز ہے۔ تمام ایسے افراد سے جو ”عزیز پاکستان“ ہیں یا بننے کی فکر میں ہیں، گزارش ہے کہ اپنی زینحائے سیاست کی خو بدلیں۔ اسے سمجھائیں کہ دامن یوسف پھاڑنے سے باز رہے۔ تمام دروازے بند کر کے مہتمم تنہائیوں میں یوسفانِ وطن کی عفتِ دانش کو نہ بہکائے۔ ایسے مکر نہ دکھائے کہ فطرت کو ”اُن کا مکرِ عظیم مکر ہے“ کا اعلان کرنا پڑے۔ اس تجیر کو نہ پھیلانے جس کے زیر اثر دیدارِ یوسف پر انگلیاں کٹ جائیں۔ حیرت ہے کہ عزیزانِ سیاست و حکومت روزانہ عملی مظاہرہ دیکھتے ہیں کہ دُہلی گائیں فریبہ گاؤں پر جھپٹ رہی ہیں مگر تعبیر نہ جانتے ہیں، نہ جانتے کے خواہاں ہیں۔ جو بات حضرت سلیمان کے زمانہ میں چیونٹیوں کو معلوم ہو گئی تھی، آج کے انسان اس سے کیوں بے خبر ہیں۔

قارون کے ادنٹ مسلمان ممالک میں بے نیکیل پھر رہے ہیں۔ فرعون نے نیل

پر پل باندھ لئے ہیں۔ جدھر دیکھو خلق خدا ہلاک جادوئے سامری اور قتلِ شیوہ
 آزری ہے۔ مگر مسلمان فروعی مسائل میں الجھے، تمام خطرات سے بے خبر
 باہم دست دگریباں ہیں۔ افغانستان کی پاکستانی فضائی حدود میں مداخلت
 صرف قابلِ نفریں ہی نہیں، حمیت سے کچھ تقاضے بھی کرتی ہے۔ جو شاید
 سپر مصلحتوں کو ناپسند ہوں۔ یا تو ہمارے جسم و جان سے ہماری بد اعمالیوں
 نے وہ روغن بھی چاٹ لیا ہے جو انسانی صنمیروں کو روشن رکھتا ہے یا یہ
 ہماری کسی کم فہم سیاست یا انتہائی مجبوری میں کئے گئے کسی عمل کا رد عمل
 ہے۔ یہ کارروائی ظاہر ہے افغانستان کی نہیں، روس کی ہے۔ یہ امریکہ
 نوازی کی سزا ہو یا فقط انتباہ ہو، فکرِ سنگین کے سنگین نتائج کی پرچھائیں
 ہو یا کسی بدخواہ کی آسیب زدہ فکر کی آئیٹوی جھلک ہو۔ بین الاقوامی
 بطنِ سیاست میں نت اٹھتے ہوئے دردِ زہ نے پہلو بدلا ہو، مدتوں سے
 خوابیدہ ہماری غروسِ آزادی کے کسی دیرینہ رقیب نے اپنی قربتِ وجود جانے
 کے لئے کوئی کنکر پھینکا ہو۔ یہ شرِ خلق ہو یا فسادِ خلق ہو۔ ہر محبِ وطن کے
 لئے ہی نہیں، ہر بے فکرے کے لئے بھی لمحہ فکر یہ ہے۔ فضائی حدود کی یہ خلاف
 ورزی آناً فاناً یا سہواً نہیں ہے۔ یہ عمدہ ہے، صریحاً ہے اور اس لئے ہوئی
 ہے اور کئی دفعہ ہو چکی ہے کہ روس ہماری فکری سرحدوں میں کبھی کا داخل ہو
 چکا ہے۔ اور اس کی آسائش و رہائش و ستائش کے لئے ہم دن رات بڑے
 منذب، طرح دار و بامروت میزبان بنے ہر وہ سامان مہیا کر رہے ہیں جو
 روس کے فکری استقلال کے لئے ضروری ہے۔ طبقاتی نفرتیں۔ محاذ آرائیاں
 لسانی رقابتیں، قلبی طور پر بے سکون ذہنی طور پر غیر مطمئن و غیر محفوظ بے سُر
 لوگ۔ غربت و امارت میں کسی بھی اعتدال سے بے نیاز بڑھتے ہوئے فاصلے۔

وفاق پاکستان کی نسلی ولسانی بنیادی پر غیر معتدل تقسیم۔ کھسک پھسک کر ترقی
 ہوئی سیاست اور نشانے باندھتی ہوئی حکومت۔ مذہبی تفرقات کی بے
 راہ رومی۔ دین کے اصولوں سے ناشناسائی اور عمداً گریز۔ منافقانہ تاویلات
 مسجدوں میں موسوی عصائیں۔ عیسوی تسبیحیں اور منذروں کے بولتے
 ہوئے آونیراں بت اور ان کی سرکاری پرورش۔ عقائد کی آفاقیت و
 انفرادیت سے مایوسی و قنوطیت۔ انسانی فطری اہلیتوں کی تذلیل۔ نااہلوں
 پر ان گنت نوازشات۔ معیار تحریم و تکریم اور اخلاقی اقدار میں معیاری تضاد۔
 اہل کاروں کا منہ دکھائی کے لئے بھی رشوت طلب کرنا۔ انتظامیہ کے ڈسپنڈ
 اداروں کا بے لگام ہو جانا۔ ہر پولیس ملازم کے ذہن میں زار روس کا مندر
 ہونا۔ دفاتری ذہنوں میں میکا ولی مطالعہ کا ہوں کا قائم ہو جانا۔ ہر فرد کے
 پیٹ میں مارکس کی انتڑیوں کا گر گر گرانے لگنا۔ اور زمام کار سیاست سنبھالے
 ہوئے افراد کا اس حقیقت سے بے خبر ہو جانا کہ لا الہ الا اللہ کے متوالے
 اگر اللہ سے مایوس ہو جائیں یا کوئی الہ انہیں قنوطیت کا شکار بنا دے
 تو انہیں کمیونسٹ ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ چاہے انتخابات اس
 خدشہ کی بنا پر کہ سیکولر روس نواز برسر اقتدار نہ آجائیں، کتنے بھی عرصہ کے لئے
 ملتوی نہ رکھے جائیں۔ اگر دل یہ تسلیم کرتا رہے کہ کوئی الہ نہیں ہے ماسوا
 اس ایک الہ کے جسے اللہ کہتے ہیں تو انسان مومن ہے اور اگر بات یہیں
 پر رک جائے کہ کوئی بھی الہ نہیں ہے تو انسان کمیونسٹ ہو جاتا ہے۔ انسان
 پر اپنی فکری الہیت مسلط کرنے کے لئے جب منافقانہ طور پر یہ یقین دلایا
 جائے کہ ہر انسان بذات خود الہ ہے تو کمیونزم استوار ہو جاتی ہے۔ یہی
 وہ مقام ہے جہاں سے مسلمان اور کمیونسٹ کی فکری راہیں جدا جدا ہو جاتی

ہیں۔ کسی کا بھی یہ فکر برپا کرنا کہ اللہ کے سوا میں بھی تمہارا راہ نما ہوں ، مسلمانوں کو کمیونسٹ بنانے کی مذموم سازش ہے۔ وہ عمداً ہو رہی ہو یا سہواً۔۔۔ اللہ کی ذات سے ، اس کے احکام و اصول و ضوابط حیات و معروف و نہی میں سے کسی ایک کی افادیت سے مایوس و منکر ہو جانا کسی بھی مسلمان کو کمیونسٹ بنا دینے کے لئے کافی ہے ، فکری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ انسان اگر صرف اللہ ہی کے رازق ہونے سے مایوس ہو جائے اور حکومت اگر وسائل ملک کی تقسیم کا اللہ کے احکامات کے مطابق انتظام نہ کرے تو کمیونزم کے لئے راہیں سہوار ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنی ذات سے ”کمیون“ کر رہا ہو تو کمیونسٹ ہے۔ اور اپنے خالق سے ”کمیون“ کر رہا ہو تو کمیونسٹ ہے۔ خلقت کا خالق سے مایوس ہو جانا ، اس کا سوشلسٹ اور منکر ہو جانا اس کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے۔ کمیونسٹوں کی کئی اقسام ہیں۔ بت پرست ذات پات نواز برہمن زدہ ، سرمایہ دار پاپائیت کی مخالفت سے پیدا شدہ شاہ نواز جمہوریت پرست ، زمینی وسائل پر قابض قوی افراد کا گروہ ، عوام کو طاقت کا سرچشمہ قرار دے کر اپنی حکومت قائم کئے ہوئے عیار و پرکار سرمایہ دار ، یہ سب مختلف اقسام کے کمیونسٹ ہیں۔ وہ معاشرہ جہاں انسان دوسرے انسانوں کے وسائل کی زیادتی کی وجہ سے ان کا تابع ہو کر رہ جائے ، کسی نہ کسی طرح کا کمیونسٹ معاشرہ ہے۔ کمیونزم کسی اقتصادی نظام کا نہیں ، خالق و مخلوق کے رابطہ و رشتہ کے ٹوٹ جانے کا دوسرا نام ہے۔ افکارِ عقل کا منبع اگر انسانی ذہن بن جائے ، جو بنیادی طور پر پیٹ کا تابع فرمان ہے اور اس کے اشاروں پر ہاتھ پاؤں ہلاتا اور حواسِ خمسہ کو بیدار رکھتا ہے تو انسان کا ذہنی طور پر کمیونسٹ

ہو جانا لازم ہے۔ بظاہر چاہے وہ کسی بھی پیغمبر کا امتی ہو۔ ادیان اور
 کمیونزم کی جنگ قلب و ذہن کی برتری کی جنگ ہے۔ انسانی عقل اگر تابع
 قلب ہے اور ذہنی قوی کو تسخیر کئے ہوئے ہے تو انسان مومن ہے۔ ہر
 انسان کے اندر ایک اور مکمل و برتر انسان ہے جسے عبد کہتے ہیں۔ وہ
 خوابیدہ رہے تو انسان کیولسٹ ہے اور بیدار رہے تو مومن۔ وہ راز جو
 ختم اللہ علی قلوبہم میں پنہاں ہے۔ وہ موجود لوں پر لگ جاتی ہے۔ کون
 اُسے توڑتا ہے، کس طرح کھلتی ہے۔ انسان جان جلے تو دارا و جم اس کے
 گدا اور نہ جانے تو محتاجِ ملوک تو کیا حاجاتِ ذات کا بھی محتاجِ قطعی بن
 کر رہ جاتا ہے۔ ایسے انسان کو "مارکسی انسان" کہتے ہیں۔ خالق سے بے گانگی
 اور حاجاتِ انسانی سے یکتائی انسانی خود نمائی کا منع ہے۔ یہی وہ بیل ہے
 جو منڈھے چڑھے تو سوشلزم کے پھول لگاتی اور کمیونزم کے پھل دیتی ہے۔ اگر
 یہ سب صحیح ہے تو ہمارا آج کا معاشرہ روس نواز ہے۔ روس ہماری فکری
 سرحدوں کی خلاف ورزی ہی نہیں کر چکا، ان پر قابض بھی ہو چکا ہے۔ اس
 کی ذمہ دار کون سی سیاست ہے۔ اس کا فیصلہ لوگ خود کریں، یا وہ بین الاقوامی
 دانش کرے، جس نے اپنے لئے تیل کی حفاظت کرتے کرتے ہماری چربی
 کا آخری ذرہ تک جلا کر رکھ دیا ہے۔ اور ہم بے فکر و بے حس ڈھانچے بن
 کر رہ گئے ہیں۔ دنیا میں دو ہی نظامِ حیات ہیں۔ خدا کے پیغمبرِ آخر الزمان
 کا لایا ہوا اسلامی نظامِ خلافت، یا انسان ساختہ نظامِ حکومت۔ اللہ کی
 حاکمیت کا نظام یا بندوں کی حاکمیت کا نظام۔ انسانی حاکمیت کی کوئی بھی
 شکل ہو، اس کی اصل کمیونزم ہی ہے۔ امریکہ مغربی یورپ یا اس کے
 حواری ممالک کا کمیونزم کو روکنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی خود اپنے آپ

کو روک رہا ہو ایک ہاتھ سے دوسرے کو پکڑا، اور ایک ٹانگ سے
 دوسری ٹانگ کو ٹھکرا رہا ہو۔ یہ دائیں بازو اور بائیں بازو والے مختلف
 اجسام کے نہیں، ایک ہی جسم کے دو بازو ہیں۔ ان کی آپس میں رتہ کشتی
 زور آزمائی، ایک ہی اصل کے باہمی تنازعے ہیں جیسے سونگھنے کے لئے
 دو نتھنے، سننے کے لئے دو کان، دیکھنے کے لئے دو آنکھیں، کام کے لئے
 دو ہاتھ، چلنے کے لئے دو پاؤں ہیں۔ مگر پس پردہ نظام ایک ہی ہے۔ یہ
 اعضا دائیں بائیں کھلتے ہیں مگر ذہن ایک ہی ہے۔ اسی طرح انسانوں
 کے قائم کئے ہوئے نظام ہائے حکومت کی اصل ایک ہی ہے۔ کیونکہ
 کیپٹلزم کی دوسری شکل ہے، اسی کا متبادل فارمولا ہے۔ ایک انسان
 کی حاکمیت، انسانوں کی حاکمیت، انفرادی ملکیت، اشتراکی و اجتماعی ملکیت
 کے نظام ایک ہی بنیادی فکر کے مختلف منظر ہیں۔ حکمرانوں اور ان کے
 مفکروں کی ساحری انسانوں پر اصل راز نہیں کھلنے دیتی اور جس ہستی نے
 اس راز سے پردہ اٹھایا، اُسے محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ **الحکم اللہ، الملک اللہ،**
الارض اللہ، اسی کا رازق ہونا، عزت و ذلت دینے والا ہونا، خالق و
ناظم کائنات و مالک یوم الدین ہونا، انسان کا صرف خلیفہ ہونا، طاقت
کا سرچشمہ نہ ہونا، انسانی معاشرہ کا صرف عبد و "نستعین" ہونا، پیغمبر
کا بھی خالق کی حاکمیت و عیدیت میں رہنا، سربراہ نظام حکومت کا بھی
راضی بہ رضا رہنا، انسانوں کے خلق کردہ ضابطہ حیات سے قطعی مختلف
ضابطہ حیات ہے۔ اس کے قیام کے لئے سیاست پاکستان نے آج تک کیا
کیا۔ صرف یہی کہ گرسی نشینوں کے لباس بدلتے رہے۔ نہ بندوں کے حقوق
دیئے، نہ اللہ کے حقوق پورے کئے۔ مختلف انسانی مکتبہ ہائے

فکر کی رکھ سروس میں ڈالے تخلیق سے عاری افکار اپنی آئینی دساتیر میں سموٹے رہے۔ اللہ کو طاقت کا سرچشمہ تسلیم کرنا تو گنجا، بندوں کی طاقت کے سرچشمے بھی ہم نے موند دیئے۔ حتیٰ کہ سرزمینِ حاکمیت خدا داد فکری طور پر بانجھ کر کے رکھ دی۔ جو معاشرہ یہ سب کچھ کر ڈالے اس کی سرحدیں دایاں محفوظ کرے گا تو بایاں غیر محفوظ کر دے گا۔ بایاں ضمانتِ حفاظت دے گا تو دایاں باعثِ شر ہوگا۔ پوری اسلامی دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور جب تک انسان اس ذہنی فکری مکروریا سے آگاہی حاصل نہیں کریں گے جس کی نشان دہی پیغمبرِ آخر الزمان^۳ نے کی تھی، زمینی، فضائی، فکری، اعتقادی سرحدوں کی خلاف ورزی ہوتی رہے گی۔ مسلمان انسانی حاکمیت اور سرمایہ داروں کی اس جنگِ زرگری میں غیر آزاد آزادی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکیں گے۔ تا سلف یہ ہے کہ فطرت نے موجودہ انسانی مادی طاقت کے بنیادی وسائل مسلمان ملکوں کو اس بہتات سے عطا کر رکھے ہیں کہ تمام دنیا پر ان کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے۔ مگر فکرِ محمد^۴ سے بے وفائی نے غیروں کی مرہونیت کو ہمارا مقدم بنا کر رکھ دیا ہے۔ ہم سیاسی انتظامی طور پر اس قدر ناتواں سمجھے جا رہے ہیں کہ لوگ سرحد پار بیٹھے ہمارے غیر سیاسی بلدیاتی انتخابات کو بھی مشکل بنا دینے میں معروف ہیں۔ گویا چیلنج دیا جا رہا ہے کہ قلب و ذہن کی تطہیر تو گنجا، ہم تمہاری کلیوں کی نالیوں کو بھی صاف نہیں ہونے دیں گے۔ تمہیں اس غیر سیاسی بلدیاتی انتخاب میں بھی ووٹ لینا ہے تو گھر کے دروازے پر جا کر آہستہ سے کمو، ووٹ کا طالب ہوں اور پیاسا ہوں، ٹھنڈے پانی کا گلاس مل سکے گا۔ کہاں ہم اور کہاں وہ غلامانِ محمد مصطفیٰ^۴، جو خلیفہ ہو کر بھی کھجور کے سائے تلے آرام کیا کرتے تھے، مگر یورپ کے کلیساؤں اور افریقہ کے صحراؤں

میں بہ بانگِ دہل کہتے تھے، اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں، ہم بھی نہیں، اور محمدؐ
 اللہ کے رسول ہیں۔ مانو! یا آؤ! تیغ بھی آزمائیں اور سینے بھی۔



سلسلہ روز و شب، نقشِ گہر حادثات

ہمارے معاشرے اور ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ہمارے فکر و عمل کا فطری حاصل ہے اس لئے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سازش کرنے والے کے خلاف سازش نہ ہو۔ جبر و استبداد روار کھنے والے ورغلانے نہ جائیں۔ پست ذہنی ہر قدر مثبت کو زیر زمین تشدد اور خناس کے سپرد نہ کر دے، نارو اپابندیاں غیر فہم زبان نہ بولنے لگیں۔ مگر وہ بے دست و پا تعمیری صلاحیتوں کو شل نہ کر دیں، مار آستین پالے ہوں اور وہ خود پالنے والے کو نہ ڈسیں۔ دانشِ دلیل کو گستاخی قرار دینے والے بالآخر سرپیٹ کر نہ رہ جائیں۔ بزور نخوت اور بہ نوک شمشیر لوگوں کے اذہان میں ٹھونسنا ہوا احساس کم تری تیشہ فریاد نہ سنبھال لے! احتیاطِ فرعون کے باوجود موسیٰ پرورش نہ پا جائے۔ ایوانِ شاہی سے اعلانِ آبدِ جلالہ بلند ہو اور کوئی مجدد الف ثانی اللہ اکبر نہ پکارے۔ قیامِ مملکتِ خدا داد کے مخالف سیاستِ مملکت کے ناخدا بن بیٹھیں اور سالمیت ملک سلامت رہے۔ سکوں کے فرش پر مصیٰے دراز کر کے امامتِ صلوة ہونے لگے اور قلوب پر مہریں نہ لگیں۔ مقتدیوں کو فی سبیل اللہ فساد پر لگا دیا جائے اور خانہ ہائے خدا متنازعہ نہ ہوں۔ خطیبانِ ملت اپنے سینوں کے اندر سرکاری ٹیپ نصب کروالیں اور سرکارِ ظلِ الہی

ہونے کی دعویٰ دار نہ ہو۔ انسان سایہ خدائے ذوالجلال ہونے کا دعویٰ کرنے لگے اور اپنے ہی سائے سے خائف نہ ہو۔ انسان انسانوں سے اقتدار کے طالب ہوں اور حادثاتِ سیاست نہ ہوں۔ طاقت کا سرچشمہ عوام بن جائیں اور فریبِ سیاست کے چشمے پھوٹ نہ نکلیں۔ سودی نظامِ معیشت رائج ہو اور جسبہِ اقتدار پر اشک ہائے افلاس سے وضو نہ کرنے لگے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ حصولِ اقتدار پر بغلیں بجانے والے، بغل بچوں کی پُرکار خوشامدوں سے محفوظ رہیں۔ غلط کاریوں کے لئے دلیل سازوں کے متلاشی افراد کے نورتوں کی ڈائریوں سے اقتدارِ شبِ وصال کے مکروہ احوال برآمد نہ ہوں۔ مسلسل منفی سیاست، منافقت، بے وفائی اور خوفِ خدا سے عاری شریپندی کا بالآخر ڈوب مرنے کو جی نہ چاہنے لگے۔ ہو ہی نہیں سکتا کہ غدارانِ وطن اپنی تنہائیوں سے اپنی موت کی بھیک نہ مانگیں۔ اگر دلوں سے میں عشقِ خدا و رسول کے منافقانہ دعویٰ ہوں، اسلام کو فرضی نیکر لزم کے ڈھانچے میں یوں ڈھالا جائے جیسے اس کا منکر خود ہی خدا ہو، "و منکم" کو غیر ضروری قرار دے کر ہر اولی الامر کی اطاعت فرض قرار دے دی جائے، اللہ اور رسول کے متعین کردہ اصولوں سے انحراف کر کے تناعات و اختلاف رائے کے حل تجویز کئے جائیں، اعتقادِ مسخ کر کے عقلی مفاہمت تلاش کی جائے، انسان کو آفاق میں گم ہو جانے پر مجبور کر دیا جائے، حاکم کی تصویر کے روبرو بھی دانشوری لس لس کرنے لگے، پیشانیِ شاہ پر بل آتے ہی انبوہِ مشاورت لرز اٹھے، قوم اپنے منکر کی نفی کرنے لگے، وفات کے وجود کو وحدتِ فکر کی بجائے حرص و آرزو کے حوالے کر دیا جائے، نظریہ بین الاقوامی الحاد کے دربار میں بطور نذر پیش کیا جانے لگے تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سیراب کنوئیں سرابوں کی خاصیت نہ اپنالیں، دریا

فرعون کو راستہ دینے اور موسیٰ کو ڈبوں کے عادی نہ ہو جائیں۔ گنبد خاموش اور صحرا ہموک نہ اٹھیں۔ انسانی فطری جبلتیں دم نہ مار جائیں اور انگیختوں کے درندے اپنی غاروں میں دہاڑتے نہ لگ جائیں۔۔۔۔ ہم وطنو! انسان لا الہ سے الہ برآمد کرنے لگ جائیں تو کوئی صلاحیت بھی طیب بھی نہیں رہا کرتی۔ اور تشدد کو مغلوب کر دینے کے داعیان کے چھاتے تلے بھی متشدد حرکات لہک جایا کرتی ہیں کہ کوئی سپر تندر غالب ہو تو لاؤ۔ لہذا سندھ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس امر کی دلیل ہے کہ کارِ انسانی کے نتائج بہر حال حصول فطرت کے مطابق ہی برآمد ہوتے ہیں کہ فطرت جھوٹوں سے بھی جھوٹ نہیں بولا کرتی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے تشویشناک ہے، افسوس ناک! ایسا سی اور آئینی سطح پر نظر یہ پاکستان کی مسلسل نفی کی دین ضرور ہے۔ یہ قومی املاک سندھی نہیں ہندو بنیا جلا رہا ہے۔ تبیح بدست ہے یا زنا رپوش، ہے ہندو بنیا ہی۔ ہندو کے ذہنی مفروضوں کے ان چولہوں کی آگ سلگ اٹھی ہے جنہیں راجستھانی پنکھوں سے سوادی جاتی رہی ہے۔ ^{عظم} قائد اعظم کے واضح اعلانات کے باوجود ہندو مشرقی پاکستانی ہو یا سندھی، اس کا بھگوان بہر طور بھارتی ہی رہتا ہے۔ یہ دھول پیروں کی اڑانی ہوئی ہے جہاں ہم اپنی آنکھوں میں جھونک رہے ہیں۔۔۔۔ ہمارا رانی جائزہ لے رہی ہے کہ اندر سبھا جمے گی تو کون کون ناچے گا۔ پنڈتوں کی پرکار سیاست مؤذنون کو اشارے کر رہی ہے کہ مندروں کی گھنٹیاں بجاؤ، ان زندہ بتوں سے کیا ملے گا جن کے ایما پر صفوں کے درمیان بھیک کا جموہ بازار لگتا ہے۔ عید کے روز بھی عزتِ نفس کو الوداع کہہ کر انسانی توقیر کو یتیم پرور کفنوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ ہماری محرابوں میں سبھی سونے کی پاربتیوں اور چاندی کی مہادیویوں کے سامنے جھک جاؤ، مالا مال ہو جاؤ گے۔

فضلِ ربی کی ہی تلاش ہے تو لکشمی نواسوں میں آلبسو۔ اُن نواسوں کا ذکر نہ

کرو۔ جنہیں لبِ فرات بھی پیاسا رکھا گیا۔ ان ہنومانوں کی داستان سنو
 جو لنگا جلا آئے اور باوجود اغوا و حراست کے سیتا کو سادترسی مشہور کر کے رام کے
 دوبارہ تخت پر براجمان ہونے کا سامان کر گئے۔ سندھ بھارتی فکری سازش کی
 گرفت میں لایا جا رہا ہے۔ جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں۔ ہمارے وہ بھائی
 جو اس مغالطے میں ہیں کہ بجالی حقوق کے لئے میدان میں آ رہے ہیں، پکڑے
 جا رہے ہیں اور جو ملک کو غلام بنا دینے کی مکر وہ سازش میں مصروف ہیں،
 نہفتہ ہیں۔ کیوں؟ دیدہ شاہین کمزور ہے یا عقابوں کے نشیمن نابینا زاغوں
 کے تصرف میں آگئے ہیں۔ سیاسی تحریکوں میں تشدد آمیز کارروائیوں پر اترنے
 والے دشمنوں کے تربیت یافتہ لوگ ہوتے ہیں، وہ جیلوں میں ہوں یا یونیورسٹیوں
 میں۔ بجا کہ تشدد و شراٹگری سرکار کی ضرورت بھی ہوتی تھی مگر وہ سرکار بھی غیر ملکی
 تھی، جعفر و صادق کی متلاشی تھی۔ آج بھی صرف غیر ملکی سیاست تشدد آزما ہے
 جسے شاید جعفر و صادق میسر ہیں۔ سیاست پاکستان نے اتنی تحریکیں نبھائیں
 مگر یہ معمولی راز بھی نہ جان پائی کہ ”آتش زنی بنام آتشیں اسلحہ“ کے مقدمے آزاد
 ممالک میں محب وطن نہیں لڑا کرتے۔ کسی صورت حال سے اظہارِ بیزاری
 کا سیاسی اظہار ہوا کرتا ہے اور اس کا ہونا فطری بھی ہے۔ انتخابات میں تاخیر
 ناگزیر تھی، ہوگی! مگر انسانوں کے بنیادی حقوق اور عدالتی اختیارات کی
 بجالی میں کون سی علالتِ طبع مانع تھی۔ وہ کیا مرض تھا جس کا یہ پرہیز
 بتایا گیا کہ ضروریاتِ زندگی گراں نہ ہوئیں تو بیوکریسی کو چھپک نکل آئے
 گی۔ ایندھن اگر اس قدر گراں نہ ہوا کہ ہرافوں کا دکانوں میں سجانے کو جی
 چاہنے لگے تو لوگ لکڑیوں کے میزائل بنالیں گے۔ رشوت لگے بغیر اگر کسی سرکاری
 ملازم نے اپنی گھڑی سے وقت بھی بتا دیا تو حکومتی زاپچہ تنزل کی خبر دینے لگے گا۔

اگر یہ صورت حال پیدا نہ کر دی جاتی کہ رعایا کے صرف فرائض اور سرکار کے صرف حقوق رہ جائیں تو شاید کسی کو ان سازشوں کے لئے مواد نہ ملتا جن کی وجہ سے پورا ملک پریشان ہے۔ تاہم سیاسی احتجاج سے ماورا جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی اور کے کارناموں کا آغاز ہے۔ ایک ہی صوبہ رہ گیا تھا جس میں کسی کے وہ ہم نہ سب آباد ہیں جن کے تسلط سے شہریوں کو معاشی اور ثقافتی طور پر اس لئے آزاد نہ کروایا جاسکا کہ سیاسی دوراندیشی کا قحط رہا۔ وہاں داؤ آسانی سے چل سکتا تھا۔۔۔۔۔ چلا لیا گیا۔ اور اب کھوکھرا پارکا زائر پوش شکست رشتہ تیسرے شیخ پر بغلیں بجا رہا ہے کہ کہ بگل بجانا بین الاقوامی طور پر ناپسندیدہ ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ سازش اس غرض سے ہے کہ باور کروا دیا جائے کہ موجودہ حکومت اپنے موجودہ بلدیاتی انتخابات کروانے کی اہل نہیں۔ اگر یہ سازش کامیاب ہو گئی تو محرکان سازش کو یقین ہے کہ سیاسی نفرت ضیاعِ رعب و بدبہ پر ختم ہوگی اور پھر یہ تشدد آمیزی جس کی زمام کار بین الاقوامی ماہر تربیت یافتہ پس پر وہ ہاتھوں میں ہے، روسی اہل کاروں کو منتقل کر دی جائے گی۔ جلوس سندھ میں ہوگا اور غوغا سرحد میں۔ سیاست دان جو طویل پابندیوں کی وجہ سے اسلوب بیان سے عاری ہو چکے ہیں، ان کے غیر تربیت یافتہ بے تربیت کارندے ازراہ خوشامد فرمائش لائیں گے کہ تان سین جی دیک چھڑیئے سیاست ٹھٹھ رہی ہے۔ یہ کہہ کر چوکی ڈلوانی جائے گی۔ ”بیجو باورے! درباری چھوڑ! کوئی نصف شب کا راگ چھیر کہ اندھیرا اور بڑھے“ ہم وطنو! خبردار کہ ہر ہندو گویا جو مدھر بین بجا رہا ہے، ماہر سپیرا ہے۔ اس کی پٹاری میں بڑی تیز زبانیں لہرانے والے سانپ ہیں۔ پنجابی کاشتکاروں کو ڈسنے والے، بیراجوں کی مراعاتی زمینوں پر ریٹکنے والے یا جوہی صنعت کاروں کے گوداموں میں چھپے ہوئے۔۔۔۔۔ غیر سندھی منصفوں اور

حاکموں کی طرف اشارہ کر کے براہِ گنجانہ جذبات پر بھنکارنے والے۔ ہنر نازک کی بیوگی، یتیمی، حراست اور بے وطنی کی چادروں پر لہراتے ہوئے انتہائی زہریلے سانپ۔ راجہ داہر کے زمانہ کے بزرگ ناگ، سستی کی خالی چار پائی کے پائیوں سے لپٹے ہوئے کیچ سپولٹے، کیچوے جو شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تحریروں کو چٹ کر رہے ہیں، جو نکیس جو شہباز قلندر کے مستوں کو چٹ گئی ہیں۔۔۔۔۔

ان پٹاری برداروں کو جب بھی کوئی داؤ ناکام ہوتا یا فہرا پٹا نظر آیا، یہ لمحہ بھر میں انسان کو شل کر دینے والا ایسا مار زمین رنگ نکالیں گے جو نئی ترکیب سے یوں نرالے ڈنگ لگا سکے کہ والس آف امریکہ بھی واہ واہ پکار اٹھے۔ غیروں کی چالاکی، اپنیوں کی بے فہم مخالفت، امریکی سیاست کی بالا خانی بے وفائی کے اظہار من الشمس ہونے تک یہ مشہور کرتی رہے گی کہ یہ مٹھی بھر لوگوں کی شرارت ہے ”جو مٹھی میں نہیں آ رہے“ اور بکھڑ بھگت ایک ٹانگ پر کھڑا منتظر ہوگا کہ کھڑے پانی میں جہاں ارتعاش ہوگا، وہیں مچھلی ہوگی۔ اور صوبہ جس میں قائد اعظم کا دار الخلافہ ہے، بابِ قاسم ہے، جہاں بابائے ملت کی پیدائش گاہ بھی ہے اور مدفن بھی، اکبر کے دین الہی کا ٹھٹھہ بن کر رہ جائے گا، جو دھا بائی کے فکری تسلط میں آجائے گا اور کسی شیخو چچا کو جنم دے دے گا جو نہ لور دین سے آگاہ ہوگا نہ اسلوبِ جہانگیری سے۔ اس صورت حال کا ذمہ دار کون کون طالبِ اقتدار ہوگا، کون سی سیاسی و عسکری رشتہ داری ہوگی، یہ اگر آج نہ سوچا گیا تو معاملہ جو افسوسناک تسلیم کیا جا چکا، تشویش ناک بھی قرار پا جائے گا۔

یہ صورت حال بھی خالی از علت و نتائج نہیں کہ سکھ یا تریوں کے تعلقات

پنجاب باسیوں سے بڑھ رہے ہیں بلکہ بڑھائے جا رہے ہیں۔ یاد دلایا جا رہا کہ امرتسر کا سنگ بنیاد میاں میرم نے رکھا تھا۔ بھاٹی دروازہ کا فقیر خاندان

اُس رنجیت سنگھ کا وزیر و مشیر رہا جس کی سماجی اور عالمگیری مسجد کے سائے آج بھی روزانہ آپس میں ملتے ہیں۔ ثقافت و تہذیب، زبان کے اشتراک کی حوالے دیئے جاتے ہیں اور یوں بُو دے چکی، لٹی ہوئی عصمتوں کی نشوونما کو کفن مہیا کئے جا رہے ہیں۔ میں نے جلتا ہوا پنجاب دیکھا ہے۔ وہ بنیا بھی دیکھا ہے جو تیل، مچس دیکر سکھی کی کرپان اور کڑا چوما کرتا تھا کہ کرپان مسلمان پر استعمال کرو، کڑا تمہارے بازو میں یوں رہے گا کہ تم بھی اتارنا چاہو تو نہ اترے گا کہ تم سے بھی زیادہ یہ کڑا ہمارا ہے۔ اپنی تمام تر امن پسندی، انسان دوستی عفو و درگزر کے باوجود میں ۱۹۴۷ء کی اس پر تشدد سیاست سے آنکھ بند نہیں کر سکتا جو سزا کے طور پر اعلانِ قیامِ پاکستان کے بعد وارد کر دی گئی۔ میں نہ ان زخموں کو فراموش کر سکتا ہوں نہ ان کا درمان مجھے آج تک ملا ہے۔ میرے اندر کے بامروت میاں میر؟ کو آج بھی دربار صاحب کا سنگ بنیاد رکھنے پر شاید اعتراض نہ ہو سگر میں کسی محلہ کی چھوٹی سی مسجد کا سنگ بنیاد کسی گوبند سنگھ سے رکھوانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ یہ مذہبی تعصب کی بات نہیں، ملی حمیت کا تقاضا ہے۔ مشرقی پنجاب مجھ سے چھینا ہوا پنجاب ہے۔ مقبوضہ کشمیر مال مسروقہ ہے۔ میرا جونا گڑھ ہندی سیاست کی طوائف نے پرکاری سے اپنے نام لکھوایا ہے۔ حیدر آباد دکن اور حیدر آباد سندھ کی تاریخی کڑیاں میری نگاہ میں ہیں۔ بنگلہ دیش میری مقتول ماں کی نصف نعش ہے۔۔۔۔۔ میرا سارا وطن وادی سندھ ہے۔ سیاسی معاہدہ دوستی و عدم جارحیت سیاسی ایوانوں کی داستانیں ہیں۔ کعبہ اور سومنات تاریخ نے کبھی گول میز مذاکرات میں مصروف نہیں دیکھے۔ میرے وطن کا ڈرہ ڈرہ اپنے خلافت سازشوں کا انتقام لے گا۔ سازش کرنے والوں سے بھی، کروانے والوں

سے بھی اور ان سے بھی جو اس کا باعث بنیں گے۔ میرے اللہ اور رسول سے
 عداوت درقابت اور مجھ سے دوستی محض بناوٹ ہے۔ میں اس ہنومان
 سے آگاہ ہوں جو اپنی دم کو آگ لگا کر لنگا جلا نے میں ماہر ہے اور اسے
 بھیدیوں سے بھی بے خبر نہیں جو لنگا ڈھانے کے عادی ہیں۔ ریچھ دم چھپائے
 جن بچوں کو پھلی ٹانگوں میں دبائے بیٹھا ہے اس کے خوشخوار بچوں کی ہلاکت
 خیزی کا مجھے مکمل اندازہ ہے۔ اور سفید ہاتھی کے اس پروپیگنڈہ سے بھی
 ناواقف نہیں کہ ”میں مرا ہوا سو لاکھ کا ہوتا ہوں۔ اس لئے مجھے ایک
 لاکھ میں خرید لو“ میرے وطن نے اس کے کھانے والے دانت بھی دیکھے ہیں۔
 یہ سفید ہاتھی میری سرزمین میں چنگھاڑ رہا ہے کہ جاؤ میں اُردو نہیں بولتا
 اور لشکر کو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ جو لشکر کو کہے میں لشکری زبان نہیں بولتا،
 وہ قابلِ گرفت ہے۔ یا ہنگامی اور عدم تحفظ کا ستایا ہوا وہ معصوم کارکن
 جو بوجہ بے آگاہی کسی چوک میں جذباتی ہو گیا اور سیل میں پہنچا دیا گیا۔ نہ معلوم
 نو ایجاد نشتر وہاں کیوں نہیں تکتے جہاں ناسور ہوتا ہے۔ نشانوں کی اس
 خطا کاری کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ کون اور کب جان پائے گا کہ سیاست کی
 بھی اناٹومی ہوتی ہے۔ حالانکہ قطعی واضح ہے کہ ملک کو عظیم نقصان پہنچا
 دینے کے ارادے بظاہر سندھی پگڑیوں میں دکھائے جا رہے ہیں مگر اصل
 منصوبے قیامِ پاکستان کے معروف مخالفوں کے تہ خانوں میں محفوظ
 کر لئے گئے ہیں۔ اور وہ کہ تفریقِ دین جن کی سیاست ہے لاکھ آمد آمد
 سیلاب ہوان کا یتیم برخواست نہیں ہوتا۔ وہ اذانیں جو کبھی افریقہ کے پتے صحرانوں
 اور یورپ کے کلیساؤں میں دی جاتی تھیں اب اذانِ استغاثہ قرار دی
 جا کر صرف بستروں میں دینے کے پروگرام کی سیاست وضع کر لی گئی ہے۔

جن کی آنکھوں میں جہانداروں کی شان نہ چھتی تھی، وہ جہانداروں کے نور چشم بن گئے ہیں۔ تاروں کی چھاؤں میں پڑھا جانے والا کلمہ صرف جنازہ کے جلوسوں کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ جنازہ گاہوں کی صفیں سیدھی کر لینے کی تلقین ہی کارِ امامت رہ گئی ہے۔ مجذوبِ فرنگی مفکرِ پاکستان کو ڈھونڈنا پھر رہا ہے کہ آ میں تجھے بتاؤں مقامِ بے کبریا کیا ہے۔ تہران کو مشرق کا جنیوا بنا کر اقوامِ عالم کی تقدیر بدلنے کا خواب دیکھنے والے عراق سے تریاق آنے کے معروف راستے ہم مسدود کر چکے ہیں اور ”تیل تیرا، پانی میرا“ کے فیصلے کی طرف ہم تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ سندھ کے منبع اور دہانہ سے نہ تو بے آگاہ ہیں، نہ ہم ناواقف ہیں۔ ہمارے ارادے واضح ہیں۔ لگاہِ سرِ مومن اندھیری رات میں سیاہ چشموں کی عادی ہو چکی ہو تو سلسلہ روز و شب تو نقشِ گر حادثات ہوتا ہی ہے۔



علاج کچھ اس کا بھی اے چارہ گران سے کہ نہیں

انسانی تاریخ ایسے دنیوی حکمرانوں کی دشنام طرازیوں سے آٹی پڑی ہے جو رعایا کو پُرسکون، مطمئن، محفوظ اور باوقار زندگی کی ضمانت دینا کرنے سے صرف اس لئے عاری رہے کہ شب و روز انہیں اپنے ہی اقتدار کے چھن جانے کا کھٹکا لگا رہا۔ رعبِ اقتدار کو عوام الناس کے اذہان پر مسلط رکھنے کی ہر کوشش کا ماہصل نفرت و کدورت کے سوا کبھی اور کچھ نہ ہوا۔ اس لئے کہ فاصلے جتنے طویل ہو جاتے ہیں، اشکال اتنی ہی دھندلا جاتی ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے انسان کو اگر وادی میں کھڑا انسان چھوٹا دکھائی دیتا ہے۔ تو وہ یہ بھی نہ بھولے کہ سطح مرتفع نے اسے بھی بونا ہی دکھانے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ خلوصِ محبت صرف اخوت و مساوات کی دین ہیں۔ رابطے قریبیں مٹا کر نہیں رکھے جاسکتے۔ فاصلے بڑے اعتماد گمشدہ ہوتے ہیں۔ انسانوں کا آداب بجالانے پر مجبور

کرنا، جبر و استبداد سے ان کی عزت نفس کو مستحضر کرنا، انسانی آبادیوں کو
 جنگوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جنگل جہاں شیر غاروں کی پستیوں میں اور
 گلہریاں درختوں کی بلندیوں پر بسیرے کرتی ہیں پست و بالا اور تہ و بالا
 کے یہ مناظر فطرت کے فیقروں کے لئے بڑے سبق آموز ہوتے ہیں۔ بادشاہوں
 کی نظر سے اوجھل رہیں تو فطرت کا گلا نہ کریں، اپنی بینائی کا ماتم ہی کافی ہوگا۔
 حکمران حکم صادر کرتے اور ران تھاپتے ہوئے لنگوٹ کس کو نہیں کہتے۔ یہ
 کوئی صالح انداز حکمرانی نہیں کہ حکمران پہلوانوں کی طرح گرز اٹھائے۔ رانے
 تھاپتا اور لٹکارتا ہی رہے۔ اس کو پچھاڑے تو اس کو دبا دے۔ اُدھر
 دھوبی پٹرا مارے تو اُدھر کلا جنگ لگائے۔ ہر رائے سے کسرت کا عادی ہو
 جائے ” خاموش رہو یا دفع ہو جاؤ “ اس کا دستور العمل بن کر رہ جائے۔ بولے
 تو لوگوں کے دل بیٹھ جائیں، نہ بولے تو لوگ کان کھڑے رکھیں کہ نہ جانے
 کب کیا ارشاد ہو جائے۔ ہمہ وقت اس کا تحکم مھنکا زنا اور حکم ڈستار ہے۔
 حکمت سے دست دپائی جاری رہے۔ فراست پناہ گیر اور دانش ہجرت آزار ہے۔
 روز و شب ڈھول بجاتے رہیں کہ مابدولت میلے میں اقتدار کی بیساکھی منارے
 ہیں۔ ابن الوقتی اطلاقِ قانون کے تیور بانجھ عورتوں کی طرح اتارتی چڑھاتی
 رہے۔ اختیار کے پھاڑے ہوئے دیدے سرخ اور عارض زرد رہیں۔ دن اپنے
 آپ کو دیکھتے گزر جائے اور راتیں سازش کے خوف سے بیدار رہیں۔ وہ
 مریض بن کر رہ جائے جو خواب میں اپنی شکل دیکھ کر دائمی خوف زدہ ہو
 گیا ہو۔ ایسے حکمران کی مثل اُس اندھے کی سی ہوتی ہے جو اپنی عینک کیلئے
 آنکھ کی بھیک مانگ رہا ہو۔ ایسے حکمران اپنے اور عوام کے مابین بالآخر
 تمام روابط ختم کر بیٹھتے ہیں۔ ہیر کھیرے لے جاتے ہیں اور رانجھے کے

پاس صرف بھینسیں رہ جاتی ہیں جو بالنسری کی تان سے نابلد فقط بین کی
 لئے پر منڈلاتی، جگالی میں مصروف رہتی ہیں۔ سانپ ہی سانپ نکل آتے
 ہیں جو رانجھے کا جوگی ہونے سے پیشتر بیڑا پار لگا دیتے ہیں۔ ایسے حکمران کی
 صرف قہاری و جبروت باقی رہ جاتی ہے، غفاری و قدوسی سے عاری ہو جاتا
 ہے۔ عفو و درگزر سے اجتناب جان پُر سوز کی جان تک نکال دیتا ہے۔
 نہ نگاہ بلند اس کا مقدر رہتی ہے، نہ سخن دلنواز اس کے لبوں کا سرمایہ رہ
 جاتا ہے۔ آخر ایک دن اقتدار اتنے زور سے دھاڑتا ہے کہ اپنے ہی نتھنے پھاڑ
 لیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ نظام کائنات میں انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت
 کے تحفظ کا کوئی سامان موجود نہیں۔ کم فہم انسان خمار اقتدار میں مصنوعی تسلیاں
 تو ایجاد کر لیتا ہے مگر اس کا ہر عمل اپنے ہی گلے میں زہریلے سانپ لٹکا دینے
 کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ دنیا اس قسم کے حکمرانوں سے آگاہ بھی ہے،
 اس قسم کی حکمرانی کا بارہا تجربہ بھی کر چکی ہے اور مشاہدہ بھی۔ خود وطن عزیز
 نے ایسے ادوار میں کیا کھویا، کیا نہ پایا۔ بڑی دلوز و اندوہناک داستان
 ہے۔ بیان کرنے سے فائدہ، کہ آئینے سامنے رونے کے لئے تو سجائے نہیں
 جاتے۔ چہرے پر جھریاں پھیلنے لگیں تو غازہ رخی سے بہتر یہ عمل ہے کہ آئینے
 پر کپڑا ڈال دیا جائے۔ کہ نالکھ کے بالا خانے اور آباد گھروں کے اطوار میں
 امتیاز روا رکھنا معاشرتی بندھنوں کی مضبوطی کے لئے اشد ضروری ہے۔ نہ معلوم
 لوگوں کو ایسی موت کیوں پسند ہے کہ کائنات طعن دے کہ قلندرو! لو جو
 بادشاہ سلامت تھے، مر گئے۔ خزانوں سے دریافت کرو مقبرہ تعمیر ہو گا یا
 نیا محل۔ ہائے! کتنے سکندر خالی ہاتھ اور ننگے پاؤں دفن ہو چکے ہیں۔ کتنے
 شہ سوار ہوں گے کہ ان کے گھوڑے ان کی میتوں پر ہننائے۔ کتنے تخت طاؤس

خالی رہ گئے۔ کتنے ہیروں نے شاہی اقبال کو گناتے دیکھا۔ کتنے تیخ زنوں
 کی رو میں عجائب گھروں میں اپنی تلواروں کی نمائش دیکھ کر اپنے خون آشام
 ادوار حکومت کا ماتم کرتی ہوں گی۔ مگر انسان کی آنکھ مقامات عبرت کی
 طرف اٹھنے سے پہلے ہی نامعلوم کیوں اندھی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ مقالات
 افلاطون پڑھ رہی ہوتی ہے۔ انسان کیوں بھول جاتا ہے کہ انسانی معاشرہ
 کے ارتقاء سے قطع نظر کر لیا جائے تو انسان اور درندے میں کوئی فرق باقی
 نہیں رہتا۔ سیاست کا یہ انداز لوگ کیوں اختیار کر لیتے ہیں کہ بھڑیے کی شہ
 لگی رہے اور بھڑیوں مارے خوف کے سر جوڑ کر مہیاتی رہیں۔ نہ معلوم ہمارے
 حکماء، دانشوروں اور سیاسی مبلغین نے امور سیاست و حکمرانی میں صرف
 اپنی آرائش گاہوں میں ہی شمعیں روشن کرنے کا وسیلہ کیوں اختیار کر رکھا
 ہے۔ انسان ہوتے ہوئے بھی انسانی معاشرہ سے اتنی گھمبیر بے اعتنائی کیوں
 روا رکھے ہوئے ہیں۔ انسانوں کے مسائل و مصائب سے قطع نظر کر کے جس
 انداز سے یہ لوگ شب و روز یا اپنے اقتدار کے گیت گاتے ہیں یا محرومی
 اقتدار کے بین الاپتے ہیں۔ اس نے پورے معاشرہ کو تعمیری سیاسی فکر دینے
 کی بجائے ایسے فکری کھرام میں مبتلا کر رکھا جیسے نقارہ مرمت طلب ہو
 اور طوطے یوں شور مچا رہے ہوں کہ کان ہی پر پڑی چوٹ بھی سنائی نہ دے۔
 اس کا بے انجام میں ہمارا معاشرہ اتنا ماہر ہو گیا ہے کہ دانشور تک سمجھاتے
 کم ہیں اور روٹھتے زیادہ ہیں۔ کوئی بسور کر صوبائی خود مختاری کا تقاضا کرتا
 ہے تو کوئی تازہ مرے باپ کی ناہنجار اولاد کی طرح ”گھربٹوارے“ کے لئے
 آمادہ فساد ہے کنفیڈریشن، کنفیڈریشن چلا کر نیت خفہ اور خبت نہفتہ
 کا اظہار بہ زبانِ افرنگ کرتا ہے۔ ہر کموں پھوٹا یہی اعلان کرتا ہے، بس

وطن ٹوٹ رہا ہے، یہ دلیس بکھر کر رہے گا۔ ہائے! وہ اولاد جس کے پاس
 ماں کو تقسیم کرنے کے علاوہ اور کوئی سامان نہ رہا ہو۔ اُف! وہ تولید، جو زندہ
 ماں کا کفن خریدنے نکل کھڑی ہو اور منتلاشتی ہو کہ سستا اور دیر پا کہاں سے
 ملے گا۔ عالمی بردہ فروشوں سے یہ کہہ کر رعایت مانگ رہی ہو کہ ماں جو مرنے
 والی ہے، ہمیں بہت عزیز ہے۔ ہم نے مقدور بھرا سے دبا یا، لتاڑا۔ بس ایک
 دفعہ اس کی کوکھ پر لات مار بیٹھے تھے اور یہ بکھرتی ہی چلی گئی۔ ہم عسرت زدہ ہیں
 کمانی کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ ہماری ماں لے لو، ہمیں اچھا سا کفن دے دو۔
 ہم اسے بے گوردیکھ سکتے ہیں، بے کفن نہیں دیکھ سکتے۔ یہ بڑی عالم فاضل ماں تھی۔
 پانچ زبانیں بول لیتی ہے۔ اس کی کوکھ جب بھی ہری ہوئی اس نے علیحدہ نسل اور قومیت
 کو ہی جنم دیا۔ رب واحد کی قسم یہ امت مسلمہ کی وفاقی ماں تھی۔ اس کی نس نس میں
 اتنی ہمدردی تھی کہ ٹانگوں کی لمبائی دیکھ کر بازوؤں کو احساس محرومی آ لیتا۔ بھائی
 بھائی ذرا ناراض ہوئے اس نے اپنا بازو ہی کاٹ کر دے دیا کہ جاؤ آباد رہو۔ ماں
 کی ایسی تقسیم تاریخ نے پہلے کہاں دیکھی ہوگی۔ جو بازو کٹنے سے رہ گیا، اس نے
 کٹے ہوئے بازو سے یہ کہہ کر صلح کر لی کہ تو میرا باقی رہنا تسلیم کر، میں تیرا کٹنا منظور
 کر لیتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں یہ ایک بازو والی ماں ہے۔ یہ طعن ہمارے ان دانشوروں
 کو گوارا نہیں جن کا موقف یہ ہے کہ ایک بازو ہی تو کٹا ہے۔ باقی جسم کے چار حصے
 تو اب بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سر بھردوں کو کوئی تو سمجھائے، ماں سے یہ سلوک ہو تو اولاد
 کا شعور و شعائر حیات مفقود ہو جایا کرتا ہے۔ ایسا سلوک کرنے والا انسان اسے
 محسوس میں اُلجھ جایا کرتا ہے کہ دین کون سا اختیار کروں، سیاست میں راہ غائی
 کہاں سے حاصل کروں، معیشت کے اندھیروں میں شمع جلانے کے لئے خالی دیئے
 کون سے مکتبہ فکر سے ادرار لوں اور ان کے لئے تیل کس کس کا نکالا جائے۔ دل

کو دماغ کے کون سے گوشے میں رکھیں۔ ایسے انسانوں کو اپنا خدا بھی انسانوں
 کا شاگرد محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسے دانشوروں کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ معاشرہ
 ہنگامی کی جگہ میں گیلی راکھ کی طرح پس رہا ہے۔ نہیں سوچتے کہ انسان کا ارزاں
 ہو جانا اشیا کے گراں ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ انسانوں کا احساسِ عدم تحفظ
 و کم تری ان کی مادی ضروریات کو بڑھاتا اور اشیا کی کمیابی و گرانی کا باعث
 بنتا ہے۔ انسان کا وقار اور عزتِ نفس اگر مادی وسائل کی دست نگر ہو جائے
 تو انسان اپنے بوسیدہ لباس سے بھی سستا ہو جاتا ہے اور غیروں کے جوتوں
 کی خاک اپنوں کے سر پر جھڑنے لگتی ہے۔ معاشرہ کا ہر انسان معصوم پیدا ہوتا ہے۔
 یہ قوانین کا استوار کیا ہوا ماحول ہے جو کتابِ تعزیرات اس کے گلے میں لٹکا
 دیتا ہے۔ اصل مجرم فرد یا معاشرہ نہیں، قانون ہے۔ سرکاری ملازم نہیں قانون
 و ضابطہ راسخی ہے۔ یہ ضابطے ہیں جو راسخی و مرتشی کونٹ نی راہیں مہیا کرتے
 ہیں۔ ناجائز منافع خور بعد میں بنا ہے ما پہلے قانون نے خود نا جائز منافع خوری
 کی بنا ڈالی۔ عداوہ رخنہ اور روزن رکھے جو بد نیتوں کے لئے دور بین کا نام دے
 سکیں۔ ہمارے قانون میں یہ تحریر ہے کہ چوری، ڈاکہ زنی مارٹہ گیری کا میں
 دستگیر ہوں۔ جو مجھ پر تدبیر کرے گا پکڑا بھی جائے تو ہر بے عزت باعزت
 بری ہو جائے گا۔ قانون کی شفتوں پر معمولی تدبیر بھی اغوا و زنا کے آسان طریقے
 سمجھا دے گا۔ یہ جو مار دھاڑ، قتل و غارت گیری، تشدد پسندی و تخریب کاری
 ہمارے معاشرتی سینے پر تمغوں کی طرح لٹک رہی ہے، ما در آمد تو نہیں کی گئی۔
 قوانین ہی کی دین ہے۔ ہمارا ضابطہ فوجداری جہاں نا فذکر دیا جائے، اپریلیزم
 استوار نہیں ہوگی۔ تو فوج کو بار بار حفاظتی حراست کا عمل دوہرانا اور نرم و گرم
 ماسٹر قوم نما مارشل لا نا فذکرنا پڑے گا۔ عیاشی و فحاشی طوائفیں اور بدکار نہیں

سکھا رہے، قوانین و رسوم و رواجات طوائفیں ڈھال رہے ہیں۔ ضابطہ
 قوانین ہی تمام تر فکری اور شعوری نوٹنکیوں کا راہ نما ہے۔ حیاداری کو قانون
 نے گستاخی سے مات دلوائی ہے۔ درس گاہوں کے ضوابط نے طالب علموں کی
 طلب علم غضب کر رکھی ہے۔ یہ لیر لاکا ہی احسان ہے کہ مزدور کام کم اور سپینے
 زیادہ دکھاتا ہے۔ صنعت کاری اور جیب تراشی متوازی فن صرف قوانین کی
 طفیل بنے ہیں۔ کیا یہ بیرونی سازش ہے کہ جس صنعت پر سرمایہ کار کی حرکت جاتی
 ہے، بیمار ہو جاتی ہے۔ سرکار کس متعدی بیماری میں مبتلا ہے کہ اس کا سرمایہ معاشرے
 کا کینسر بن کر رہ گیا ہے۔ جس قانون کا مطالعہ کرو، معلوم ہوتا ہے کسی عادی
 مجرم کی تصنیف ہے جو کو تو ال کے ہاتھ لگ گئی ہے، یہ ضابطہ ہائے قوانین کی
 نہیں، جرائم کی درسی کتابیں ہیں۔ اتنی ذہنی پستی اور اخلاقی
 گراؤٹ کیا والدین کی دعاؤں سے خود کرائی ہے۔ کیا بہتیسے
 جھولیاں پھیلائے ہوئے ہیں کہ بھائیوں کے نام بستہ الف میں
 درج ہو جائیں۔ افراد خانہ کا باہمی اعتماد کیوں کرچی کرچی ہو گیا ہے۔ معراج انسا
 کا علمبردار اسلامی معاشرہ اتنی پستیوں میں کیوں اتر گیا ہے۔ فرقہ بندی اور
 گروہ سازی کا بازار کیوں گرم ہے۔ نت نیا الحاد کیوں جنم لیتا ہے، اعتقاد ضد
 بن کر کیوں رہ گیا ہے۔ اکراہ نے ہر سو کراہتیں کیوں بکھیر رکھی ہیں۔ جرائم کے لئے
 انگلیاں تھرتی ہیں تو روکنے کے لئے دل کیوں نہیں دھڑکتے۔ پورا معاشرہ اصطبل
 کیوں بنتا جا رہا ہے۔ جس طرف لگا، اٹھاؤ شرافت کی کلیرنس لگی ہے مگر کوئی
 مفت بھی خریدتا۔ عبادت کی تجارت کیوں ہونے لگی ہے۔ خانقاہ و خانقاہ
 مدرسہ در مدرسہ، مزار بہ مزار عقیدت کیوں فروخت ہو رہی ہے۔ یہ سازشیں
 غیروں نے ہی نہیں خود ہم نے اپنے خلاف کر رکھی ہیں۔ دستوری و آئینی معاملات

کا علاج تو اسلامی تشکیل حکومت ہے مگر کچھ علاج اس کا بھی اسے چارہ گراں ہے
 کہ نہیں۔ اگر ہے تو ہوا کیوں نہیں اور اگر نہیں تو چسپانگی کا کوئی جواز ہو تو
 بتاؤ!



کھیل بچوں کا ہوا، دیدہٴ بیانا نہ ہوا

انسانی معاشرہ کا ارتقا صرف اس مقدس جذبہ پر منحصر ہے کہ فطرت نے ہر باپ کے ذہن میں یہ تمنا جذب کر رکھی ہے کہ اس کی اولاد اس سے بھی آگے بڑھ جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر باپ زندگی بھر اپنے مقدر سے بڑھ کر کوشاں رہتا ہے۔ کوئی باپ اپنی کوتاہیاں اولاد کے نام منتقل نہیں کرتا۔ ہر باپ زندگی بھر دعا گو رہتا ہے کہ اس کی اولاد بہترین اوصاف کی حامل ہو۔ اولاد کی شکایت سن کر ہر والد کو محسوس ہوتا ہے جیسے اُسے لاوا اُگتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے میں پھینک دیا گیا ہو، کسی نے دہکتی ہوئی سلاخیں اس کی آنکھوں میں گھونپ دی ہوں۔ والدین کا مقام ہی یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کے رقیب نہیں ہوتے، مخلص دل سے دعا گو رہتے ہیں کہ ان کی اولاد انسانیت کی معراج کی زندہ مثال ہو، اس کی قابلیت، شرافت، نیک روی کی تمام تر انسانی آبادی معترف و شاخواں ہو۔ ہر جننے والی اس امید کے ساتھ جنتی ہے کہ وہ انثرف المخلوقات جن رہی ہے۔ کسی ماں کے تصور کا بچہ کمتر نہیں ہوتا۔ آج اگر یہ جذبہ مفقود ہو جائے تو تمام تر انسانی ارتقا پر جمود چھا جائے۔ معاشرے کے بڑے بوڑھے جب نوجوانوں کو اپنی ہی اولاد تصور کرنے سے عاری ہو جاتے ہیں، دانشوروں کی شفقت پدروی اغراض کی اندھیری غاروں میں سازشوں، سیاستوں،

ابن الوقتوں کی خیر کاری کی نذر ہو جاتی ہے تو وطن کی سر زمین فقط ایسا یتیم خانہ بن کر رہ جاتی ہے جسے کسی یخ بستہ ضمیر "ابن ہڈ" نے فکری گداگر پرورش کرنے کے لئے تعمیر کر دیا رکھا ہو، کسی کی منفی فراست نے ایسا نسخہ ڈھونڈ نکالا ہو جس کے استعمال سے ہر کوکھ درندوں کی غار بن کر رہ جائے، ہر ذہن شر سے اور قلب شرارتوں سے اٹ جائے۔ انتہائی بد قسمتی ہے کہ حکومت ہو یا سیاست، تدریس ہو یا تہذیب، تربیت ہو یا پرورش، نظم حیات کی ہر مد میں زندگی کی ہر راہ پر، پدرانہ شفقت و احساسات کے لاشے تعفن بکھیر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں تمام باپ دفن کر دیئے ہیں۔ گھروں کے صدر دروازوں اور قبرستانوں کی تختیوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ ہر انسان نے اپنی قبر کھود رکھی ہے جسے وہ اپنا گھر کہتا ہے۔ ہمارے معاشرہ کا یہ دیرہ بن گیا ہے کہ دراندیشی کو کوتاہ بینی کے تسلط میں رکھو کہ انجام سے بے خبر عمل ہی صالح ہوتا ہے۔ ابن الوقتی نے جو ان ہو کر ابو الوقتی کا منصب سنبھال لیا ہے۔ ہر تقاضائے وقت حاجات ایام کے سبب میں مقید ہے۔ عقل تہ دام پھڑ پھڑا رہی ہے اور حاجات خود ساختہ و حالاتِ حواسِ باخۃ اذان کناں ہیں کہ آؤ اپنا حال یوں تباہ کریں کہ مستقبل ہاتھ پھیلائے، آہ آہ کرتا ہم سے یوں بغل گیر ہو جیسے صحراؤں میں مراب بغل گیر ہوتے ہیں۔ کسی طالب علم کو قید بامشقت، کورٹوں اور جہانہ کی سزا کی خبر سن کر میرے اندر کافطری باپ یوں محسوس کرتا ہے جیسے میں اپنے زمانے کا کرامویل تھا اور زمانہ میری نعش نکال کر پھانسی پر لٹکا رہا ہے۔ جیسے میں وہ ڈارون ہوں جس کے دماغ میں سانپ رینگ رہے ہوں۔ وہ فرعون ہوں جس نے بچوں کے قتل کی رسوائی سے بچنے کے لئے ماڈرن درسگاہیں کھول رکھی ہوں۔ وہ ہلا کو ہوں جو اپنی آئندہ نسل کے حصار میں قتل کیا جا رہا ہو۔ وہ چنگیز ہوں جس کی اولاد سے اس کا ماتم کروایا جا رہا ہو۔ وہ آزر ہوں جو قتل خلیل کا مجرم ہو۔ وہ یعقوب ہوں جس نے

اپنے ہاتھوں اپنے یوسف کو قتل کر کے اس کی آنکھیں اپنے نابینا دیدوں کی جگہ
 ثبت کروالی ہوں۔ وہ ماں ہوں جواز خود دربار فرعون میں حاضر آگئی ہو، کہ اسے
 خدائے زماں میں نے یہ بچہ بنا ہے۔ اس کی معصومیت تیری چرکار تلوار کی منتظر ہے۔
 وہ دسرتھ ہوں جو کیکٹی کو پٹی پڑھا رہا ہو کہ رام چندر کا بن باس ہی ہمارے اطمینان و
 سکون کا ضامن ہے۔ وہ رادن ہوں جو لو اور کُش کے سر پر مٹکار سپار کا ہاتھ پھیر نہیں
 سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو، ستیا میرے ساتھ بہ رضا و رغبت اعوا ہوئی تھی اور تم ان
 ہی ایام کی سرخیاں ہو۔ وہ آدم ہوں جو ہابیل و قابیل کو لڑنے پر اکسارہا ہو۔ وہ اکبر
 ہوں جو سلیم حشٹی کے دربار میں ملتجی ہو کہ میرا شیخو انار کلی کے حُسن کا بھکاری بنا رہے،
 اسے ولی عہد ہونے کا خیال دا احساس تک نہ ہونے پائے۔ وہ دست بدعاشا ہماں
 ہوں جس کی دلی تمنا ہو کہ اس کی اولاد برادر کُش ہو، باپ کی آنکھیں نکلو ادے او
 کسی سیوا جی کے ہاتھوں مارا جائے۔ اپنی اس جان لیوا کیفیت پر پردہ ڈالنے کے
 لئے میں اعلان کر دیتا ہوں کہ اے میرے گمراہ معاشرے، میں تیرا سیاست دان ہوں
 مجھے راہ نما تسلیم کر، ورنہ میں تیری وہ نس بندی کرونگا کہ تیری فکر زرخ اور تیرے عمل خصیم
 ہو کر رہ جائے گا۔ تیرے وہ ہونہار جن کے لئے بیچ پر کھڑا ہونا بھی انتہائے ندامت
 ہونا چاہیے۔ قید بامشقت گزارنے، کورٹے سہتے اور جرمانے ادا کرتے ہی راہ نما قرار
 دے دیئے جائیں گے۔ تیرا معاشرہ اُس علی بابا کے چوروں کا جگھٹا بن کر رہ جائے گا
 جسے سم سم کے الفاظ بھول گئے ہوں۔ تیرے درسگا ہوں میں داخلہ کے وقت خانہ ولایت
 کے اندراجات سے زندہ نظام دشمن تنظیموں کی ٹھروں کو اولیت و فوقیت حاصل
 ہو جائے گی۔ جس بے ہنر کو درسگا ہوں کے سربراہ اپنے تمام تراختیارات کے باوجود
 داخلہ نہ دے سکیں گے۔ اُسے ناپختہ ذہن کی ایک ہی بھڑک یوں داخل کروالے
 گی کہ وہ برسوں داخل ہی رہے گا، کبھی ہسپتال میں کبھی جیل میں۔ یونیورسٹی فارغ

بھی کر دے تو ہوسٹل فارغ نہیں کرے گا۔ دستور زمانہ تسلیم کرے گا کہ مادر وطن
 کی آزادی کے قرار و استحکام کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہر ہونہار کے پات چکنے رہیں
 اور آئندہ نسل بہر طور مادر پدر و استاد آزاد رہے۔ نام نہاد پختہ ذہن ناپختگی سے نہ صرف
 خائف رہیں بلکہ ہر عدم بلوغت کو نت نئے انداز مہیا کر کے اس وقت تک دم نہ لیں
 جب تک معاشرے کے ناسور رِس رِس کر خلعت کو متعفن نہ کر دیں، یہ ضمانت نہ
 مل جائے کہ آئندہ کوئی پڑھنے نہیں پائے گا۔ نابالغوں پر تعلیم حرام نہ ہو جائے اور
 بالغ تعلیم بالغاں کی ٹیلی ویژن کلاس میں داخلہ نہ لے لیں۔ انسان مرغیوں کی طرح اپنے
 بچوں کو ٹھونکنے کا انداز نہ اپنائیں، معصوم کتابوں سے لڈ نہ جائیں اور لڑکپن اور
 جوانی کتاب کو توج نہ دے۔ کتاب کا مصرف بغیر کرایہ دینے کسی بس کے ساتھ لٹک
 جانا یا چھت پر چڑھ کر تالیاں بجانا ہی نہ رہ جائے۔ پولیس تک اپنے دفاع کے لئے گارٹول
 کے شیشوں پر آہنی جالیاں لگانے اور اپنے جسم پر لکڑی اور کپڑے کے زرہ بکتر لٹکانے
 پر مجبور نہ ہو جائے۔ روزانہ جیب خرچ نہ ملنے پر بھی آبدیدہ ہو جانے والے کمسن آنسو
 گیس کے بم پھٹنے پر بھی حملہ آور اور نبرد آزما ہونے سے باز نہ رہیں۔ جن سروں پر صبح و شام
 پیار بھرے ہاتھ پھرنا چاہئیں۔ وہ ٹانگوں سے اٹ نہ جائیں۔ ان ماتھوں پر جنہیں چوم
 لینے کیلئے بوسے بے قرار ہوں، خون آلود پٹیاں نہ بندھ جائیں۔ ہم جماعت اغوا، استاد
 اغوا، سکون و اطمینان اغوا، امتحان کے پرچے اغوا، ممتحن اغوا، فہم و ہوش اغوا،
 ناموس خاندان اغوا، عفتِ وطن اغوا کا دستور رائج نہ ہو جائے۔ داخلہ کالج میں اور
 سمسٹر کی تکمیل شاہی قلعہ میں نہ ہوتے لگے۔ الذوالفقار، مکتی باہنی، ڈنڈا فورس
 کی تشکیل کی راہیں استوار نہ ہو جائیں۔ اسلام کے واسطے سے الحاد فروغ نہ پا جائے۔
 حُب رسول کے دعویٰ دار امت کی دستار گروی نہ رکھ لیں۔ سیاست کی چڑیل معصوم
 اذہان کو آسائشوں اور ستائشوں کا لالچ دے کر اچھی طرح چبانہ لے۔ سیاسی

سرچشموں سے آبشاریں پھوٹی رہیں اور طاعون سیلاب تھمنے نہ پائیں۔ اپنی ہی نسلوں
 کو معدوم کرنے والی سیاست لاکھ کالعدم ہو مگر ہر معصومیت سیاسی پرکاری کی زد
 میں اپنے گلے پر تیز دھار نشتر جھائے رکھے۔ ہر امید کے لئے صلیب اور ہر تمنا کے لئے دار
 سبھی رہے۔ یہ انداز فقط دشمنانِ وطن کو ہی زیب دیتے ہیں۔ ورنہ کون ایسا باپ ہوگا
 جو اپنی اولاد کا ناجائز اسلحہ بردار ہونا پسند کرے گا۔ جو اپنی اولاد کو لڑ مرنے کی تلقین
 کرے گا، مانگہ فساد کی راہ پر ڈالے گا، کتاب چھین کر اس کے ہاتھ میں خنجر تھما دے
 گا، استادوں کی تذلیل پر آمادہ کرے گا۔ بغاوت کی تعلیم دے گا، ہم جماعتوں کو زد و کوب
 کرنے اور جان سے مار دینے پر ابھارے گا۔ ایسے افعال میں ملوث کرے گا جو شرافت
 نفسی پر طعن ہوں۔ کون باپ یہ چاہے گا کہ اس کی امیدوں کا مرجع، اس کے بڑھاپے
 کا سہارا چاہے فیملی ہی ہوتا جائے مگر بروزِ بازو اپنی معتبری کا بھرم ضائع نہ ہونے
 دے۔ کون والد یہ سننا چاہے گا کہ نور چشم نے فساد کیا اور پکڑا گیا۔ ایم۔ اے فائل
 میں تھا، بس کنڈیکٹر سے اُلجھ پڑا۔ سیلز مین سے دست دگریاں ہوا۔ بسیں بھر کر لے گیا اور
 لٹکارتا پھنکارتا یوں سڑکوں اور بازاروں سے گزرا کہ فضا میں ”جگا“ گانے لگیں۔
 کمرے سے کبھی چرس، کبھی پینے کی ہیروئن، کبھی پلانے والی ہیروئن برآمد ہوئی۔
 کون یہ برداشت کرے گا کہ برخوردار کر اس فائزنگ میں مصروف تھا، پرس چھین کر
 لے گیا۔ کار چوری میں ملوث پایا گیا۔ اداکارہ کے گھر میں گھس گیا۔ امتحان دینے سے
 گریزاں ہی نہیں، ان کے التوا کے لئے جلوس نکالتا، توڑ پھوڑ کرتا، آتش زنی اور لوٹ
 مار تک سے گریز نہیں کرتا۔ اگر مجبوراً کمرہ امتحان میں جانا ہی پڑے تو آتشیں اسلحہ
 میز پر رکھ کر جوابات کتاب سے نقل کرتا ہے۔ ناکام ہونے کا خطرہ ہو تو امتحان کا بائیکاٹ
 کر کے چلا آتا ہے۔ بطور ملزم عدالتوں کی حاضری اس کا معمول ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے
 استاد ہیں کہ دُبکے رہتے ہیں۔ جب چاہتا ہے، کسی بھی اُستاد کا گھیراؤ کر لیتا ہے

بات بات پر چاقو نکالتا اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کوئی طالب علم اس کی خوشنودی حاصل کئے بغیر کلاس روم تو گنجا، ہوسٹل کے کمرہ میں بھی سکون سے نہیں رہ سکتا۔ اس کی مطالعہ گاہ میں قلم دوات، کاپی کتاب ہو کہ نہ ہو، مانوبہ نو اسلحہ ضرور ہوگا۔ امن دشمن عناصر اور سازش پرست سیاست کے حسبِ منشا استعمال کی چیز بن کر رہ گیا ہے، چار سال کا کورس سات سال میں اور دو سال کا پانچ سال میں نہ مکمل کر پاتا ہے، نہ مکمل کرنے دیتا ہے۔ خون کا حساب مانگتا، تخریبی نعرے وضع کرتا ہے۔ سڑکوں پر بھونکراتا، جلسوں میں اینٹیں چلاتا ہے۔ کوئی بھی نور چشم، گھر کا چراغ، والدین کا سرمایہ حیات اگر یہی انداز زندگی اپنلے تو بے سدھ ماؤں کو تھامنے کے لئے کلبجے اور پکڑنے کے لئے اپنے ہی سر تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ آمادہ برفساد زیر تعلیم نوجوان معاشرے کے دوش پر معاشرے ہی کے مستقبل کا جنازہ ہوتا ہے۔ یہ کاروائیاں اکثریت نے اپنالی ہیں یا اقلیت ہی کا فرما ہے مگر اس سے انکار یا فرار ممکن نہیں کہ ایسا ہو ضرور رہا ہے۔ ایسا کرنے والے نوجوان بگڑ گئے ہیں یا بگاڑ دیئے گئے ہیں۔ ان خوبیوں کے لئے فلموں کا شکر گزار ہونا پڑے گا۔ ادبی تخلیقات کا، گھریلو ماحول کا۔ گلیوں کی خاک یا بازاروں کی فضاؤں کا، درس گاہوں کا یا سیاسی دفاتر کا، ہو سکتا ہے، بھت طلب ہو۔ مگر والدین کا سرمایہ حیات لٹا بھی اور برباد بھی ہوا، کسی ذی ہوش کو اس میں کلام نہیں ہوگا۔ اگر یہ سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے تو پھر سیاست شاید اسی کا نام ہے کہ حرص اقتدار شفقت پوری کو دار پر لٹکا دے۔ پاکستان دوستی شاید اسی کو کہتے ہیں کہ آئندہ نسل کے زمانہ تعلیم و تربیت کو بے راہ رو اور ناقص اندیش بنا دیا جائے۔ علم و حکمت سے اس حد تک بے بہرہ رکھا جائے کہ مستقبل کو سنبھالنے کے لئے بیرون ملک سے پڑھے افراد درآمد کرنا پڑیں اور اپنی آئندہ نسل قطعی اور مجسم فری سٹائل بن کر رہ جائے۔ اسے ویڈنگ وغیرہ

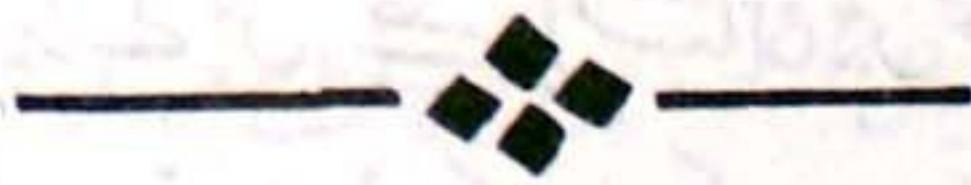
سکھا کر برآمد کئے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہے۔ درسگاہوں میں لائبریریوں کی جگہ پولیس کی چاک و چوبند چوکیاں قائم ہوں اور ان کے ارد گرد فوج نے خندقیں کھود رکھی ہوں کہ ازراہ تفریح ہونہار نہ جانے کس پر حملہ آور ہوں اور زیر زمین سیاست پناہی اس تدبیر میں مصروف ہو کہ پاکستان کے قیام میں طالب علم بھرپور حصہ لے سکتے ہیں تو اسے تڑوانے کے لئے انہیں کیوں استعمال نہ کیا جائے۔ اولاد تو گھروں کے روحانی ستون ہوتی ہے۔ یہ ہی لہرز جائیں ماٹیرھے ہو جائیں تو والدین چھتوں کے نیچے کون سے سیاسی شہتیروں کی ٹیک دیں گے۔ نیک بیٹے نہ ہوں تو کسی باپ کی کمر مضبوط نہیں ہوتی۔ مائیں مصنوعی کلیجوں کے سہارے زندہ نہیں رکھی جاسکتیں۔ سیاست کو دعویٰ ہے کہ آئندہ نسل کی اصلاح کر رہی ہے جو سیاست مارشل لاء کا باعث بننے کی عادی ہو چکی ہو وہ تو خود اصلاح طلب ہوتی ہے۔ تاہم ان اصلاحی کاوشوں کے باوجود حالات روز بروز بگڑتے ہی چلے گئے۔ اس حد تک کہ بہنوں کا مان ٹوٹ گیا، والدین کو لپٹائیوں اور عزیزوں رشتہ داروں کو پریشانیوں نے آلیا۔ مگر کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ سکون کہاں کہاں لٹ گیا، اطمینان کون کون سے کوچہ میں خاک بسر ہوا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، وہی ہوا جس کا وقوع پذیر ہونا کبھی کا نوشتہ دیوار تھا۔ تابینا سیاست نہ اسے پڑھ سکی، نہ ٹول کر ہی مخفی معافی جان سکی۔ کسی بھی تنظیم کو بے نظمی کے لئے استعمال کرنا دانش کو ہٹ بونگ کی دسترس میں دینا ہے۔ اولاد کو اپنی سیاسی سازشوں کا آلہ کار بنانا کس طور مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے کہ اولاد تو دست و بازو ہوتی ہے۔ اولاد کو لوگ اپنے پالتو غنڈوں کے انداز سے تو نہیں پالا کرتے، نہ اس کے لئے ان کے ماہانے مقرر کئے جاتے ہیں کہ بوقت ضرورت تم سے جملے اکھڑوائیں گے، بسیں جلوائیں گے۔ حکومتوں کے تختے ان کے کندھوں پر لادے جائیں گے۔ انہیں لولی لنگڑی سیاست کی بیساکھیوں کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

یہ سیاسی سواریوں کے آگے پوش پوش کرتے انہیں ایوانِ اقتدار تک لے جائیں گے جہاں انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا جائے گا کہ تم ہمارے تخت اقتدار کے پائے بھی ہو اور ہماری پالیکیوں کے چوپائے بھی۔۔۔۔۔ میرے خدا! نامعلوم یہ طرح کس نے ڈالی کہ زمانہ سپوتوں کی بجائے بھوتوں کی تلاش میں چل نکلا۔ مگر اس الزام میں عدل نہیں کہ یہ سب کچھ سیاست دانوں کا کیا دھرا ہے۔ ان کا اس میں ”بیسنی روٹی میں بسن“ بھر حصہ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ادارے سیاست دان نہیں، انتظامیہ چلا رہی ہے۔ قوانین سیاسی دفاتر سے تحریر ہو کر نہیں آئے تھے۔ ان کے مسودے سرکاری دانش گاہوں میں تیار ہوئے تھے۔ جو کچھ ہوا، نظامِ تعلیم بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں۔ اگر انتظامیہ اور حکومت بھی محض دکھاوے کی والدین و سرپرست نہیں تو پھر نگہداشت و تربیت میں آج کی گنوائی جانے والی خامیاں کس کے نام لکھی جائیں۔ انتظامیہ اپنے سرپرستی تو ہاتھ پھیر کر دیکھے، شاید چادر اتر چکی ہو۔ اگر درس گاہوں میں ناجائز اسلحہ ہے تو تحفظِ امنِ عامہ کے کون کون سے ذمہ دار کے پیٹ اور کمرکاناپ انتظامی اداروں کے صدر دروازوں پر تخریر کرنا ضروری ہوگا اور یہ بھی پوچھنا ہوگا کہ ناجائز اسلحہ کے مقدمات کے جو ملزم بری ہو جاتے ہیں، ان پر ڈالا گیا اسلحہ انتظامیہ کو کن ذرائع سے حاصل ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر کیا استاد اس صورت حال سے بری الذمہ ہیں۔ آخر اساتذہ نے اپنی تنظیمیں کیوں بنا رکھی ہیں۔ آج تک والدین نے وہ ماں ہو یا باپ، اپنے مقام کے تحفظ اپنی توقیر کی حفاظت اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے انسانوں کی تاریخ میں کبھی کسی انجمن کی تشکیل نہیں کی۔ کسی ماں نے، کسی باپ نے اپنی اولاد سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کچھ باتیں تو ہم اپنی ذمہ داری کے طور پر بتائیں گے اور سکھائیں گے اور باقی کے لئے تمہیں ہماری ٹیوشن رکھنا ہوگی۔ فی گھنٹہ کے حساب سے فیس دینا ہوگی کہ آخر ہمارے ساتھ بھی تو پیٹ لگا ہوا ہے۔ پھر استاد اگر مثل

والدین ہونے کے بھی دعویدار ہیں تو ٹیوشن کے بہانے علم کی بلیک مارکیٹ کا طریقہ کیوں ایجاد ہو گیا۔ ناممکن ہے کہ یہ امر حکومت کے علم میں نہ ہو کہ امتحانی سوالوں کے پرچے بنانا اور جوابی پرچے دیکھنا کتنا بڑا سود مند کاروبار تصور کیا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ شعبہ امتحانات کی کوئی مد ”سیکریٹ“ نہیں رہی، تمام راز قیمتاً فروخت ہوتے ہیں۔ امتحانی نتیجہ تیار کرنے والے گھپ اندھیرے میں بھی کرنسی نوٹوں کا رنگ بتا دیتے ہیں۔ صرف تدریسی نوٹ ہی فروخت نہیں ہوتے، استاد بھی بکتے ہیں۔ تدریسی آماجگاہوں میں ایسی کارروائیاں ہوتی ہیں جیسے سٹہ بازار میں نماز جمعہ ادا ہو رہی ہو۔ درسی کتابوں میں زندہ مصنفوں اور مدرسوں کی تخلیقات کو شامل کر کے زمانے نے کتاب سے اس کی تحریم چھین لی ہے۔ کتاب اگر محترم نہ ہو تو استاد کا مکرم رہنا ناممکن ہے۔ کسی استاد کی ذاتی کمزوریوں سے طالب علم کا آگاہ ہو جانا ایسے ہی ہے جیسے ماں باپ کے ازدواجی راز اولاد پر کھل جائیں۔ یوں ہو تو استاد کی حیثیت ایک ”کیسٹ“ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر یہی عمل جاری رہا تو اخلاقی قدروں کے تارامیچ پیدا ہوتے رہیں گے۔ بسیں یوں ہی سنگسار ہوتی رہیں گی جیسے ان سے وہی سرزد ہو گیا ہو جس کی سزا عالمانِ دین سنگساری اور قرآنِ عظیم کو رازنی بتاتا ہے۔ ہر آنکھوں کا تارا، ہر نور چشم معاشرہ کو دن میں تارے دکھاتا رہے گا اور بالآخر پابندیوں کا سانس پھول جائے گا۔ ضرورت طلبہ کی تنظیموں پر پابندی کی شاید نہیں تھی، درس گاہوں کی بد نظمی کو پابند کرنا لازم تھا۔ دراصل گھوڑا اکھڑ ہے، معصوم و ناتجربہ کار سوار تو صرف گرا ہے۔ سوار کو صرف دا بنا چاہیے تھا، لگام تو گھوڑے کو درکار تھی۔ کیا یہ سہواً نہیں ہوا کہ اصطبل کا دروازہ بند کرنے کی بجائے جیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جو آلہ کار ہو وہ تنظیم نہیں ہوتی، بے روح تنصیب ہوتی ہے۔ ایک کے تسلط سے نکال کر دوسرے کا آلہ کار بنا دینا کوئی خدمتِ ملک و قوم نہیں ہوگی۔ پابندیاں اگر فقط سیاسی مقاصد

کے لئے ہیں۔ ”خدا نہ کرے کہ ایسا ہو“، اگر چند سیاسی جماعتوں کو اجرتِ تعاون نہیں دی جا رہی تو یہ بھی خیال رہے کہ سازشیں زیر زمین بھی ہوتی ہیں اور ذی رآب و تاب بھی۔ مکنڈیں جھونپڑیوں پر پھینکنے کے لئے نہیں ہوتیں، ایوان ہی ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ ایوان جو ہمیشہ لاوا بھری بنیادوں پر ایستادہ ہوتے ہیں۔ معاشرے صرف ایک ہی وجہ سے ترقی پاتے ہیں کہ نیک نیتوں کے گھروں کے چور دروازے نہیں ہوتے۔ اگر واقعی اصلاح مقصود ہے تو یہ بھی واضح رہے کہ استاد ہی پیشہ نہیں ہوتی اور تعلیم دی جاتی ہے، فروخت نہیں کی جاتی۔ خریدتے ہوئے علم کا حامل یک ہی نہیں جایا کرتا، اپنی بولی آپ ہی لگایا کرتا ہے۔ ہر بڑا یہ احساس کرے کہ طلبہ عمداً ایک اذیت ناک ذہنی کش مکش، دورخی اور فنونیت کے معصوم شکار بنا دیئے گئے ہیں۔ انہیں حریمانِ اقتدار کی ذہنی حراست سے نکلنے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں کہ انہیں قید بامشقت کی ابتلاؤں کے سپرد کر دیا جائے۔ والدین جب انہیں پابند سلاسل دیکھیں گے، بہنیں جب ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں دیکھیں گی، مائیں جب انہیں قیدیوں کے لباس میں پائیں گی تو مقدر کو رونے کے لئے اتنے آنسو کیا حکومت مہیا کر سکے گی۔ ہو سکتا ہے حکومت خود بھی آبدیدہ ہو جائے۔ حکومتیں عوامل پر نہیں، محرکات پر نظر رکھا کرتی ہیں۔ جواز کے پیچھے ڈنڈا لے کر نہیں بھاگا کرتیں، جب تلاش کیا کرتی ہیں۔ ایسا نہ کیا گیا تو

کھیل بچوں کا ہوا، دیدہ بینا نہ ہوا



یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

نظریات قومیت، قوم و وطن، جمہوریت، اشتراکیت، مزدکیت، ملائیت، پیشوائیت، خانقاہیت و فسطائیت کی منافقتوں کے پردے چاک کرنے والے، تحفظ شرف انسان کے علمبردار، علامہ اقبالؒ کے نظریہ ملت اسلامیہ کو ادبی خانقاہوں کے جبار و بکشوں، تشہیری دانشوروں، نیچرلزم کے نچیریوں، ذہنی بوالعجبوں نظری ہماناؤں، اجارہ دار سوشلسٹوں، مخمور لادینوں، سیاسی چومکھوں اور دینی دورخوں نے کیا کیا زخم لگائے، نوع در نوع لیپ لگائی، رنگ برنگ پھلے رکھے۔ کس کس انداز سے پیٹیاں سجائیں، کن جیلوں بہانوں سے جسد پاکستان کے ایک حصہ کو علاج قرار دے کر کاٹ ڈالا۔ کن طور طریقوں سے اب باقی ماندہ لخت شدہ پائے تان کی مصنوعی لسانی و نسلی تقسیم کو ہوادے کر صوبائی خود مختاری بلکہ کنفیڈریشن کی بھٹی کی آگ کو تیز کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسی توجہ طلب، صبر آزما داستان طویل ہے کہ بیان کا بھی ارادہ کریں تو یہ اجارہ دار دیدے پھاڑ، پنچے جھاڑ، سالمیت پاکستان پر یوں جھپٹ پڑتے ہیں جیسے پاکستان میں محب وطن شہری نہیں بستے، صرف اس کے کفن فروشوں نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ مادرِ وطن کی کوکھ کے کچھ ناسور، طاغوتی طاقتوں کے چند ہم زاد، کچھ بہرہ پیئے، آزر نگارے، نمود نقاشے،

ملت نازاد، نہایت پرکاری سے بسورتی ہوئی علاقائی محرومیوں اور وسائل کی غیر مساوی تقسیم کو بہانہ بنا کر نسلی رقابتوں اور لسانی تعصب کو اس غرض سے ہوا دیتے ہیں کہ پاکستان کے آفاقی نظریات کو وفاقی و صوبجاتی غیر اسلامی آئینی قٹامہ کے کھوکھلے دہن میں پان کی گوری کی مثل ٹھونس دیا جائے۔ اور نیل کے ساحل سے تاجناک کاشتر ایک ہونے کے مہتمنی مسلمان کراچی تالندھی کوتل یوں پیل پڑیں جیسے دوران شب اندھی بلیاں قصاب کے خون آلود تختے پر زبانیں چلا رہی ہوں۔ ایسی ہی منافقتوں کے باعث آج تک سرزمین پاکستان عملاً آئین رہی۔ اور ہر شہری نے ہاتھ باگ پرہیں نہ پاہیں رکاب میں کی کیفیت میں گرفتار سوچوں میں ڈوبا رہا کہ رخت سیاست نہ جانے کب اور کہاں تھمے۔ مارشل لا کی چوکھٹ پر یا کسی جاگیر دار کی امر بیل کے سائے تلے۔ اگر حاکمیت اسی کی ہوتی ہے جس کا حکم صادر ہو تو مادر وطن پر افرنگ کے قوانین اور اسلوب آئین کی عملداری کے پیش نظر کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے یہاں آج بھی انگریز کی حاکمیت قائم ہے۔ سنتے ہیں فکر افرنگ کے پنچہ خونیں میں تڑپتے ہوئے مسلمان صیغروں نے آزادی اسلام کے لئے مطالبہ کیا تھا۔ کیا پاکستان اس لئے وجود میں آیا تھا کہ ہم آزادوں کے غلام ہونے کی بجائے غلاموں کے غلام بن کر رہ جائیں۔ ہماری تمام تر سیاسی فکری کاوش نفاذ آئین اسلام کے لئے تھی یا فقط یہ تقاضا تھا کہ روسو اور شیلے شلوار قمیص پہن لیں۔ روسی قراقلی ٹوپی پہن کر لارنس آف عربیا عربی میں گفتگو کرے۔ لین پول اور سمٹھ کی فکر کو تخلیق ابو حنیفہ قرار دے دیا جائے۔ اقبال کے ذہن میں نطشے اور گوٹے کے چراغ روشن کر دیئے جائیں۔ ایوان صدر کو میکا ولی کی سرکاری فکری آرامگاہ قرار دے دیا جائے۔ قانون ساز اداروں میں میکا لے کے فکری فرزند ڈیرے جمالیں۔ سیاست پر

صرف وکٹوریہ کراس کی بریڈ کی اجارہ داری ہو۔ ۱۸۵۷ء کی غداری کے تمنغے ہر نوٹے
قبصری پر رقصاں رہیں، ہر استبداد پر ان کی کھنک کو ہی قومی نغمہ تصور کر لیا
جائے۔ ہر روز نئے چینگیز کا دربار عام لگے۔ ہر شب نئے ہلاکو کے دربار میں تحریک
پاکستان کے شہداء کی پیشی ہو۔ اذہان کو جمود کی رسد کا ہوں میں مقید کر کے زبانوں
پر تالے ڈال، دست و پا مفلوج کر، ٹوٹے ہوئے قلم انگلیوں کے ساتھ باندھ دیے
جائیں اور فرمائش ہوتی رہے کہ تاریخ آزادی مسلمانانِ برصغیر تحریر کرو۔ افرنگ
کے خلعت و اکرام یافتہ تفریقی مدرسوں اور مدرسوں کے اسمائے گراں نما کے بچے
سناؤ۔ اسلام کے لئے جمہوریت، سوشلزم، مذہبی ریاست جیسی اصطلاحات تلاش کرو۔
ڈائٹنگ کی طرف منہ کر کے حی علی الصلوٰۃ اور ماسکو رد ہو کر حی علی الفلاح پکارو۔ تصور لندن قائم
کر کے نیت باندھو کہ ہمارا ہر محمود قتل ایاز پر آمادہ اور ہر ایاز مرگ محمود کا طالب رہے گا۔
تفریق و تقسیم، گروہ بندی، فرقہ سازی اور دینی و سیاسی پارٹی بازی کی راہیں تلاش
کرو۔ اس کا رفرعون کے لئے تاریخ اسلام کو حجرو ح کرنے سے بھی گریز نہ کرو۔ اول و
سابق مہاجر و انصار، حتیٰ کہ یہود و مومنین کے حوالے سے مسلمانوں کی سیاسی تفریق
کو جائز قرار دو۔ جو فرقہ بندی دین میں ناجائز ہے، اُسے سیاست میں لازم قرار دے
کر دین و سیاست کو جدا کر کے چینگیزیت برپا کرو۔ اپنے ذرائع کے مزار پر بنیادی حقوق
کی چادر چڑھاتے رہو۔ اقتدارِ اعلیٰ کے مستقل سرلیں اور ندیدے مخالف پیدا کرو۔ اس
تفریق و تقسیم کو مفکر و معمار پاکستان کے حوالے سے ہی نہیں، خلفائے راشدینؓ کے واسطے
سے درست ثابت کرو۔ حتیٰ کہ امام حسینؓ کو قائد حزب اختلاف قرار دیکر یزید کو
بالواسطہ اسلامی ریاست کا آئینی سربراہ ٹھہرانے سے بھی گریز نہ کرو۔ عمر فاروقؓ
اور اورنگ زیب کے آئین حکمرانی میں فرق و امتیاز پر اپنی حلوسے میں لتھڑی ہرئی
نمکین زبانیں پھیلا دو۔ اپنی حرص جہانگیری کو گم گشتہ کلید میخانہ کی تلاش میں مہر و

رکھو۔ اور عوام کو ”ہلالِ عیدِ بروجِ فلک ہوید اشد“ کی دروغ خبری پڑٹالے رکھو۔ اگر کوئی بندوں کی حاکمیت کے تخلیق کردہ اداروں کے مافی الضمیر کی نشان دہی کرے تو مغربی کمرگسوں کی صحبت میں پلے ہوٹے، قلب و ذہن کے تضاد میں گرفتار مولوں کو ابا بیلانِ سیاست قرار دے کر دیارِ افرنگ میں مہارت مزید کے لئے یہ کہہ کر روانہ کر دو کہ یہ بے چارہ آنکھ سے معذور ہے، اسے کان سے سنائی نہیں دیتا۔ اس کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا، اس کی حرکت قلب غیر متوازی ہے۔ انہیں ماحولِ مادرِ وطن نے صم، بکم، کر دیا ہے، انہیں حکمِ حاکمِ عمیٰ کئے ہوٹے ہے، بغرض علاج ارسال میں سیاسی پناہ دے کر عالم پناہ انہیں از سر نو ”قلبِ شتم“ کر دیں تو شاید کسی مفید کام آجائیں۔ اور خود وہ لغزہ بھالی جھوریت لگاؤ جس کی سرود میں تمہارا اقتدار نغمہ زن ہو۔ صوبائی تشقیر برہمنی وفاقیت پر بھی صبر نہ کرو۔ کنفیڈریشن کا شوشہ چھوڑ کر ”ہرچہ پد رنتواند۔ پسر نام کنند“ کا عمل اختیار کرو کہ حصول اقتدار کے لئے پاکستان مزید لخت لخت بھی ہو جائے تو سودا مندگا نہیں۔ ایسے دریدہ ذہن سیاست دان کاش یہ جانتے کہ انسانی حریت اور معاشی بہبود کا اسلامی نظام آئینِ اسلام کے نفاذ کے بغیر ممکن نہیں اور آئینِ اسلام کا نفاذ سیاسی تفریق کو ختم کر کے فکری و عملی یک سوئی و یک جہتی کا ضامن ہے۔ مغربی شخصی آزادی کا تصور محض ڈھونگ ہے۔ آئینِ اسلام رو بہ عمل ہو تو غیر تو گنجا، ہر انسان کے اندر کا تعمیری ارتقائی، قلبی انسان اس کے باہر کے جسمانی و ذہنی انسان کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو کوئی انسان آزاد کہلوانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ کاش ان لوگوں کی نگاہ انسانی آزادی کے اسلامی معیار کا احاطہ کر سکتی۔ افسوس انہیں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا۔ کاش یہ جانتے کہ اسلام نے دیگر افراد سے ہی نہیں انسان کے قلب کو اس کے ذہن سے آزاد کیا ہے، لافنا کو فنا پر حادی کیا ہے۔ اسلام میں اذہان کی اجسام پر حکومت نہیں، قلوب کی قلوب

سے ہم آہنگی کا آئینی نظام ہے۔ دو انسانوں کے ذہن کی پیدا کردہ عقل کبھی ایک نہیں ہوتی مگر انسانی قلوب میں کبھی اختلاف رائے نہیں ہوتا۔ اذہان کے مستحکم کئے ہوئے انسان فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اور سلطانی قلوب میں انسانیت ہمیشہ متفق و متحد رہتی ہے۔ یہی فرق امت اور سیاسی پارٹی میں ہے۔ پولیٹیکل پارٹی کو سیاسی جماعت کہنا بھی ذہنی پرکاری ہے۔ جماعت تو اجماع جمیع کے ما حاصل کا نام ہے۔ گروہوں، فرقوں اور پارٹیوں کی تفریق و تقسیم کو تو جماعت سازی نہیں کہا جاسکتا۔ اقتدار کے حصول کے لئے یہ طرز عمل اور پھر اس کے لئے ہم جوئی کون سی آیت قرآن پاک اور حدیث رسول مقبول کی رو سے درست و صالح ہے۔ ایک مسلمان سے بڑھ کر انسانوں کی آزادی و تکریم کسے مقصود ہوگی۔ مگر یہ بھی تو جانو اور مانو کہ انسانوں کی حاکمیت میں انسانوں کی آزادی محض ایک پُر فریب ہم رنگ زمین جال ہے، سرابِ رنگ و بو ہے۔ انسانی ضمیر و شعور کی آزادی کے لئے بندوں کی حاکمیت کا یکسر ختم ہونا اور خالق انسان کی حاکمیت کا قائم ہونا از بس لازم ہے۔ ورنہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری کا عمل جاری رہے گا۔ مال کی اطاعت شرف اولاد ہے، اور خالق کائنات کی حاکمیت کو فنا بطحیات کے بنیادی آئینی اصول کے طور پر قبول کر لینا ہی شرفِ آدمیت ہے۔ بندوں کی آقائی کا کیا یہ حل نہیں کہ اسے حاکمیت الہی کے تسلط میں یوں دے دیا جائے کہ بندوں کے مابین تمیز بندہ و آقا یکسر ختم ہو جائے۔ آئین اسلام نے اس تمیز کو لاثانی منفرد طریقہ سے ختم کیا ہے۔ جو فرائض اہل کارانِ حکومت کے ہیں، وہی ہر انسان کے ہیں اور جو حقوق ان اہل کاروں کو حاصل ہیں، وہی ہر انسان کو ہیں۔ یوں اسلامی ریاست حکم و اختیار کی بجائے عدل و احسان کی ریاست بن جاتی ہے، اور تمام تر تفریق و تمیز مٹ جاتی ہے۔ ہر سیاست دان اپنے ہی سر پر ہاتھ رکھ کر

قسم کھائے کہ کیا ہمارے ہاں کا نظام سیاست، دولت، زر خرید و نعرہ بازی، ناجائز اسلحہ، تشدد، لوٹ مار، آتش زنی، دھاندلی، دوٹوں کی خرید و فروخت، سازش خوشامد، غیر اخلاقی اور سماج دشمن حرکات، جھوٹ، مکر، فریب بددیانتی کا محتاج نہیں۔ یا مزید وہ بھی بیان کرنا ہوگا جو مختصر مدت میں کسی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ کچھ کہ تاریخ کا رواں رواں لہو لہو ہو جائے کیا یہ درست نہیں۔ کہ یہ نظام سیاست عوام کے حق رائے دہی کا یوں غلط استعمال کر داتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے مطلقاً ان پڑھ اور نابلد افراد منتخب ہو جاتے ہیں۔ کیا اس نظام سیاست نے ناروادینی فرقوں کی بنا پر سیاسی جماعتیں تشکیل نہیں کروائیں۔ کیا اس نظام نے سیاسی پارٹیوں کی سربراہی قیام پاکستان کے مخالفین کے ہاتھ میں نہیں دے دی۔ کیا ہماری مقننہ عدالتی فیصلوں کو اپنی اغراض کے پیش نظر کالعدم کرنے کے لئے بددیانتی سے قوانین و آئین، حتیٰ کہ عدالتی اختیارات پر ہاتھ صاف نہیں کرتی رہی۔ کیا ہماری عدالتوں نے آئین کو معطل کرنے یا کالعدم کرنے میں ہاتھ بٹائے ہیں یا نہیں۔ کیا ہمارے منتخب نمائندے وطن کی سالمیت کے ساتھ ہاتھوں سے بنانے اور پاؤں سے ڈھانے کا بچوں کا سا کھیل نہیں کھیلتے رہے۔ کیا ہمارے ہاں سیاست پیشہ بن کر نہیں رہ گئی۔ انکار ہو تو کیا نام گن کر بتانا ہوں گے۔ کیا ہمارے ہاں نظام سیاست کے حزب اختلاف کے راہ نما حزب اقتدار سے درپردہ سودا بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کیا ہمارے ہر سیاسی رکن اسمبلی نے خصوصی مراعات حاصل نہیں کیں۔ کیا اپنی کم علمی اور نااہلیت کی وجہ سے ہمارے منتخب وزراء بیوروکریسی کے دست نگر اور کاسہ لیس نہیں رہے۔ عوامی بنیادی حقوق کا کوئی ایک علمبردار بتائے کہ آج تک دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کی ترمیم تک کی تجویز کیوں پیش نہ ہوئی حالانکہ کم و بیش ہر کوئی اس کی زد میں۔ کیا ہمارے منتخب شدہ افراد ۲ اکتوبر کو ۲ اپریل

مسیح کو مساج پڑھتے اور ”آئس“ کی بجائے ”سنو“ طلب نہیں کرتے رہے۔ کیا اس
 نظام سیاست کے دیدہ وروں نے وہ سکی نواز نہیں دیکھے، ماوزراہ تھانہ ٹبی میں نہیں
 پیٹے۔ شریف گھروں کی بیٹیوں کا اغوا ہمارے صوبائی عمال کے ذمہ نہیں لگا۔ طوائف
 جن کی بدکرداری سے الامان پکاراٹھی تھیں، کیا وہ اسی نظام کے منتخب شدہ نمائندے
 نہیں تھے۔ کیا ہمارے نظام سیاست نے سرخ سویرے کی نوید دینے والے، مادر ملت
 کو یہودہ القاب دینے والے کبھی وزارتوں پر قابض اور کبھی مسلم لیگی راہ نمابنتے
 ہوئے نہیں دیکھے۔ جنرل رانیاں جب کتاب لکھیں گی تو نہ جانے کون کون آئینہ
 رو اپنے آئینوں پر سیاہی ملیں گے۔ کیا اس نظام نے راتوں رات رسی پبلکن پارٹی
 بنتے نہیں دیکھی، پاکستان کے بدترین مخالف کو معزبی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنتے
 نہیں دیکھا۔ کنونشن لیگ کس سیاسی مکتبہ فکر کی دریافت تھی۔ آج کے مارشل لا
 حکومت کے وزراء اور مجلس شوریٰ کے ارکان کیا ہماری سیاسی پارٹیوں کے رکن نہیں
 رہے۔ کیا سول چیف مارشل لا، ایڈمنسٹریٹر کی اصطلاح کسی غیر سیاسی فرد کی دریافت
 تھی۔ کیا ہمارے سیاست دانوں نے موجودہ مارشل لا کی معاونت کر کے اسے مستحکم
 نہیں کیا۔ کیا یہ نظام منتخب آمریت سے آشنا نہیں۔ دلائی کیپ کیا کسی غیر کی
 سلطنت کا کارنامہ تھا۔ خدا کے لئے بتاؤ، جو خدا کے دین میں فرقہ بندی سے باز نہیں
 رہے۔ ان سے سیاسی دکانداری سے باز رہنے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ جو دانش ور اپنے
 پیغمبر اور خلفائے راشدین کی تکریم کو جرح کریں، کیا ان کے سپرد عام انسان کی تکریم
 کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ انگریز کے قائم کئے اور پردان چڑھاٹے دینی مدرسوں
 سے مجبان وطن فارغ تعلیم ہوئے، تسلیم کر لیا جائے، آئندہ نسلوں کی تربیت ان
 کے سپرد کر دی جائے جن کے فتوؤں سے منکر پاکستان اور معمار پاکستان
 تک محفوظ نہ رہے۔ اگر یہ سب کچھ ہم پر گذر چکا ہے تو پھر ہمارا طریق انتخاب

اور طور سیاست ترمیم طلب ہے۔ ہم نے طریق انتخاب اور طرز سیاست سے
 رسا کارانہ امیدواری اور عمدہ طلبی و مہم جوئی کو علیحدہ نہ کیا تو ایسوں ہی کی افزائش
 سہل ہوتی رہے گی۔ یہ تمام تر خرابیاں ہمارے آئین و قوانین و نظام سیاست کی خرابیاں
 ہیں۔ اتنی خرابیاں کہ ہم اپنی نظروں میں پسندیدہ نہیں رہے۔ آئین و قانون کا مقصد
 ہی ایک خاص نوع کی تربیت و پرورش ہوتا ہے۔ جیسا آئین ہو گا، ویسی حکومت
 ہوگی۔ جیسا قانون ہوگا، ویسے ہی افراد ہو جائیں گے۔ وہی شخص جو قتل رسول پر آمادہ
 تھا، آئین و قوانین اسلام کے سلسلے میں آگیا تو عمرؓ و فاروقؓ کہلوا یا۔ جو نہ آیا ابوالحکم
 کہلاتا تھا، ابوجہل قرار پایا۔ جس نے آئین اسلام کی خلاف ورزی کی تاریخ کا بوجھ بنا
 رہے گا۔ جس نے اس فعل پر احتجاج کیا وہ حسینؓ ابن علیؓ ہے کہ اللہ بھی فرماتے
 ہیں، اسے مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہے۔ یہ آئین و قانون ہے جو کبھی عثمان سیٹھ بناتا ہے
 کبھی عثمان غنیؓ آئین ہی راشدین بناتا ہے اور آئین ہی چنگیز و ہلاکو۔ کیا ہمارا نظام سیاست
 نفاذ نظام مصطفیٰ کی تحریک کو بحالی جمہوریت اور پھر ایک فرد کے خلاف تحریک میں
 نہیں بدل چکا۔ کیا ہمارا نظام سیاست "کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ۔
 ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا" کی محرک تمثیل نہیں ہے۔ کیا ہم وہ قیدی نہیں
 جو جیلر کے تبدیل ہو جانے پر خوشی خوشی جیل کی دیواریں خود اپنے ہاتھوں مزید بلند کر
 لیتے ہیں۔ کیا ہم آج بھی افرننگ کے ذہنی و فکری سیاسی غلام نہیں۔ کیا اسی غلامی
 کے زیر اثر ہم نے رستہ گیر، عصمت و عفت کے لیڑے اور ازلی ایسے تیسے لوگ اسمبلیوں
 کی کرسیوں پر نہیں سجائے رکھے۔ کیا ہماری سیاست نے بسترہ در بغل ہونے کی بجائے
 طمچہ بدست ہونے کا درس دے کر قوم و ملک پر احسان کیا ہے۔ کیا ہم اپنے علم دین
 کو اکابرین کی امانت، امت مسلمہ کی تفریق و تقسیم کے لئے استعمال کر کے سیاسی مفادات
 حاصل نہیں کر رہے۔ کیا ہمارے آئین و قوانین ہمیں اخروی زندگی کے لئے تیار کر رہے ہیں،

کیا ہم آئینی طور پر اس زندگی کے منکر ہو کر رہ گئے ہیں۔ آیا ہماری سیاست میں دین نہیں
 یک رہا، دنیا فرودخت نہیں ہو رہی۔ کیا ہمارا شعور، فقیہانِ مسالحت میں کی گرفت میں نہیں
 اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی صحیح ہے تو ہم وطنو! ہماری فکر، ہماری دانش
 ہمارا عمل، ہماری سیاست، ہمارا آئین، ہمارے قوانین سب ترمیم طلب ہیں۔ جو
 لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین اسلام میں تشکیل حکومت، نظام حکومت، طریق انتخاب یا طرز
 عمل کا کوئی واضح طریق نہیں ہے، وہ اگر فریب خوردہ دروغ گو نہیں تو کم فہم ضرور ہیں
 اور عمداً یا سہواً اسلام کو دینِ نامکمل، ناقابلِ عمل، غیر موثر و غیر آفاقی ثابت کرنے کے
 ناپسندیدہ نقصان دہ فعل میں مبتلا ہیں۔ یقیناً ہمارے احوال اب صرف بحث طلب
 نہیں، اصلاح طلب ہیں۔ کوئی ہے جو راہ نمائی قبول کرے، ہمیں امتیاز ناقص و کامل
 دلائے۔ ہم پر اور اپنے آپ پر اللہ کی حاکمیت قائم کر کے ہمارے اور اپنے عہدہ ہونے
 کا اعلان کرے۔ کوئی تو ہوگا۔ اگر کوئی نہیں تو آؤ، اپنے آپ کو یسین سنائیں۔

رکھیو! غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے

جناب صدور آپ زیر امتحان ہیں

غروبِ دانش کے اس دور میں ملکی حالات، قومی مفادات اور ان آلام و مصائب سے توقعِ نظر ہونا ہی تھا جن کے تلے عوام ہونک رہے ہیں۔ بحالیِ امن و انعقادِ انتخابات کے مسائل سادہ بھی زلف دراز بن کر نہ صرف صیاد کے لئے دامِ دائم ثابت ہو رہے ہیں۔ بلکہ انجامِ گلستان سے بے خبر، سوکھی ہوئی شاخوں پر اونگھتے ہوئے دانشور بھی ”کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک“ ہو کئے لگے ہیں۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کے ”ابھی تو میں نادان ہوں“ کے اعلان کے بعد تحریکِ بحالیِ جمہوریت نے منزلِ ناآشنائی کے ناقابلِ تردید ثبوت میں لکے مذاکرات کے دوران جس انداز سے ”ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں“ کی کیفیتوں کا مظاہرہ کیا گیا، اس کے زیرِ نظر تاریخِ آج کے اسلام پسندوں کا ماتمِ غیر محرم لازم قرار دینے میں حق بجانب ہوگی۔ مذاکرات کا حاصل قوم کو ”مذاقِ رات“ کے سوا کچھ بھی عطا نہ کر سکا اور اسی رات کی تاریکی میں مذاکراتی شیوخ نے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کو پہرہ داروں کے پاؤں کی چاپِ جان پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور پھر سر جھکا کر داخلِ میخانہ ہو گئے کہ وقتِ آخر ہی آگیا ہے تو خاک وہیں کیوں نہ پہنچے جہاں کا خمیر تھا اور سیاسی نابینگی کے ثبوت میں منبرِ میخانہ سے یہ اعلان فرما دیا کہ کسی دستاویز میں اگر ”محض“ اسلام کو ریاستی

مذہب قرار دے دیا جائے اور کسی متعینہ عرصہ میں بہ اندازہ ذوق حکومت
 افرنگ مسلمان کشتی کے لئے جو قوانین رومن اینکلو سیکسن مکتبہ فکر کے اصولوں کی
 بنا پر راج کئے گئے تھے۔ انہیں اسلام کے مطابق کرنے کی غیر موثر شق کسی آئینی
 دستاویز میں زیبِ داستان یا فریبِ شوق کے لئے شامل کر لی جائے تو کارِ
 نفاذِ اسلام اپنی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ ان حالات میں آئندہ صبحِ کاذب کے
 وقت مختصر وقت کے لئے شاید چاند تو بغرضِ غربِ طلوع ہو جائے، شفق پھوٹنے کی
 امید نہیں کی جاسکتی۔ اللہ کی حاکمیت کو عوامی قوت کے سرِ حشموں سے سیراب
 کرنا اگر مقاصدِ دستورِ مملکت کا جزوِ لاینفک قرار دے دیا جائے، نام نہاد
 عالمانِ دین اگر عالمانِ سیاست بن کر اس عقلِ مختصر سے بھی عاری ہو جائیں
 کہ اسلام کو دینِ ریاست قرار دے کر، مغربی جمہوریت کو سیاست اور سولزم
 کو محیثتِ ریاست قرار دینا، دینِ اسلام کو نامکمل اور مکتبہ ہائے غیر سے
 امداد طلب ہونے کا اعلان کرنا ہے۔ دینِ اکمل پر طعن کرنا اور دستوری
 طور پر یہ تسلیم کرنا ہے کہ اسلام دینِ مکمل نہیں ہے۔ اور نظریاتِ سولزم
 مغربی جمہوریت کے اولین مفکر اور پیغمبرِ اسلام مجموعی طور پر ہمارے فکری راہِ تا
 ہیں۔ یہ تسلیم کرنا ہے کہ اسلام کا اپنا کوئی منفرد اصولی سیاسی یا تشکیلی
 حکومت کا کوئی نظام نہیں اور فی زمانہ راج شدہ نظام ہائے حکومت
 سے سود پر ادھار لئے بغیر اسلام کی جھولی کو بھرا ہوا نہیں کہا جاسکتا۔
 ان حالات میں اقتدارِ ذی شان اپنی بساطِ سیاست کو میدانِ جنگ کے
 طور طریقوں سے سجا رہا ہے اور سیاستِ پریشان و پشیمان یوں بھری
 بیٹھی ہے کہ گھڑی دو گھڑی میں خود کشتی کا مصمم ارادہ ہو۔ یہی انداز رہے
 تو سابقہ انتخابات کے بعد کے مذاکرات اور موعودہ انتخابات سے پہلے

حالیہ مذاکرات میں جمہوریت کے سوئم اور چالیسیویں کا ہی فرق ہوگا۔ انتخابات
 سے متعلق فریقین کی متضاد تجاویز و نکتہ ہائے نظر کے ماحصل کی صورت مسجد کے دروازے
 پر ”یہ شارع عام نہیں ہے۔ داخلہ کے لئے تحریری درخواست بمعہ حلف نامہ و ثبوت
 طہارتِ قطعی نوے دن پیشتر وزارت داخلہ کو بھجوا دینے“ کے نوٹس بورڈ ایسٹادہ
 کرنے کے مترادف ہوگی۔ یوں نیم مغربی طرز کی ایک بے اختیار پارلیمنٹ اس چونکا دینے
 والی صورت حال پیدا کرنے کی ذمہ دار بن جائے گی کہ رادھا کو نچوانے کے لئے
 نو من تیل اکٹھا ہوتے ہی مادھو بانسری اٹھایہ کہہ چلتا بنے گا کہ یہ صرف بھنیں
 کے سامنے بجانے کی چیز ہے۔ سیاست اگر ان ہی مصلحتوں کا نام ہے کہ بظاہر خلافت
 رسولؐ کا دعویٰ ہو اور بہ باطن مغربی جمہوریت کے چنگیز سے بھی تاریک تر انداز
 کو شمعِ راہ قرار دیا جا رہا ہو۔ مغربی جمہوریت کی سرمایہ دارانہ مبنیافت پر سوشلزم کے
 الحاد کا غلاف چڑھا کر تکبیرِ اقتدار پر استراحت فرمائی جائے۔ صرف اونگھ آنے
 سے پہلے کلمہ طیبہ کے درد کا اہتمام قائم رکھا جائے تو بابِ اسلام پر یہ تختی بہر حال
 آویزاں کرنا ہوگی کہ ”مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ“ سیاست اگر یہی ہے کہ دستور
 راجح ہو تو اس کے مصنف کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ وہ نہ رہے تو اس
 کی تصنیف کی بحالی کے دعویدار بن جاؤ۔ جن کے ساتھ فکری نبرد آزما ہو مان
 ہی سے گٹھ جوڑ کر لو۔ قاتلِ مقتول کی فاتحہ خوانی کے لئے اپنے گھروں کے سامنے دریاں
 بچھا لیں اور مقتول کی تصنیف و ذہنی تخلیق کو ہاتھوں میں لئے ماتم کناں ہوں۔
 سیاست اگر یہی ہے کہ نفاذِ نظامِ مصطفیٰ کی منزل قریب آئے تو اسے ثانوی
 مسئلہ قرار دے دیا جائے اور وہ بھی یہ کہہ کر کہ ابھی ہمارا وہ گدھا نہیں ماننا جس
 پر کتابیں لدی ہیں، ہم آئیں گے تو نظامِ مصطفیٰ لائیں گے۔ اور پھر یکایک عوام
 کے جذبات کے نقش کو جمہوریت کی جنازہ گاہ میں رکھ صفیں سیدھی کرنے کی ہدایت

فرمائی جائے۔ میت کی بخشش کے لئے دعا مانگی جائے کہ اللہ تعالیٰ جمہوریت کو بحال فرمائے ہمیں فی الحال معادن بننے کی توفیق عطا فرما۔ تو اس ہیرا پھیری میں عوام اور کارکنوں کے ساتھ جو ہوگا، وہ تو ہوگا ہی۔ عدالتی اختیارات کی وہ چھتری بھی لازماً ٹوٹ جائے گی جو تیز دھوپ، طوفانی بارش یا برف باری کے دوران انسانی اجسام کی حفاظت کے لئے استعمال کی جاسکتی ہو۔ اس کے بعد کوئی بجالی جمہوریت کا دعویٰ بنے، بجالی فکر و اتحاد عوام کا طلب گار ہو، منت کرے یا دھمکی دے، مار کھاتا جائے یا تشدد پر آمادہ ہو، قاتل اعظم اور حکیم الامت کے مزاروں پر بغیر منہ چھپائے جانے کا اہل نہیں رہے گا، مقفل دروازوں پر بے سود دستکیں دے گا اور ہتھیالیاں سہلاتا سر جھکائے "خود کردہ را علاجے نیست" بڑبڑاتا واپس چلا جائے گا۔ کسی آخری آرام گاہ کی تلاش میں، تھکا ہارا ابدی نیند سے تھکاوٹ مٹانے کا متمنی۔

لہذا اصلاح صورت احوال کے لئے کسی ایسے مرد سے مخاطب ہونا اپنا قوم اور ملک کا وقت ضائع کرنا ہے۔ جس دور میں سے ہم گزر رہے ہیں اس میں صرف اس امر کا احساس ہی دلایا جاسکتا ہے کہ جناب صدر! یہ آپ کے اقتدار کا نہیں، امتحان کا دور ہے۔ آپ کے نفاذ اسلام کی خواہش اگر واقعی دیرینہ اور پختہ ہے تو ذرا احتیاط فرمائیے گا کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا، جبرائیل کا پہنچایا ہوا اور رسول کا لایا ہوا اسلام ہی ہو۔ منکر پاکستان کے اجتہاد نے تو یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مغربی جمہوریت اور اشتراکیت دونوں ابلیسی نظام ہیں جو اس نے اس لئے برپا کئے ہیں کہ شرع پیغمبر آشکارا نہ ہونے پائے۔ ان نظاموں کو نافذ کر کے مسلمانوں کو ذکر و فکر صبح گاہی میں مست رکھ کر مزاج خالق ہی میں پختہ رکھنا اس کے کارندوں کی دور رس پالیسی ہے۔ حکیم الامت نے شاید صحیح نتیجہ ہی اخذ کیا ہو کہ دین ملاً فی سبیل اللہ فساد بن کر رہ گیا ہے اور

وہ بے چارہ دین کی بنیادی اساس سے اس حد تک نابلد ہو کر رہ گیا ہے کہ فقط سجدے کی اجازت مل جائے تو اسلام کو آزاد قرار دیتا ہے۔ اگر یوں ہی ہے تو پھر یہ صورت حال بڑی احتیاط طلب ہے۔ علامہ مرحوم نے عقل عیار کے سو بھیس بدلنے، زاعنوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن آجانے اور لہو پینے اور تعلیم مساوات دینے والے پرکاروں کی طرف توجہ بلا مقصد تو نہیں دلائی ہوگی۔ صدیوں بعد کسی مفکر نے الارض اللہ، الملک اللہ اور الحکم اللہ کی اسلامی بنیادوں پر آئین مملکت تیار کرنے اور ریاست عدل کو وجود میں لانے اور بنائے خلافت کو پائیدار کرنے کے لئے اسلاف کے قلب و جگر ڈھونڈھ کر لانے کی تلقین کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں اور پیروی سنت کے پردے میں جیلے بہانے امت مسلمہ کو فرقوں میں تقسیم کرنے کی سازش کو بے نقاب کیا تھا۔ جناب صدر ایہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ آگاہ رہیں کہ آج کے میدان سیاست کے کون کون سے رستم و سہراب قیام پاکستان کے مخالف اور اقبال اور قائد اعظم کے ہجو گورہے ہیں۔ کون کون سی سیاسی جماعتیں تصور پاکستان و قیام پاکستان کا مضحکہ اڑاتی رہی ہیں۔ کس کس نے اقبال اور کو کافر اور قائد اعظم کو مغرب زدہ اور انگریز کا ایجنٹ کہا تھا۔ ایسے افراد سے راہ و رسم نہ ملک کے لئے، نہ قوم کے لئے اور نہ آپ کے لئے سود مند ہو سکتی ہے۔ ان چیزوں سے نقاب نہ اٹھے تو سرحد پار پیغام جاتے بھی رہیں گے۔ اور وہاں سے سندیسے آتے بھی رہیں گے۔ نظریاتی سرحدوں پر پگ ڈنڈیاں اور اعتقادی اداروں میں روزن بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اس تخریب کاری کا علاج سرحدی حفاظتی طریقوں سے نہیں کیا جاسکتا۔ آستین کے سانپ کبھی کسی نے ڈنڈے سے نہیں مارے۔

جناب والا! آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ تاریخ کو دو ٹوک فیصلہ دیں کہ اسلام میں فرقہ بندی، گروہ سازی اور متضادم نظریات کی دینی یا لادینی جماعتوں کے قیام کی اجازت ہے یا نہیں۔ قرون اولیٰ کے ہاجر و انصار کی ہنگامی مجالس یا علی رضی اللہ عنہما اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان جنگ جمل کی مبینہ داستانیں آج کی سیاسی پُرکاریوں کے لئے دلیل کے طور پر قبول کرنا یا پیش کرنا سیاستِ اسلام کے عنصر کو تیخِ یزید کے سپرد کرنے کا مکروہ عمل ہے۔ تاریخ کو فیصلہ درکار ہے کہ لاتفرقوا کا حکم اسلامی آئین میں نافذ العمل رہنا چاہیے یا نہیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے، آپ تاریخ کو یہ فیصلہ دیں کہ مغربی جمہوریت اور سوشلزم کے اصولوں کو اپنائے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام ہائے حکومت اسلامی کہلانے کے حق دار ہیں یا نہیں۔ تاریخ آپ سے فیصلہ چاہتی ہے کہ اسلام کو مغربی جمہوریت اور سوشلزم کی بیساکھیاں درکار ہیں یا یہ اتمامِ نعمتِ الہی کی حد تک مکمل دین ہے۔ تاریخ یہ فرض آپ کے ذمہ لگا چکی ہے کہ آپ یہ فیصلہ دیں کہ ”جو عہدہ طلب کرے اُسے عہدہ نہ دیا جائے“ کے دور رس اور منفرد اصول کو آپ اپنے طریقِ انتخاب و تنظیم و انتظامیہ میں سمودینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ جب تک آپ صرف باوردی تھے آپ صرف جزافیہ کے سامنے جوابدہ تھے، اب تو تاریخ کو یہ دریافت کرنے کا حق حاصل ہے کہ حاکمیت کس کی ہوگی۔ آپ کی، آپ کے رفیقان اقتدار کی یا اللہ تعالیٰ کی۔ کس کی رضا کا تسلط ہوگا۔ حاکم وقت کی، حکومت کی یا اللہ تعالیٰ کی۔ زمانہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کیا دستور اسلام میں کسی بھی حاکم وقت کی اپنی مرضی ہو سکتی ہے۔ جو اپنی مرضی، اپنے ذاتی رجحانات و خواہشات کی نفی نہ کرے، کیا وہ بھی اسلامی حکومت کی سربراہی کا اہل ہو سکتا ہے۔ جو اپنی مرضی کے

تسلط کا دعویٰ رہا ہو، اپنی مرضی کو قانونِ مملکت بنانے کا عادی ہو۔ جو اللہ کی مرضی کا قطعی تابع نہ ہو، رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ ہو، کیا زمامِ کارِ حکومت و خلافتِ رسولؐ اس کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ وقت اہل رائے کی تعریف دریافت کر رہا ہے، جنسی بلوغت اور بالغ رائے دہی میں فرق و امتیاز جاننا چاہتا ہے۔ تقویٰ و دانش کے باہمی روابط سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ راہِ زن و راہِ نما کی دستوری تعریف کا طالب ہے۔ عوام الناس کے آلام و مصائب چنچ پینچ کر ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، ناجائز منافع، ارتکازِ دولت، جاگیر داری، سرمایہ داری و سرمایہ کاری سے متعلق آپ سے اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کے متعلق فیصلہ سنانا چاہتے ہیں کہ آج بھی وہ قابلِ عمل ہیں یا نہیں۔ مزدور کا پسینہ بھی اور مزدور کا خون بھی عرض گزار ہے کہ اسلام میں صنعت کار کون ہوتا ہے، صنعت میں کام کرنے والا یا صنعت میں سرمایہ لگانے والا۔ ہر دو کا صنعت کے نفع نقصان میں برابر کا حصہ ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ طبقہ ان اصولوں پر فقط درس سننے کا ہی نہیں، اپنے زخموں کی مرہم کا طالب ہے۔ فرمائیے! آج کی تاریخ میں ان کے لئے کیا جواب تحریر ہوگا۔ نیل کے کنارے بھوکے کتوں کے متعلق نہ سہی، گلیوں میں بھوکے انسانیت اور پیٹ پھولی درندگی کے علاج کی ذمہ داری انتقال اقتدار کے ساتھ ساتھ آپ کس کو سونپ کر جائیں گے۔ رشوت ستانی، لوٹ مار، تشدد پسندی، غنڈہ گردی، طبقاتی نفرت کا نہ سہی، اُن کا مداوا ہی بتائیے، جو آج کے طریق انصاف کے ہاتھوں لٹ گئے۔ کچھ سر بھرے آپ سے انتقال اقتدار کا تقاضا بعد میں اور اور زمانہ کی سیاست کے ہاتھوں جو زخمِ اسلام نے، اُن کے اعتقاد نے، ایمان و یقین نے کھائے ہیں، اُن

کا مدد واپہلے طلب کرتے ہیں۔ جناب والا! تاریخ ان ہی سرچھروں
 نے تحریر کرنا ہے۔ مزید سرچھرے آپ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا خطبہ اول
 آئینی اور دستوری طور پر سُننا چاہتے ہیں۔ تاریخ کی کتابوں کے سرورق
 ایسے ہی سرچھروں کے ہاتھوں تیار ہوتے ہیں۔ جو یہ ذمہ داری نہ نبھائے،
 یہ معجزاتی دیوانے اُسے تاریخی ستم شعار قرار دے دیتے ہیں۔ انہیں آج تک
 ایسا کرنے سے کوئی روک ہی نہیں سکا کہ ان کے قلم اٹھاتے ہی ستم شعار اپنے
 ہی ستم کی زد میں آجاتا ہے۔ جناب والا! غیر اسلامی، سیاسی و غیر سیاسی،
 جماعتی و غیر جماعتی طریق انتخاب کی بحث و تمحیص کے فلسفے ان زخموں
 کا علاج نہیں۔ جو قوم اپنے ذہن و قلب پر کھائے بیٹھی ہے۔ وہ نامور
 جو قوم کے اذہان و قلوب پر سیاسی اجارہ داری کے منافقت
 نے ابھارے ہیں، ناقابل برداشت ہیں اور تاریخ ان کا مرہم اور مدد و
 طلب کر رہی ہے۔ اسلامی قوانین کے نفاذ، شرعی انصاف، زکوٰۃ و عشر،
 قیام صلوات اور مجالس مشاورت کے متعلق تاریخ اپنے فیصلے چادروں اور
 چار دیواریوں پر تحریر کر چکی۔ نامعلوم آپ نے یہ نوشتے مطالعہ فرمائے یا
 نہیں۔ یہ تحریریں الفاظ میں ہیں، ہندسوں میں نہیں۔ حق و باطل کی آمیزش
 ہو تو ان تحریروں کی سیاہی پھیل جاتی ہے اور پڑھی نہیں جا سکتی۔ جناب والا!
 آپ کو احساس ہوگا کہ نفاذ شرح اور نفاذ شرع میں ہی نہیں، ان کے نتائج
 میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ بھی محسوس ہو گیا ہوگا کہ اجسام پر اور دلوں پر
 حکومت کے اطوار ایک سے نہیں ہوتے۔ کامیابیاں نہ عرصوں کی محتاج
 ہوتی ہیں نہ عرصے ان کا معیار ہوتے ہیں۔ دانش و خلوص صرف متوسط طبقہ
 کا سرمایہ ہوتا ہے اور یہی طبقہ قوموں کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ دولت کے

ہر سگہ پر ایک طرف سازش اور دوسری طرف خوشامد کے پر پیچ نقوش ہوتے ہیں۔ یہ سگے قائد اعظم کی جیب میں ہوں تو بھی کھوٹے اور جعلی ہوتے ہیں۔ آپ کی صدارت تاحال قیادت آشنا نہیں ہے۔ نظام مصطفیٰ کے تمام جرنیلوں نے اپنے چہرے پولنگ بوتھ کی صندوقچیوں میں چھپائے ہیں۔ ان کا تعارف صرف ان کا انتخاب نشان رہ گیا ہے۔ غیر جماعتی طریق انتخاب ان کی سرکوبی یا احتساب کا موثر طریقہ نہیں ہے۔ صندوقچیاں کھلیں گی تو ماسوائے ڈراوٹی حیرت کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ اس قسم کی سیاسی زکوٰۃ سے دانش عوام خود کفیل نہیں ہوگی۔ یہ خود رو سیاسی فصل عشر ادا کرنے سے قطعی انکار کر دے گی۔ یوں تشکیل پانے والی پارلیمنٹ سیاسی دیوالیوں کے دارالشفقت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی۔ بصورت دیگر سیاسی جماعتیں جو فقط سیاسی فنانس کمپنیاں بن کر رہ گئی ہیں، آج کا عدم ہیں تو کل "عدم" ہوں گی پیشہ وارانہ سیاست جو سیاسی تجارت کی عادی ہو چکی ہے، فکر برپا کرنے اور فکر فروخت کرنے میں امتیاز کی اہل بھی نہیں رہی، فکری خلا کو اتنا وسیع کر دے گی کہ وہ پاکستان جیسے مومنوں کی فکری جنت بنانے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، احمقوں کی جنت کی نمود و نشوونما کے لئے وقف ہو کر رہ جائے گا اور آئندہ نسلیں مغربی جمہوریت کے امور اور اشتراکی سانپ کی لڑائی کے سوا کچھ اور دیکھ پائیں گی تو وہ صرف رقص ابلیس ہوگا۔ اس لئے جناب صدر! تاریخ آپ سے فیصلہ طلب کرتی ہے کہ آپ عرصہ اقتدار کی طوالت کے خواہاں ہیں یا تاریخ میں زندہ رہنے کے۔ تاریکیوں پر سے پردہ اٹھائیے کہ صبح طلوع ہو سکے، ورنہ آخر شب کے چراغ از خود بجھ جایا کرتے ہیں۔ رات بھر کے جاگے ہوؤں کے لئے نسیم سحری بڑی خواب آور ہوتی ہے۔ جناب والا! تاریخ آپ کو دکھا

رہی ہے کہ لوگ اسلام کو یوں سنگسار کر رہے ہیں جیسے عیسیٰ اپنے منافق حواریوں
 میں پھنس گئے ہوں۔ بظاہر اسلام دوستوں نے اسلام کے کندھوں پر صلیب
 لاد دی ہے۔ ان کے ذہنوں میں اسلام کے مقتل تیار ہو رہے ہیں۔ تاریخ
 گلشنِ اسلام میں پھول کھلتے دیکھنا چاہتی ہے۔ مساجد کا مستقابر میں بدل جانا
 اسے گوارا نہیں۔ تاریخ مرگِ یزید کی طالب ہے اور مغربی جمہوریت و
 سوشلزم قتلِ حسین پر ادھار کھائے ہوئے ہیں۔ رقیبانِ اقتدار کو چوہِ دلدار
 میں تمام ترپروں کے باوجود سرنگوں کے ذریعہ درآنا چاہتے ہیں۔ جو برات
 لے کر آنے کے قابل نہ ہوں، اعوا کے طور طریقے ہی اپنا یا کرتے ہیں۔ لیکن
 تاریخ سازشوں سے نہیں، رفاقتوں سے نحو حاصل کرتی ہے۔ قبل اس کے کہ
 سیاسی فکر کی منزلوں کے مسافر راہِ نونوں کے دروازوں پر دستک دے
 بیٹھیں، تاریخ کو اپنے فیصلوں سے آگاہ فرمائیے۔ ورنہ وقت سارے کلینڈر
 الٹ دے گا۔



سو جا راجِ دلکے، سو جا

اے دانش ورانِ گمانِ گرفتہ، اے مصنفینِ عدلِ جہانگیری، اے تولیدِ فضلِ اکبری، اے فیضِ یابانِ دینِ الہی یہ کیا ہوا؟ کہ ہزار بار کسی بھی حریفِ اقتدارِ مدعیِ محبوبیت و ربوبیت کا نام لو۔ زبانِ لذتِ بوسہ لطق سے منکر اور کام و دہنِ بدمنرگی، داروئے مرضِ معاشرہ کے نوحہ کنناں رہتے ہیں۔ یہ کس انداز سے کاروانِ مومنانِ فرنگِ منزلِ اسلام کی طرف رواں ہوا کہ اسلام مسافر ہو گیا، عقیدوں سے عقد ٹوٹنے لگا، فقہ کا چہرہ فق ہو۔ اولی الامر عالمِ سکرات میں دانش و فلسفہ "تعمیر و تقوین" سے غاری ہو کر فقط امرِ اولیٰ کے پابند ہو گئے۔ یہ کس بابر "غیر عالم" نے عیش کی ٹھانی کہ "عالم" دوبارہ نیست نوشتہ دیوار ہوا۔ شیخِ حرمِ کلیم بوذر و دلوقِ اولیس کیوں فروخت کرنے لگے۔ چادر زہرا کس کے ہاتھ لگ گئی کہ کوثر ابلنے لگا۔۔۔۔۔ اے آلِ دانش۔ اگر سارقِ ملکِ غیر قطعِ ید کا سزا وار ہو تو مرکبِ مرقہِ حاکمیتِ مالکِ الملک کی جزا کیا ٹھہرے۔ اس کے خلاف دعویٰ حصولِ انصاف کے لئے کہاں جائیں۔ دنیا بھر کے حاکموں نے اللہ کی حاکمیت پر ڈاکہ ڈال رکھا ہے۔ سنتے تھے، ایک ریاست اللہ کی حاکمیت برآمد کرانے کے لئے وجود میں آئی تھی، اللہ کے اس پولیس مین کا کیا ہوا۔ معطل تھا، بحال ہوا یا برخاست کر دیا گیا۔

یہ کیا اصول دنیا نے قائم کیا کہ حکومت چرانا نہ سکو تو گردن زدنی قرار پاؤ۔ لقب کامیاب ہو تو تخت نشینی حق سارق، بیعت فرض عوام اور "تسلیم" اصول سیاست خارجہ قرار پائے۔ اس اصول قانون سازی پر زبور و تورات و انجیل و قرآن کی کونسی آیات صادق آتی ہیں۔ دانشورو! عصمت لوٹنے والے پر حد نافذ ہو سکتی ہے تو راہ زنان سرچشمہ طاقتِ عزوجل نے کیا کچھ نہیں لوٹا؟ کہ ہمیشہ سے بری قرار چلے آتے ہیں۔ جہانگیر جامِ شراب و دیدہ گلابی کے عوض سلطنت لٹا دینے کا مدعی اگر بادشاہ وقت تھا تو اے بدعیان تیز ترک گامزن، کیا یہ اسلام کی عملداری تھی؟ اللہ کی حاکمیت تسلیم کی جا رہی تھی؟ پشاور کے دور افتادہ محروم اسپ و خیر، پیادہ و آبلہ یا مظلوم کے لئے آگرہ کے شاہی محل میں زنجیر عدل آویزاں کرنے والے کے لئے صدر شکن پائندہ باد کا نعرہ لگاؤ یا انصافِ در بدر کی مدح سرائی کرو۔ اللہ کے حقوق پر عملِ غصب چھپائے نہ چھپے گا۔ تاریخ تو دریافت کرے گی کہ مُشرکہ و کافر جو دھا بائی پر خلافِ شرع پیغمبرِ چادر ڈال کر زینتِ حرم بنانے، سورج کی پوجا کرنے اور تلک لگانے والا مطلق العنان بادشاہ وقت لاکھ اکبر ہو اور اعظم بھی، عملدارِ اسلام کیوں کر ہوا۔ تاریخ روزِ محشر ٹوڈر مل سے بھی پوچھے گی، بیرم خاں سے بھی ابوالفضل سے بھی کہ اللہ تو صرف اکبر ہے۔ یہ اکبرِ اعظم کون ہے۔ اور بے نکاح کی کوکھ کی پیدائش کو برہمنی جنمِ اشٹی ہزار بار شہنشاہِ ہندوستان قرار دے، تاریخ اس کو مملکتِ قلمرو آئینِ اسلام کیوں گرگردان لے۔۔۔۔۔ دانشورو! تاج محل کی خوبصورتی اُس کے نام کیوں کر لکھتے ہو جس کے ہاتھوں نے ایک پتھر بھی نہیں لگایا؟ کیا صرف اس لئے کہ اشرافیوں پر اس کا نام کندہ تھا۔ اصل معمار انصاف چاہیں گے تو عدل کی کون سی گھنٹی کھنکے گی۔ کیا اس کے زمانہ میں اسلام کا آئین نافذ تھا؟ اگر تھا تو وہ مطلق العنان بادشاہ کیوں کر ہوا؟ نہیں! اگر مغربی جمہوریت اسلام کا جز ہے

سے گریزاں و منکر ہیں وہ سرخرو کیوں ہیں۔ اور جو پٹ پٹا روٹھے مل بیٹھے ہیں،
 زیرِ حشر کیوں ہیں۔ کیا پوچھیں کہ وطن دشمنوں کے اتحاد اور وطن دوستوں کے
 فساد و انتشار میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کیوں نہ سوچیں کہ کچھ لوگ حب وطن سے
 عاری، تخریب پسند، تشدد آزما اور فسادی کیوں ہوئے اور انہیں راہِ راست
 پر لانے کے لئے اُن کے فکر کی ریخت درکار ہے یا ان کے جسم و جان کی۔ نام نہاد
 محب وطن سیاست دان مزید تفرقے ڈال رہے ہیں، برائے تحفظ وطن تفریقِ دائم رکھنے
 پر مصر ہیں۔ جماعتوں میں ہی نہیں بے جماعتیں بٹ گئی ہیں۔ جسے دیکھو جبل اللہ
 تھامنے سے منکر و گریزاں کسی نہ کسی ازم کا طوق گلے میں ڈالے لبِ بام کھڑا غیروں
 کو آواز سے دے رہا ہے، آجاؤ یا یہ گھر تمہارا ہے۔ مسلح آؤ یا اسلحہ کے ساتھ آؤ۔
 ہر چند کہ واعظ کا عدم ہے مگر برس برس منبر دار اُٹھی رکھے، سب بے حد کے لئے مونچھ منڈوائے
 اعلانِ گناہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے ملتِ واحدہ کا تصور کبھی قائم نہیں ہوگا،
 ملتِ مدسوں میں بٹی رہے گی۔ میں تفرقات قائم رکھوں گا کہ میرے جلو میں کسی
 سالک ہل، پناہ لئے "واعظمو ارجبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا"، تلاوت کرتے مگر عمارت
 مقامِ مصطفیٰ کی بنیادی خشت اکھاڑتے، ہر ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد میں دکانیں
 سجائے، ہمارے سوا سب کافر ہیں کو موضوعِ سخن بناٹے غلطان و عظ ہیں۔ کارکن
 لاکھ ماتھاپیٹیں، بال نونج لیں۔ ہم صرف اس لئے متحد نہیں ہو سکتے کہ تین گروہ ایک
 صف میں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود ہم پیر بھی ہیں، دین کی خیر بھی چاہتے
 ہیں اور اللہ تعالیٰ کو القیوم بھی مانتے ہیں۔ دولت اگر نہ ہو تو اگرچہ ہم ایک آنے
 کے انسان بھی نہیں اور توڑ، مچھوڑ، تخریب کاری، سازش گرمی، افتراق و تفریق
 میں نام پائے ہوئے ہیں۔ ہر چند بے صدر ہیں۔ تاہم اگر صدارت حاصل ہو جانے
 کا احتمال ہو تو ہم وہ ماہر مبلغِ اتحاد ہیں کہ دیرینہ نوازشوں کے صلے میں اپنے لئے

رہی ہے۔ چوان لائی اور ماؤز سے تنگ، صلاح الدین ایوبی کی سوانح عمری پر مشترکہ
 دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ بیگن سارقان جسد رسولؐ کی مذمت کر رہا ہے، اندرا گاندھی
 ہندو مسلم بھائی بھائی کا درس دے رہی ہیں۔ اور تم ہو کہ فرد فرد کی حد تک پُرزے
 پُرزے اپنے دفاع کے لئے بھی پُرزوں کے محتاج اور نیلے اتفاق کے سبب سے
 بڑے منافق ہو۔ جو تم بے رایوں سے اختلاف رائے کی جرأت کرے، تم بحیرہ عرب
 سے درے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور یتیم خانوں سے سیاست دان حاصل
 کرنے کی کارِ لا حاصل میں لگے ہوئے ہو۔ جو لوگ جنازہ پڑھانے کی اجرت وصول
 کرتے ہوں، جلسوں میں شرکت کا وعدہ کرنے سے پیشتر زادِ راہ اور اجرتِ گفتار
 کا تقاضا کرتے ہوں، قیام و طعام اور فلش سسٹم کے متعلق پیشگی یقین دہانیوں پر
 اصرار کرتے ہوں، قبروں کی تجارت کے عادی ہوں، اُن سے مددائے سیاست
 منظور کی توقع گداگروں سے زکوٰۃ طلب کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ تم میں کچھ ایسے
 ہیں جنہیں واقعہ جہاز پر کوئی تاسف نہیں۔ کچھ ایسے ہیں جنہیں اس واقعہ کے
 سرزد ہو جانے کی وجوہات و محرکات پر کوئی پشیمانی نہیں۔ کچھ جلے جا رہے ہیں کہ
 اس کا سیاسی فائدہ حکومتِ وقت کیوں اٹھاگئی اور کچھ کو اس امر کی خوشی ہے
 کہ کچھ نواستحادی جماعتوں کو نقصان تو پہنچا۔ نہ تو اس واقعہ کے محرکات پر تمہاری
 نظر ہے، نہ اس کے نتائج اور ردِ عمل سے تم آگاہ ہو۔ اسرائیل نے عراق کا اپنی
 رمی ایکڑ تہ و بالا کر ڈالا اور اس برہمی کا بھی اظہار نہ ہوا جو بے وقت جگادینے
 پر ہوتی ہے، اس برہمی کا بھی نہیں جو آیا کے کھلونا چھین لینے پر بچے کے چہرے پر
 نمایاں ہوتی ہے۔ غالباً ہمارے سیاست دانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ رمی ایکڑ
 کہتے کس کو ہیں۔ شاید اُسی کو کہتے ہیں جس کے برباد ہونے پر کوئی رمی ایکٹ "نہ کرے
 کھلونا ٹوٹ جانے پر ماں بچے سے کہے، رونا نہیں اور لے دوں گی، اور بچہ ماں سے

کہے۔ ائی! مجھے اور لے دو۔ لے دو گی نا! اور گھر پر سکون چھا جائے۔ ہم میں اقوام
متحدہ کی متفقہ اور اسرائیل کی طرف سے مسترد شدہ، عراق اور امریکہ کی پیش کردہ
قرارداد کی سر دھری پر دی ایکٹ کرنے کی بھی صلاحیت نہیں۔ ہم تو ”اور لے آئے
بازار سے اگر ٹوٹ گیا۔ جام جم سے تو میرا جام سفال اچھا ہے“ کا اندازِ غالبانہ
بھی نہ اپنا سکے۔ یہ بھی دریافت نہ کر سکے کہ تم جس کے دوست ہوئے آسمان اُس کا
دشمن کیوں ہوا۔ پوری دنیائے اسلام یوں مجبور و بے بس ہو گئی جیسے یہ کارِ الہی ہو۔
اتنے مکدر بھی نہ ہوئے کہ مقدر لکھا جان کر اسے پکارتے جو صبر کرنے والوں کے ساتھ
ہوتا ہے۔۔۔۔۔ دانشورو! کیا فراست مومن کا معیار یہی ہے کہ برادرِ اسلامی ممالک
آپس میں لڑیں۔ اسلامی ممالک میں باہمی جنگ اور خانہ جنگی بیک وقت روا رکھی جائے۔
تشدد، غارتگری، قتل، پھانسی، انتقام کیا اسلام کی سر بلندی کے ذرائع ہیں یا
اس کی رسوائی کا باعث ہیں۔ فتحِ مکہ مفقود ہو چکی یا ابوسفیان کا کوئی گھر نہ رہا۔
آخر کب تک صنم خانے کعبے کے لئے پاسبان مہیا کرتے رہیں گے۔ کب تک
اُمتِ رسولِ لات و عزریٰ کو پٹروں سے ڈرائی کلین کرتی رہے گی۔ آہنی پردوں میں
پرورش و تربیت یافتہ ریچھ کو یہ شکوہ ہے کہ اس کے جسم پر لگی برف گرم پانیوں
میں پگھلانے اور اس کے دوہاٹ باٹھ کے راستے میں مسلم دیرینہ حائل نہیں رہا تو
بچہ ناداں جو یقیناً وقت قیامِ سجدے میں گر جائے گا، ناحق اذان کیوں دے رہا
ہے۔ مجاہدین کیوں کہیں آ جا رہے ہیں۔ ان کو جب نصر من اللہ میسر نہیں تو وہ کیوں
مدد کرے جس کے خانہ پابند میں نصر اللہ پابند خانہ ہے۔ نہ اقوام متحدہ سوچتی ہے
نہ ہم غور کرتے ہیں کہ ریچھ حالیہ و سابقہ مملکت ہائے اسلامیہ کے باہن سرحدیں مسدود
کیوں نہیں کرتا۔۔۔۔۔ دانشورو! تم میں سے کسی نے بھی ”ڈاکٹرین آف ہاٹ پریوٹ“
نہیں پڑھا۔ کوئی بھی ریچھ کے کار خفیہ تنظیم سازی اور نیت نہفتہ سے آگاہ نہیں۔

یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے کہ فی زمانہ سانپ آسینوں میں نہیں پلتے۔ بالخصوص جب کہ حالت یہ ہے کہ کائنات ابھی اسلام کو فرقوں میں تقسیم کرنے والے دانشوروں کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ اسلام کے قلعے میں ان فرقوں کے تیغ زبان سپاہی اپنے اپنے فرقے کو نوازشاتِ مزید کے لئے مزید گروہوں میں تقسیم کرنے لگے۔ تم ہی کہو۔ مزید زور دار ماتم نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ فکر کا بٹ جانا، اس کا متضاد ہو جانا، باہمی محبت و یگانگت کے لئے تریاق نا آشنا نہ ہر قاتل ہے۔ اختلاف رائے کو ضد بنا لینا بالآخر تصادم پر منتج ہونا آیا ہے۔ قدرت ہم پر رحم کھا کر بھی اپنی فطرت کا متبادل تلاش کرنے پر آمادہ تو نہیں ہوگی۔ ہم ذہنی اور فکری تنازعات پر یک رائے ہونے کے لئے ”ردوہ الی اللہ والرسول“ کا اصول کیوں نہیں اپنا لیتے۔ صرف ان ہی سے دوا کیوں لیتے ہیں جن کے سبب بیمار ہوئے۔ ہماری تمام سیاسی جماعتوں، مذہبی فرقوں بلکہ تمام تر مختلف الخیالوں کا آج بھی اللہ اور رسولؐ مشترکہ سرمایہ ہیں اس ملک کے نیک و صالح، پابند صوم و صلوة بہتر شہری یا باریش بہترین شہری یا مدعیان ریاست اگر احترام رمضان کو قانون خوش آمدید کہتے ہیں تو اس ملک کی رجم ہونے کی حقدار، ناختم، برہنہ سرطوائف تک میں بھی ابھی تک احترام محترم موجود ہی ہے تو اس کی فکر کے ذہن کا قلب ان دنوں سیاہ دوپٹہ اور ٹھہ لپٹا ہے۔ ایسی قوم کے اصلاح یافتہ ہو جانے سے، یہ دیکھ کر بھی کہ الحاج بلیک کرتے ہیں، مایوس ہو جانا کفر ہے۔ اگرچہ آج تک اس قوم کے افراد اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی نظام اور فکر و عمل کی اقدار پر متفق نہیں ہوئے۔ تو قصور ان کا یا حالات کا نہیں۔ ہماری منافقت کا ہے۔ لوگ صفوں میں شامل ہونے کے لئے بے قرار ہیں، آراستہ کرنے والا کوٹی نہیں۔ سامان و ابستگی نہیں، اذن آراستگی نہیں۔ سامعین موجود ہیں، مبلغ ”متوفی“ ہو گئے ہیں۔ آج کے نام نہاد داعی صرف

لقمہ کو بلیک کہتے ہیں اور اَجَلُ کہلاتے ہیں۔ از خود عالموں کے ہاتھوں علم کو اجل نے آلیا ہے۔ صرف عازمین گناہ نے طالبانِ پناہ کے لئے صفیں بچھا رکھی ہیں۔ لہذا عوام الناس، سورۃ الناس کی اخوذ سے بے حس ہو گئے ہیں۔ اور عملِ ذہن کو الخناس سے شروع کرتے ہیں۔ قرآن کے طالب علم کو تحریف شدہ زبور و تورات و انجیل کے حوالوں سے قرآن سکھاؤ گے تو یہی ہوگا کہ زلیخا ہر قافیہ نویس غلامِ رسول پر طنز کرتی رہے گی کہ بھکے ہوئے خوش عقیدہ عالم سے راسخ العقیدہ غیر عالم، لاکھ تویسی پر بیل ڈالو، بہتر ہے۔ خدا کو جاننے اور نہ پانے اور نہ جاننے مگر پالینے میں فرق بیان کرنا چاہیں تو روس کے ایما پر انقلابِ اسلام لانے والوں کا امریکہ کے ایما پر اسلام کی تدریج کرنے والوں سے دریافت کریں یا تمہاری صفتِ فصاحتِ مصنوعی سے مشورہ کریں کہ کون کون سے الفاظ صرف بیان ہوں۔ یا یہی کہہ کر خاموش ہو جائیں کہ لوگو! جذبہٴ احترامِ رمضان کی ستائش مزید کرو کہ شاید بات احترامِ انسان تک جا پہنچے، احترامِ اسلام بھی نافذ ہو جائے اور فرقہ بندی قانوناً ممنوع قرار پائے۔ یا خاموش دعائیں مانگیں اور یقین دلائیں کہ فقط دعاگو رہیں گے۔ ہمشیر نہیں بنیں گے کہ اسلام کو مشورے دینے کا منصب کبھی کسی کو حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر حاصل ہو گیا تو کمیں کوئی یہ مشورہ نہ دے دے کہ ہم شہیدوں سے مذاق نہ کر۔ ہم مخلصانِ بے حس و باز رو سپم پر انحصار نہ کر۔ ہمارے حصار تو غیروں کے ادھار سے تعمیر شدہ ہیں۔ سپر ہونا ہے تو سپر طاقتوں کے ہاں چلا جا کہ حمالکِ اسلامیہ پر ابھی یہ اجاگر نہیں ہوا کہ جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات ہوتی ہے۔ حق کو باطل کا لباس پہنانے اور شرکتِ میانہٴ حق و باطل قبول کر لینے کی بدعت نے ہمیں قلبی و ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے اور ہماری دانست میں ہی نہیں آتا کہ ضابطہ ہائے فوجداری و دیوانی، قانون

شہادت و تعزیرات مغربی ہوں تو صرف اچکن زیب تن کر لینے سے نہ اسلامی عدالت قائم ہو جاتی ہے، نہ انصاف لالا اللہ تلاوت کرنے لگتا ہے، نہ وکیل سرکاری کا قلب جاری ہو جاتا ہے۔ ہم نہیں جانتا چاہتے کہ لفاظی تعزیر اسلام کے لئے اگر اینگلو سیکس قانون شہادت اپنا یا جائے تو سزا ملزم کو کم اور اسلام کو زیادہ ملتی ہے۔ ہماری با مسلمان اللہ اللہ اور با برہمن رام رام کی عادت ہمیں لے ڈوبی ہے۔ ہم ابھی تک محمد حسین رام کرشن ہیں۔ ہم یورپ کے کلیساؤں اور افریقہ کے صحراؤں میں اذان دینے والے اب وہاں صرف محنت مزدوری کرنے یا سیاسی پناہ ڈھونڈنے جاتے ہیں۔ اب تو ہم مسجدوں میں کلیساؤں کی نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اور ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے کہ دوران نماز ہاتھ چھوڑنے چاہئیں، باندھنے چاہئیں، یا اٹھانے چاہئیں۔ اب تو ہماری نیم وا آنکھوں میں مخمور جہانداروں کی نشان چھی رہتی ہے۔ ہم تلواروں کی چھاؤں میں کلمہ پڑھنے کی بجائے اغیار ساختہ تلواروں پر کلمہ پڑھ کر انہیں رو بہ اسلام کر لیتے اور بعد از حمد و صلوٰۃ انہیں اپنوں پر ہی اٹھا لیتے اور ان کے سائے ان ہی کے سہارے کمالِ دروغ گوئی سے آشنائی رکھتے ہیں۔ اس حد تک کہ ہماری تو ذوالفقار کے بھی انداز بدل گئے ہیں۔ نہ معلوم کس کی سان پر چڑھ کر متشدد و منقہم ہو گئی۔ نہ فاروق رہی، نہ ولی۔ دانشورو! راعی اور رعایا میں اختلاف پہلے گھروں کی چار دیواریاں اور پھر ملکوں کی سرحدیں سکیر دیا کرتا ہے۔ نہ معلوم ہم کیوں نہیں جان پائے کہ نگہبانی اختلافات کو ناپید اور نگرانی انہیں ایزا کرتی ہے۔ نہیں جان پائے کہ نگہبانوں سے محبت اور نگرانوں سے کدورت انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ نگہبانوں کو انسانی فطرت پھول پہنائی اور نگرانوں سے آنکھ بچاتی ہے۔ نگہبانی اپنوں اور نگرانی صرف غیروں کی ہوتی ہے۔ نگرانی سے اپنے غیر اور نگہبانی سے غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ کسی کے پاگل پن کا علاج خود پاگل ہو

جانا نہیں۔ زخمی سے ہمدردی کا یہ انداز کیا ہوا کہ اپنے جسم پر بھی ویسے زخم لگائے اور ساتھ کراہنے لگے۔ نہیں جان پائے کہ پیشہ ور مبلغ معاشرے کا ناسور ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اعتقاد کو ایون لگا دیتے ہیں۔ اگر راہب نہ بنائیں تو غارت گر ضرور بنا دیتے ہیں۔ نہیں جان پائے کہ خمر علم سے بڑھ کر اور کوئی ضمیر اٹم کبیر کا حامل نہیں۔ ہم کب تک برہمنی سماج کی پیشانی پر گھسے پٹے تلک کو محراب کہتے رہیں گے اور فرقہ داریت کے پیشہ وروں کی ادارہ سازی عوام کو "سوجا راج دلارے" سنا تی رہے گی۔ خالق و مخلوق کے درمیان پیران کلیسا کب تک حامل رہیں گے۔ کب تک اپنی بے روزگاری پر شکوہ کناں دہنقان خوشہ گندم کو انتہائے قنوطیت میں جلانے کی سوچتا رہے گا۔ حرم کب تک مرمی سیلوں سے اظہار بیزار می کرتا رہے گا۔ ہم یونہی رہے اور کسی برآمد شدہ انقلاب نے ہمیں آلیا تو تازہ پولیس مینی کا کیا ہوگا۔ تازہ شاہراہوں پر گشتی پولیس کون سی رو دیاں پہنے گی اور کیسے پہچان ہوگی کہ وردی سینڈ ہینڈ ہے یا سپاہی نیا ہے۔ لوریاں دینے والے بڑے کائیاں ہیں۔ جانتے ہیں، دلارے سو جائیں تو راج قائم نہیں رہا کرتا۔



جناب صدر!

چھپا کر آستیں میں بھلیاں رکھی ہیں گردوں نے

فقیر کو احساس ہے کہ مزاج سطوت، تابِ سخن سے عاری ہوتا ہے،
 اقتدار کے تیور استحکامِ رعب کے لئے مصنوعی بل ڈال کر مرعوب رکھنے
 کے عادی ہوتے ہیں۔ بال بال بچاؤ کی کاوشِ پیہم چشم و دلِ مقتدر میں
 ناگوار بال ابھارتی رہتی ہے۔ انسانی اقتدار کو صبح و مسا سنگھار کے باوجود
 کبھی اپنا چہرہ مکمل نظر نہیں آتا۔ بادشاہ اس معذور انسان کو کہتے ہیں جس
 کا شعوری ہاتھ تاج پر ہوتا ہے اور لاشعوری نظر پائیہ تخت پر۔ فقیر جو پنکھ
 مرعوب نہیں ہوتے اس لئے نہ گتاخ ہوتے ہیں، نہ سزاوار معذرت،
 موت سے آشنائی نہ ہو تو زندگی سے شناسائی انسان کو ذوقِ خود آگاہی
 سے محروم کر دیتی اور اُسے بندوں پر حاکمیت کی لرزتی ہوئی حرص و آرز
 کے سپرد کر دیتی ہے۔ بوریہ نشین اور مسند آرا میں احساسِ تحفظ کے
 بیش و کم ہونے کے سوا اور کوئی فرق نہیں۔ انسانوں کے خوف سے
 آرائش گاہِ ذہن و قلب کے تمام چراغ جو کوئی بھی اپنی ہی پھنکار سے

بچھا دے، وہ بادشاہ بن جاتا ہے اور جس کی طمانیت فکر سے نت نئے
 چراغ روشن ہوتے رہیں، وہ فقیر راہ نشین و خرقہ پوش ماحول کی فکر کو ضربِ
 کلیم اور عمل کو دیدِ بیضا کے خواص سے نواز جاتا ہے۔ بادشاہوں کے مقبرے
 اور فقروں کے مزار تک اپنے منظرآت میں قطعی مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم
 چونکہ فقیر و شاہ کو ایک سی مٹی تلے دب جانا ہے اس لئے تمام تر امتیازات و
 تکلفات کو ناگوار جان کر، آپ کی پابندی عبادات مسلمان کے پیشِ نظر،
 جناب صدر! آپ کی توجہ ان تقاضا ہائے تاریخِ مستقبل کی طرف مبذول کرانا
 ضروری سمجھتا ہوں جو مادرِ وطن کی پیشانی پر نمایاں طور پر تحریر ہیں۔ لیکن ضیائے
 ایوانِ حکومت سے منور، مگر چڑھیاٹی آنکھوں والے سیاسی گھڑی ساز، محب
 شیشوں والے خول سجائے آپ کو فقط وقت کے نقائص سناتے اور تعلقین
 کُناں رہتے ہیں۔ کہ اے مادرِ وطن کے فرزندِ اول، نگاہ نہ اٹھانا کہ مادرِ وطن
 پردہ کی اس قدر پابند ہے کہ اس کی پیشانی پر تیری بھی نگاہ پڑ گئی تو عرقِ آلود
 ہو جائے گی۔ اس کے ستر کی حفاظت کا بہترین علاج و پرہیز یہی ہے کہ اس
 کی فکر کا ہر سوتا مستور رہے، اور نظریہ پاکستان کسی کو نظر نہ آنے پائے۔
 بندوں کی حاکمیت اور بدکاروں کی "صاحبِ الرائی" کے خلاف اعلانِ جہاد ان
 کی سیاسی میخواری اور قمار بازی کو آدھی آنکھ بھی نہیں بھایا۔ جامِ سیاست
 تپ اٹھے، دستِ ساقی پھنک گیا۔ گھٹا تو ابھی نہ آئی نہ برسی۔ مگر ان
 بے پیندوں کا میخانہ جام ہائے لرزاں سے ٹپکی ہوئی شراب میں ہی ڈوبنے
 لگا۔ فقیر غیبِ دان نہیں مگر بُو دیتے ہوئے مشوروں کی یلغار کی چپ
 راست، اصحابِ بعین و یسار کو جس انداز سے صف آرا کر رہی ہے، اس
 سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تسخیرِ قوتِ ایمان کے لئے فکری سرنگیں کھودنے

والے بہرو پیئے گدالیں سنبھال چکے ہیں۔ یہ کامیاب ہو گئے تو جناب صدر! تاریخ اسلام، ڈر ہے ان کی پرکاری کی وجہ سے کسی نئے واقعہ کو بلا سے دوچار نہ ہو جائے۔ قول فقیر گراں تو ہے، مگر دستور فقر میں پھپ پھپا کر مشورے دینے کو سازش قرار دیتے ہیں۔ اس لئے کھلے بندوں ان مشورہ کنوں پنچیروں کا ذکر لازم بھی ہے، ضروری بھی اور مجبوری بھی۔ جناب والا! اس امر کا اعادہ آپ کے، ملک و قوم کے، تاریخ و جغرافیہ پاکستان کے مفاد ہی میں نہیں، اللہ تعالیٰ اور رسول مقبولؐ کی خوشنودی کے لئے از بس متمم و منہم ہے کہ مغربی جمہوری نظام سیاست خالصتاً سیکولر اور سرمایہ دارانہ ہے، دین اسلام کے تصور شرف انسان و تشکیل معاشرہ سے سراسر متصادم ہے۔ مفکر پاکستان کی تحقیق و اجتہاد کا ما حاصل یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آگ سے ایک ابلیس بنایا۔ مگر اس نظام نے خاک سے صد ہزار ابلیس ڈھال نکالے۔ مقام فرد و خاندان کی نفی کرتا ہوا، بندوں کی حاکمیت کا معاشرتی بندھن توڑتا ہوا، یہ نظام شرع پیغمبرؐ کے خلاف ایک سازش نہفتہ و غیر محسوس ہے۔ پرکار بھی اور پُر فریب بھی۔ آپ کو بھی اگر قیصری درکار ہے تو یہ نظام بہت مفید ہے، ضرور اپنائے رکھیئے۔ ضیا کو شہنشاہی دینا ہے تو یہ نظام خوب ہے، خوب تر بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مگر تاریخ اسلام کو ضیا دینا ہے، تو اس نظام کو دھونا او مسلنا ہی کافی نہیں، چاک درچاک کرنا ہوگا۔ اس کے اعادہ کا مطالبہ حب وطن کی تحریک نہیں، ہوس اقتدار ہے ان افراد کی جو محرومیت، خود مختاری اور کنفیڈریشن کے میکا ولی بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی چال کامیاب ہو گئی تو ۱۹۷۰ء کی تاریخ پھر عود کر آئے گی۔ اگر محافظان وطن سمجھتے ہیں کہ سر زمین وطن کے طول و عرض میں مزید سکرٹنے کی گنجائش ہے تو فکر کمپونزیم نو ساختہ سے

ادھار مانگا ہوا نظام سیاست تضادات پھر برپا کر دیجئے۔ ہم فقیروں کو
 حریت اسلام نصیب نہ ہوگی تو شہادت اسلام کو اپنا مقدر بنا لیں گے۔ مگر
 سرسبزی مادر وطن کی راکھ سے تیار شدہ سیاہی سے حاکمان اوقات وطن
 تاریخ میں اپنا نام نہ ہی تحریر کروائیں تو بہتر ہوگا۔ جناب والا! یہ جاننے
 کے لئے کہ مغربی جمہوری طریق انتخاب مغربی جمہوری مکتبہ فکر کی ایجاد ہے،
 دانش مغرب کے کنوئیں اس طرح جھلکنے کی بھی ضرورت نہیں کہ انسان
 باوردی اس میں گر پڑے اور پھر ان کی تاریکیوں میں آوازیں دیتا ڈوب
 جائے، کہ ہے کوئی ولی، جو مجیب ہو سکے۔ مغربی جمہوری نظام انتخاب،
 مغربی جمہوریت، بندوں کی حاکمیت، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اجازت
 داری، لادینیت کے، استحکام کے لئے ایجاد کیا گیا ہے۔ نظام اسلام
 کے نفاذ اور استقلال کے لئے نہیں۔ کون بے سرا ہے جو اس کے عوامل و
 محاصل سے آگاہ نہیں۔ کتنے سالوں سے اس کا دیو استبداد چیر پھاڑ کر رہا
 ہے۔ اس کے دانتوں کی تیزی و کارکردگی و کارفرمائی سے آگاہی کے لئے کیا ابھی
 مزید تجربہ کی ضرورت ہے۔ اس طریق انتخاب کا اسلام کے فکر و عمل سیاست
 سے دور کا بھی لگاؤ یا واسطہ نہیں۔ اس نظام کو نافذ کرنا وحدت ملت اسلامیہ
 کو بارود کے صندوق میں بند کرنا ہے۔ کیا انتخابی ریشہ دوانیوں، رقابتوں،
 محاصمتوں، مخالفتوں، گروہ بندیوں اور تحریف و تفریق و تقسیم سے مادر وطن کے
 سینے سے لپٹے ہوئے نیم جان و خستہ تن شہری اچھی طرح آگاہ نہیں ہیں۔ جناب
 والا! اسلام کا اپنا ایک منفرد طریق انتخاب ہے۔ اسلام کی ریاست و شہریت
 کا اپنا ہی تصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمودہ نظام آئین اسلام میں سب سے
 افضل مقام کا وہی حقدار ہے جو سب سے زیادہ نیک و متقی ہے۔ کیا

خوفِ خدا کے بغیر بھی حصولِ مقامِ اتقا ممکن ہے۔ مقامِ سربراہی مملکتِ حاکمیتِ الہی دراصل کمالِ اتقا کا دوسرا نام ہے۔ جو لوگ بندوں کی حاکمیتِ مطلق کے نظام میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سرسجود رہنے کا شرف رکھتے ہوں، انہیں اگر اپنے شرف پر اعتماد حاصل نہ ہو سکے تو پراگندگی ماحول کا کارفرما ہونا محرابِ پیشانی سے بھی زیادہ واضح ہے۔ مامورئ سربراہ و عمال و مشیرانِ حکومت اگر امور درپیش مملکت ہیں تو مغربی جمہوریت کے نظامِ اکثریت و اقلیت، جماعت سازی، تمنا و حرصِ اقتدار، عمدہ طلبی، مہم جوئی، منافرت و منافقت، استحصالِ فکر و رائے اور اسلام کے نظامِ مشاورت، غیر عمدہ طلبی، مہم جوئی اور اتفاقِ فکر و رائے کے اہتمام و انصرام میں بڑا فرق ہے۔ مشورہ تو کیا ہی یک رائے ہونے کے لئے جانا ہے۔ جو تفریق پیدا کر دے، وہ فقط رائے دہی ہے۔ رائے دہندگی کے عمل میں افہام و تفہیم اور یک رائے اور یک جہت ہونے کے عمل کو شامل نہ کیا جائے تو وہ مشورہ نہیں کہلا سکتا۔ مشاورت برائے انتخاب اور انتخاب برائے مشاورت کے عمل میں بڑا فرق ہے۔ خاندان کا کوئی فرد اپنی مرضی سے شادی کر لے تو سلیکشن یا نامزدگی ہوئی۔ اکثریت کی رائے سے اقلیت کی مرضی کے خلاف شادی کر کے خاندان کو تفریق کا شکار کر دے، تو الیکشن کی شادی ہوئی جو غم و غصہ و نفرت و حقارت و تفریق کے مانتی سڑ شادیاں میں لازماً سمودے گی۔ باہم مشورہ سے یک رائے ہو کر بہترین رشتہ بغیر دو لہا دو لہن کی رشتہ طلبی و مہم جوئی کے تجویز و تکمیل ہوا تو خوشیاں، راحتیں، باہمی محبت، توقیر دامن پھیلائے استقبال کے لئے بہر حال شادان و فرحان کھڑی ہوں گی۔ مشاورت انسانوں کے

احساس کم تری کو ختم کر کے انہیں اپنی نظریں موقر بنا دینے اور انہیں خود اعتمادی عطا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے، جس کی وساطت سے اختلاف، نفرتیں، کدورتیں اگر ہوں بھی تو ختم ہو جاتی ہیں۔ مشورہ اتنا خود اعتماد ہوتا ہے کہ سر مجلس کیا جاتا ہے۔ جناب صدر! جسے چھپ چھپا کر خفیہ طریقے سے کیا جائے وہ سازش ہوتی ہے، مشورہ نہیں ہوتا۔ رازدارانہ رائے دہی کتنی سازشوں، کتنی منافقتوں، کتنی بد عنوانیوں کو جنم دے جاتی ہے۔ کاش مغربی جمہوریت کی سنیولی کے رحم پر کسی کی نظر ہوتی۔ عمدہ طلبی یا امیدواری کسی بھی صورت میں ہو تو بات رائے دہی تک ہی محدود رہے گی۔ مشاورت کے دروازے از خود بند ہو جائیں گے اور انسان کی ایمانداری اس کے مکرو فریب اور پُرکاری، حرص و آرز کے مضبوط پنچوں کی گرفت میں دم توڑ جائے گی۔ مغرب کی سیاست کا یہود کے خونیں پنچے کی گرفت میں چلا جانا اسی نظام انتخاب کی وجہ سے ہے۔ مشاورت و عمدہ طلبی کو بیک وقت رو بہ کار لانا نیولے اور سانپ کی لڑائی کروانے اور پھر تماشا دیکھنے کا عمل ہے، اسے کارِ مومن کیونکر گردان لیں۔ برسرِ مجلس مشاورت کے ذریعہ یک رائے ہونا اور پھر عمل بیعت میں داخل ہو جانا وحدتِ امتِ مسلمہ کی ضمانت ہیں۔ مشاورت اگر عمل بیعت برپا نہیں کرتی تو وہ مشاورت ہی نہیں۔ اسلامی یا غیر اسلامی کی بحث میں الجھنا بے معنی ہوگا۔ امور مملکت میں تمام مسلمانوں کے مشورہ کا روز و شب مسلسل و متواتر بلا واسطہ شامل رہنا آئین اسلام کا خاصہ ہے۔ یہ عمل جاری نہ رہے تو خلافت کا ملوکیت میں بدل جانا، حاکم و محکوم کے امتیازات کا قائم ہو جانا، سازشوں، شرارتوں، بغاوت اور احساساتِ محرویت کا در آنا لازمی امر ہے۔ قرآن پاک جامع اصولوں کی کتاب ہے۔ جزئیات اور

طریقے ایسی کتابوں میں درج ہوں تو ان کی افاقیت و جامعیت ناقابل عمل
 ہو جائے۔ مندرجہ بالا بنیادی اصولوں کے مطابق انتخابات کے ضوابط تیار کرنے
 کے لئے اگر خلوص نیت میسر ہو تو کوئی ذہن ارسطو درکار نہیں۔ بس ذرا قرآن
 کو بدلنے کی بجائے خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جناب صدر! نکاح تو
 اغوا شدہ اور اغوا کنندہ کا بھی ہو ہی جاتا ہوگا مگر نہ سہاگ کے گانے
 ہوتے ہیں، نہ کوئی باگ پکڑتا ہے، نہ سلامی مانگتا ہے اور نہ کوئی سہرا باندھتا ہے
 گھر والے دیواروں سے سر ٹکراتے، زہر کھاتے، قتل تک کرتے یا ہوتے ضرور
 دیکھے گئے ہیں۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب کے متقاضی درست ہی کہتے ہوں
 گے مگر مومن صرف احکام الہی کا پابند ہوتا ہے۔ مدعی دانش ہونا فقر کی
 نفی بھی ہے۔ السدائل کبر و نخوت سے محفوظ رکھے۔ لیکن بغیر کسی بستے پر ہاتھ
 رکھے عرض ہے کہ اگر مغربی جمہوری طریق انتخاب کا مزید تجربہ کیا گیا تو وطن عزیز
 کو فکری بغاوت کے سپرد کرنا ہوگا۔ آپ ایک فکری جنگ کا اعلان کر چکے
 ہیں۔ یہ جنگ امدادی فکری اسلحہ سے نہیں جیتی جائے گی اور شکست اُن
 اسلامی نظریات کی ہو جائے گی، جن کی علمبرداری کے آپ بہ اصرار دعویٰ دار
 ہیں۔ یقین فرمائیے، مشاورت، تقویٰ، بیعت، عدم عہدہ طلبی و ہم جوئی، امور
 مملکت میں شہریوں کے متواتر مشورہ اور شرکت کے بنیادی اصولوں کی بنا پر
 ایسا انتخابی ضابطہ اور لائحہ عمل تیار کرنا کہ کسی فرد کا ایک روپیہ تک بھی خرچ
 نہ ہو اور آئینی ادارے قائم و مستحکم ہو جائیں، نہ ناممکن عمل ہے نہ مشکل۔
 مگر منزل اسلام کی طرف سفر کرائے کی سواریوں کے ذریعہ جاری نہیں رکھا جاسکتا۔
 آپ مسند اولیٰ پر متمکن ہیں۔ فریب مغرب کھائے ہوئے فریبی اولی الامر
 فکری تنازعے کھڑے کر کے عمل صالح کو موخر کرنے کے لئے خوشامد بھی کریں گے

اور سازش بھی۔ از خود امر آسان فرمائیے۔ مفکر پاکستان کا یہ انتباہ بھی زیر نظر رہے ہے
 چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
 عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آستیانوں میں



سرمد مفت نذر ہوں

تمہیں قسم تمہارے لبِ خندان و تبسم گریاں کی، بظاہر صلح جوئی و باطن تنازعہ
 خوئی کی، نگاہِ طویل اندیش و نیتِ لپت و کوتاہ کی، اقوالِ یسار و اعمالِ یمین کی، حبِ
 کعبہ اور عشقِ گرین وچ کی، ذکرِ طہورِ جنت و وجودِ کدورِ جہنم کی، تمہارے وعظِ حور اور
 حبِ سبزہِ خطاں کی، عقیدہٴ اسلام اور فکرِ یہود کی، بواسطہٴ خلافتِ راشدہ حبِ جمہوریت
 غرب کی، ذکرِ غناٹے عثمانؓ اور طمعِ جمع مال کی، مسلکِ بوذرغفارمی اور عملِ سیاست
 جاگیر کی، غلامیِ بلالِ حاضر اور قوتِ خرید شُما کی، اقوالِ استقامت و اقبالِ مغضوب
 کی، دعویٰ ربوبیتِ الہی اور گدائیِ حاکمِ کُل کی، تقاریرِ بدست اور اعمالِ خودکش کی،
 زیرِ تعمیر مسجد اور کلیدِ صندوقِ چنبدہ کی۔ تمہیں قسم علمِ دین کی کلیرنس سِل کی، تمہیں قسم
 تمہاری تقدیرِ خود نوشت کی۔۔۔ کھاؤ قسم! رحمن و رحیم کی، کہ تم شکوہ کنانِ عدمِ ایفاء
 وعدہٴ اقتدارِ عارض، مجسمِ اعتراضِ بنے، آج جس عارضیہٴ عارضی میں مبتلا ہو وہ بوجہ
 پرہیزگاری لاحق ہوا۔ احتیاطاً لگ گیا یا کوئی اچھوت تھا کہ شبِ وصل بیرونِ دروازہ
 صدر تم نے چھو لیا۔ آج جو بنامِ ابراہیم، کارِ آزر میں یوں غلطاں ہو کہ دربارِ نمود میں
 داستانِ مظلومی بُتاں بیان کرنے کی مہارت میں تمہارا مقابلہ خانہٴ یزید میں ماتمِ حسین
 کرنے والے زود پشیمان بھی نہ کر پائیں۔ نوحہ کنان ہو کہ بغرضِ تو، بحالیٰ ما، اشد ضروری
 ہے۔ ورنہ ہمیں گھن اور تمہیں گرہن لگ جائے گا۔۔۔ چلاتے ہو، کہ وہ وعدہٴ دلنواز

جو ہم ”اسیرانِ محفوظ“ سے یوں کیا تھا، اگر فضا مری نہ ہوتی تو ہم خوشی سے مر گئے ہوتے، وعدہ سبز کیوں ثابت ہوا۔ صنم کدہ سیاست کے شکستہ سو منا تو۔ کھاؤ قسم کہ تم خود عہد شکن نہیں ہو۔ میدانِ سیاست کے اگر مگر و، تمہارے رویہ ماضی کے پیشِ نظر انسان فانی تو کیا، زیرِ فنا کوئی قوت بھی تم سے وعدہ صادق نہیں کرے گی۔ ہر لمحہ، لقمہٴ اقتدار ہاتھ میں لئے تمہیں پچکارتا رہے گا۔ دُم پر ختم ”جو الہ بیانِ ایران“ از خود ہلتی رہے گی۔ مگر تمہیں اپنی رال چاٹنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا، کہ جو سیاست ما درِ فکر سے منقطع ہو جائے وہ صرف سیاست کے گلیسکو بے بی ہی پرورش کر سکتی ہے، تزیینتِ فکرِ تعمیر اور پرورشِ عملِ قوی اس کا منتہا نظر کبھی نہیں ہوتا۔ جس فرد کی سیاسی فکر منکرِ مملکت کے نظریات سے متصادم ہو جائے، تعمیرِ معاشرہ اس کے عمل کی عنایت نہیں ہوتی چنانچہ یہاں جو کوئی فکرِ اقبال کی نفی کرے گا، منفی ہو جانا اس کا مقدر ہوگا۔ پاکستان کے جدِ فکر نے جس مغربی جمہوریت کی نفی کی، تم اسی کے طالب ہو گئے، لہذا منہا ہو گئے۔۔۔۔ وعدہ وفا نہیں ہوا، شاید وعدہ ایسا نہیں ہوگا کہ تم عہد شکن، آج بھی مغربی جمہوریت کی وکالت سے نہیں چوکتے۔ آئیٹنے اگرچہ دھندلا چکے۔ مگر کوچہ ہائے تنگ و تاریک وزیرِ مضافاں میں نہفتہٴ دیگ سیاستِ خفستہ کو یہ توجہ ہی دیں گے کہ مہربان اس قوم کے ساتھ کئے گئے عہد نامہ کی عبارت وہ تو نہیں تھی جو تم آج بیان کر رہی ہو۔ تم تو آنکھ دبا کر چھپ نکلنے کی عادی ہو۔ جا ہی رہی ہو تو یہ منڈھی ہوئی سندِ مسلمانانہ بھی ساتھ ہی لیتی جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم بچ نکلو اور یہ پکڑی رہ جائے کہ وہ دن اب بھی معکوس تصور ہیں جب مملکتِ خداداد وجود میں نہ آئی تھی اور یہ تصور ذہنِ منافقت میں بھی جنم نہ لے پایا تھا کہ مملکتِ خداداد اس کو کہتے ہیں جسے خدا اپنی ملکیت سے علیحدہ کر کے حاکمیتِ عوام کے لئے سیاسی جوار یوں کے حوالے کر دے۔ مملکتِ خداداد کو شیطانی جمہور کے لئے خداداد گردان لینا ہی فلسفہٴ ظلّ الہی کا جمہوری روپ ہے۔ بس ذرا سلطانِ مطلق الغان

بہ اندازِ دو شیزہ دور درپن دوپٹہ اوڑھ لیتا ہے اور ناز و نخرہ واداسے حکم دینے لگتا ہے۔
 کارِ سیاست اور ورائٹی شو کے انداز ایک سے ہو جاتے ہیں، ما قوم سایہ خدائے ذوالجلال
 کا استقبال کرتی رہتی ہے۔ اور دو شیزہ دور درپن ”برصغیر میں اسلحہ کی دوڑ“ کی چٹین و
 چٹناں کے لئے دوپٹہ چنتی رہتی ہے۔ کیا سیاست وطن نے اللہ سے کیا ہوا آئینِ اسلام
 کے نفاذ کا وعدہ پورا کیا۔ کیا اول و آخر شہری عبودیت الہی کے از روئے آئینِ وطن پابند
 اور فقط حاکمیتِ رب العالمین کے دستور کے علمبردار ہوئے۔ عوام کے سرچشموں سے
 قوت چرانے والو! کیا حقِ قانون سازی صرف حقِ خالقِ کائنات تسلیم کیا گیا۔ تم نے
 کبھی سوچا کہ مقاصد و رہنمائے خالق سے بے بہرہ پروردہ افرنگ تخلیق اگر اپنے لئے
 خود ہی قانون بنانے لگی تو کیا ہوگا۔ جس خالقِ کائنات نے آئین و قوانین قرآن نازل کئے،
 اس کی وسعتِ نظر میں تمہارا زمانہ نہیں تھا۔ کیا کوئی راہ زن عصمتِ زناں، تارک
 و منکرِ حاکمیتِ احکامِ الہی، حکمرانِ وقتِ رجم ہوا۔ کتنے امراء کے لئے ”جلدوہ“ کا
 حکم صادر ہوا۔ کتنے جہانگیر نو تمہارے تصنیف کردہ آئین و قوانین نے پیدا کئے۔
 کتنے مان سنگھ بہنوں کی ڈولیاں اٹھائے بیرونِ دربار اکبری اذن باریابی کے
 منتظر رہے۔ شریکانِ حکومت کی کتنی زیب النساءوں کے اذہان میں دیگیں اُبلتی
 رہیں۔ کیا تمہارے آئین نے اس کا کوئی سدِ باب کیا۔ کیا تم اس لئے نصیریاں تھامے
 خاموش کھڑے رہے کہ مالک الملک شکوہ نہ کرے کہ کیوں ہمارے اولی الامر کو
 دق کرتے ہو۔ کس نے اسے عہد شکن مضمنین آئین و قوانینِ مملکتِ خداداد! یہ خطبہ
 صادر فرمایا کہ میری اطاعت میرے مطیع اللہ رہنے تک ہی عوام پر فرض ہے۔
 اے پُرا ز شکوہ غاصبانِ سیاستِ مشکوک تم نے آج تک کسی پُرا شکوہ سے اس خطبے
 کے آئینی اجراء کا مطالبہ کیوں نہیں کیا، کیوں شکوہ نہیں کیا کہ دستورِ حکومتِ الہیہ
 کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اے بے زبان آئینِ خود نوشتہ کے عرض مندو!

تادم ہذا، کتنے سربراہانِ حکومت برسرِ مجلسِ بوقتِ حکمِ جہاد مثلِ عمرؓ بدوؤں کے سامنے جوابدہ ہوئے۔ کب طالبانِ عہدہ کو سرفراز کرنے سے انکار ہوا۔ کیا طالبانِ وزارت بسلسلہ امیدواری سیم و سنگین کے سہارے انتخاب نہ لڑتے رہے۔ کیا کبھی مقامِ تکریم کا اسلامی معیار نافذ ہوا؟ یا ہم صرف یہ دریافت کرتے رہے کہ جس نن نے لین کی تربیت کی وہ کونسی مسجد کے حجرہ میں دفن ہے؟ کتنے کسٹن ماریں تو اسلام رو بہ مارکس ہو جائے گا؟ وہ قیصر آج کہاں ہے جو قوانین اسلام اور رومن لاء میں مفاہمت کروا سکے؟ اس رچرڈ کا پتا چلاؤ جو ہمیں تربیتِ جہاد دے سکے؟ اس مارٹن لوتھر کا جو خلفائے راشدین کی خطائیں گنوا سکے؟ اور پیغمبرِ اسلامؐ کو غیر معصوم قرار دے سکے؟ اس بے دید فیضی کا جو دیدہ ورتصیف کر سکے؟ اُن بتوں کا جو توحید کا مُنہ چڑا سکیں؟ پراٹھے کھاتے ہوئے رانا سانگاؤں کا؟ یا قوتی بناتِ التمش کا؟ تلک زہ اکبروں کا؟ مخمور جہانگیروں کا؟ نابینا شاہ جہاؤں کا؟ بل دار بلبوں کا؟ بت پرست غزنویوں کا؟ کرشن غوریوں کا؟ اُن انبائے قاسم کا جو دربارِ داہر میں کراہتی ہوئی اسلام زادیوں کا ٹھٹھ بنا سکیں۔ کیا ہماری سیاست مفکرِ اسلام کو دانت نہیں دکھاتی رہی۔ کیا ہم معتقد نہیں رہے کہ لاکھ فکرِ انسانِ نئی آئید ہو، ہم انبوہ دو صد خراں کو سلامی دیتے رہیں گے۔ کیا ہم سرابِ رنگ و بو کو گلستانِ تسلیم نہیں کرتے رہے۔ قفس کو آشیاں گرداننے پر مہر نہیں رہے۔ کیا ہم نے محض بر بنائے اوزان وزیر مقرر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جمہوریہ اسلامی میں بندے تولے جاتے ہیں۔ کیا ہم اُن گنت عہدہ داروں کے تعین پر اعتراض کے جواب میں یہ دلیل نہیں لاتے رہے کہ اسلام میں بندوں کو گنا نہیں کرتے۔ کیا ہم نے کبھی یہ تسلیم کیا کہ سیاست کو اگر اصولِ تسلیمِ رضائے الہی سے، دینِ اسلام سے علیحدہ کر دیا جائے تو سرفِ جلالِ بادشاہی ہو یا جمہوری تماشاً ہو، فرق صاف

ظاہر ہوتا ہے اور ماسوا چنگیزیت کے اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ کیا ہم جان پائے کہ جہاں ماسوا اللہ کے کسی اور کی حاکمیت بھی تسلیم ہو، وہاں اسلام کی، لا الہ الا اللہ کی عملداری نہیں ہوتی، صرف ہلاکو چنگھاڑ رہا ہوتا ہے۔ کبھی ہم نے غور کیا کہ جس دین میں پیغمبر بھی "عبدہ" ہو اس کے پیروکاروں کا سیاسی مسلک کیا ہونا چاہیے۔ کیا ہم نے سیاسی طور پر کبھی یہ تسلیم کیا کہ سروری صرف اس ذات بے ہمتا کو زیبا ہے، باقی سب بتان آزر ہیں۔ کیا ہم ابلیس کی "اذان الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر"، پر لیک نہیں کہتے رہے۔ کیا ہمارا سیاسی قیام، رکوع و سجود اسی اذان کا پرکار نہیں رہا۔ کیا ہمارے سیاسی راہنماؤں نے ذہناً، فکرًا، عملاً ہمارے منکر کی پُر اصرار اور پُر اسرار تردید نہیں کی۔ کیا ہم شرعی عدالتوں میں کھڑے ہو کر علی الاطلاق اس کی فکر کی تردید و نفی نہیں کرتے رہے۔ ابن الوقت تو کجا ہم تو ہنگامِ وقت کے پوتے بن گئے۔ کیا ہم نے اس فکر کی تردید نہیں کی جو ہماری یہود و نصاریٰ و ہنود سے آزادی کا باعث بنی۔ ہارون سے ہی نہ کہے، فرعون سے بھی جا ملے۔ کیا ہم نے ملت کو جماعتوں، گروہوں اور فرقوں میں تقسیم نہ کیا اور اس کا جواز صحابہ کرام پر بہتان تراش کر نہ ڈھونڈھا۔ کیا ہم غیر صائب کثرت رائے کی کسرتِ عمل پر صادم نہ کہتے رہے۔ کیا ہمارے اذہان کا نزلہ ہمارے قلوب پر نہیں گرتا رہا۔ کیا ہمارے جمعِ مال پر کائنات "د فویل"، نہیں لپکارتی رہی۔ ہم تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ پر پا کرنے والوں نے کس روز خلافتِ رسولؐ کا مطالبہ کیا۔ کیا ہم نے بیک وقت نفاذِ نظامِ مصطفیٰؐ اور سجالی مغربی پارلیمانی جمہوریت کا نعرہ لگا کر انتہائی سیاسی منافقت اللہ اور اس کے رسولؐ سے نہیں کی۔ کس روز ہم نے یہ یاد دلایا کہ اسلام کے قیامِ خلافت اور انتخابِ خلیفہ کے متعین اصول ہیں۔ کیا ہم خود ہی نہیں الاپتے رہے کہ اسلام میں کوئی مقررہ طریقِ انتخاب نہیں۔ کبھی جواب لائے؟ کہ آئین میں، دین میں، طریقِ انتخاب نہیں ہوتا، اصولِ انتخاب متعین ہوتے ہیں جیسے مغربی جمہوریت کے اصولِ انتخاب

ایک ہی ہیں، طریق انتخاب جگہ بہ جگہ مختلف ہے، وقتاً فوقتاً مختلف رہا ہے۔ کس روز ہم نے مطالبہ کیا یا اہتمام کیا کہ ایسا نظام نافذ ہو کہ خلیفہ وقت اور عام شہری کے حقوقِ عبدیت میں کوئی فرق نہ رہے۔ ہم تو اسلام کا آئین نافذ کئے بغیر اسلام کے قوانین نافذ کرنے کے ناقص طریق کار کی تعریف میں رطب اللساں رہے۔ گاؤں کا نمبر دار خلاف شرع ہر عمل کرنے کے بعد مسجد میں نماز پڑھنے اور چنڈہ دینے آگیا اور جاہل ملاً خوشی سے پھول گیا۔ مبارک دینے لگا کہ کار سازی خداوند تعالیٰ پر کھو، سجدہ شکر بجلاؤ کہ شان مسجد دوبالا ہو گئی ہے۔ کیا ہم نے گزشتہ چونتیس برسوں میں یہ چاہا کہ انسانوں کے بنیادی حقوق جو از روئے اسلام حالت جنگ میں بھی سلب نہیں ہوتے، مصلوب نہ ہوں۔ ہم میں سے تو ہر ایک نے ضابطہ فوجداری سے ۱۴۴۷ دفعہ مار کھائی اور جب بھی ہمیں موقع ملا ہم نے اسی کے ہاتھ پاؤں مضبوط کئے فقط بیکرسی کو مسلح کیا۔ ہمارا سیاسی تنفس اشک آدرگیس پھیلاتا اور ہمارے سیاسی نتھنے بارہ بور کی ڈبل بیرل بنے رہے۔ سیاست چند خانوادوں کی باندی اور منطومیٹ ورثہ عوام بنی رہی۔ کب اور کس دن ہم نے انسان کو اس کی صفات کے واسطے سے جانا۔ کس روز ہمارے کسی عمر رض نے ہمارے کسی بلال کو سیدنا کہا۔ مرید سادہ تو رورو کے تائب ہوتے رہے، کسی پیر کو یہ توفیق کیوں نہ ہوئی کہ اپنے بجلی کے چراغ مریدوں کے مٹی کے دیوں سے تبدیل کر لیتا۔ بے علم اپنی بے علمی کی لاج تو رکھتے رہے، عالموں نے دین و ایمان کی منڈیاں کیوں قائم رکھیں۔ اسلام تو گنجا، ہمارے ہاں تو شوٹلزم بھی جب بھی پٹاخی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی جیب سے ہی پٹاخی۔ عطر آلود چمکیلے موٹے دراز کے سائے میں ابطان پھولتے رہے۔ گولیوں کے لئے سینہ جب بھی کھلا، کسی علم دین کا ہی کھلا۔ کون جواب دے گا کہ تاریخ اسلامیہ سے خالد بن ولید اور طارق بن زیاد کیوں چھن گئے۔ جانتے ہو تم سے غلطی کیا ہوئی۔ ہم نے راگ بدلاتھا، تم نے ساز بدل دیئے اور زمانے نے سازندے بدل ڈالے

چنانچہ جمہور تو بجال ہو جائیں گے۔ تمہاری مغربی پارلیمانی مسیحاٹی شاید بغیر وعدہ والسی
مقام بلند پرائیڈی گئی، اگر کبھی بجال بھی ہوئی تو آثار ظاہر ہیں۔ اسے تم بجال کرو
یا کوئی اور وہ نہیں ہوگی، جسے تم حسبِ عادت بے حال کر سکو۔ اگر ایمانداری سے اسی
جمہوریت ہی کی بجال درکار ہے تو کیا عہد کرو گے کہ اگر تم اہل نہ پائے گئے تو یہ ناگوارِ خاطر
نہیں ہوگی۔ واقعاتِ گزشتہ تو قسم کھاتے ہیں کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔ شاید پھر حُب
اسلام کا نعرہ لگاؤ گے۔ لیکن یہ صدا ب یاد رہے کہ جو کوئی نا عاقبت اندیش تاریخ میں
کبھی بھی اپنے نفاذِ اقتدار کے لئے نفاذِ اسلام کا نعرہ لگائے گا، خود مقتدرِ مطلق ہونے
یا رہنے کے لئے اقتدارِ اسلام کی بات کرے گا، رسم فاتحہ کی اس لئے تلقین کرے گا
کہ اس کے گھر پلاؤ زردہ پہنچے، تبلیغ و تعلیمِ دین کی بات اس لئے کرے گا کہ خطیب
قاضی، مشیر یا رکنِ مجلسِ شوریٰ، مجوزہ متعین ہونے کی چٹکیاں لیتی ہوئی خواہش اُسے
دربارِ تابِ سخن نہ دارڈ کا منعتی نہیں تو طلبہ بردوش تو بنا ہی دے، مایوس ہی رہے
گا اور فرزندانِ تثلیثِ میراثِ خلیل پر یوں قابض ہو جائیں گے جیسے مخصوص حالات
میں زاعنون کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن آجایا کرتے ہیں۔ قرآن و سنت نہ سہی،
خدا لگتی کہو، تمہارے کون سے آئین نے فکرِ اقبال کو مصدق قرار دیا۔ کون سے ضمن
میں تم نے اس کے الحذر کو سمویا۔ کونسے آرٹیکل نے اس کے مغربی جمہوریت سے گریز کو
فکرِ درست قرار دیا۔ کس آئین نے منعمون کو مال و دولت کا امین قرار دیا، گداٹے راہ
نشین کو اسلوبِ سلطانی سے آشنا کرنے کا سامان مہیا کیا۔ کہاں دل کی آزادی کو
شہنشاہی اور شکم کو سامان موت گردانا گیا۔ ہماری امامت سلاطین کی پرستار کیوں
رہی۔ دل کے آئینے میں تصویرِ دوست کیوں نہ اتر سکی۔ ہم حاضر و موجود سے بیزار
کیوں نہ ہوئے۔ تم احساسِ زیاں دے کر ہمیں گرما کیوں نہ سکے اور خود فقر کی سان
پر چڑھا کر تلوار کیوں نہ ہوئے۔ کیا صرف اس لئے نہیں کہ ہماری سیاست عہد شکن ہے

اور کسی عہد شکن کو کیا حق ہے کہ وہ کسی سے ایسے عہد کا طالب ہو۔ لہذا سیاست چھوڑ، ادیب بنو کہ جو وعدہ و فائدہ کرے وہی محبوب رہے اور ہر نئی وعدہ شکنی پر تمہارے ساتھ محبت مزید ہوتی رہے۔ تم بوسہ کی پوچھتے رہو اور وہ تمہیں غنچہ نوشکفتہ دکھاتا رہے۔ تم بزم یار کے غیر سے تھی ہونے کا مطالبہ کرتے رہو اور ہر ستم ظریف تمہیں سر بزم اٹھا کر تمہیں ہی دکھاتا رہے کہ یوں! اُسے پیار پر غصہ اور تمہیں غصے پر پیار آتا رہے۔ وہ رات کو رقیب سے خواب میں ملتا رہے اور اس کے دکھتے پاؤں دباتے تمہارے ہاتھ پاؤں پھولتے رہیں۔ تم محروم اقتدار سیاست دانوں کی گروہ بندی کے مقابلے کے لئے بے ریوڑ چرواہوں کے اتحاد کے لئے کوشاں رہو اور چراگا ہوں کو نت نئے ایل۔ ڈی۔ اے پلاٹوں میں تقسیم کرتے رہیں کہ اپنے ہی وطن کی سر زمین کا نیلام عام بڑا محفوظ مشغلہ ہے۔ جب میرے وطن کا کوئی پلاٹ بکتا ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ اس کے خریدار کو وطن سے زیادہ کہیں پلاٹ سے محبت نہ ہو جائے ”میرا وطن! میرا پلاٹ“ ماہرین نفسیات بتائیں، میں کس کو پہلے بچاؤں گا۔ کہتے ہیں انسان جب زمین کا مالک ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو کائنات اُسے زندہ کفن پوشوں کی فرست میں شامل کرنے کا حکم صادر کر دیتی ہے۔ تمہاری اپنی ہی عہد شکنی تمہیں لے ڈوبی۔ مجھے یہ نوشتہ دیوار دیکھ کر خوف بھی آتا ہے اور ترس بھی کہ تمہاری سیاست کی مسیحا کی کو دوبارہ زندہ ہونے کا اعجاز میسر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اعلان ”ما قتلوه و ما صلیوہ“ ہوتا رہے گا اور تم قصر سیاست میں شہتیروں کے ساتھ بندھے ”تجری“ بھی رہو گے اور تمہارے واسطے سے تجارتِ اقتدار بھی ہوتی رہے گی۔ ہر تحریکِ بحالی جمہوریت کو بے حال کر دینے کے ماہر سیاست دانوں کو ان کی اپنی ہی سیاست و سیادت نے کچلا ہے۔ جن راہوں کو ہموار کر دینے کے یہ متمنی تھے، وہ بوجہ خرابی نیت گم ہی نہیں ہوئیں، چھن بھی گئی ہیں۔ اب سفر بے منزل سے کیا ہوگا۔ اتحادِ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے

افتراقیوں کے دعوت نامے ہرگز غلط پتوں پر تقسیم نہیں ہوئے۔ اب اتحاد نو کرو یا
اشتراک محدود، ڈھاک کے پات چار نہیں ہوں گے۔ جبہ دستار جھکریں گے تو ٹوپی
اور کلتی بھی پھد کے گی۔ فطرت کبھی قبول نہیں کرے گی کہ نظام مصطفیٰ کا مغربی جمہوریت
سے بقدر تمہاری عقل و قد و کلاہ و طرہ بھی واسطہ ہے۔ خود کو بدلو ورنہ ”دنے پر پروانہ
سوزد“ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ہو سکتا ہے جس ملک کے وجود کی اہمیت کو نابہی خواہوں
نے بھی ناچار تسلیم ہے، اسلام کا نظام سیاست و حکومت باوجود ہزار نااہلی اور صد ہزار
ریشہ دوانیوں کے اس کا مقدر بھی بن چکا ہے۔ تمہیں تمہارے لب خزاں اور تبسم گریاں
کی قسم! وعدہ کرو کہ نظام اسلام میں اگر تم نااہلی قرار پائے گئے تو سینہ کو پی نہیں کرو گے
ہو سکتا ہے افلاک سے نالوں کا جواب آنے لگے خلوت کی گھڑی گزر جائے اور تمہاری
سیاست کی آغوشِ سحاب بجلی کے کوندوں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ ہو سکتا ہے دانش
مردہ نے بحضورِ خالق یہ تسلیم کر لیا ہو کہ نظام مصطفیٰ اس سرزمین کا ثانوی مسئلہ نہیں
ہے اور سجالی جمہوریت کو اولیت دینے کا تقاضا ۱۹۷۷ء کی نسائی سیاست
کا سہو عورت تھی۔ اور ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو قومی اتحاد کے خفیہ اجلاس کے ماسوا ایک
کے تمام اندازے غلط تھے اور اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جاتا تو اس وقت کی مقتدر سیاست
آج دنیا بھر میں کارکنوں کے لئے ہی نہیں، بہی خواہوں کے لئے بھی ترس گئی ہوتی۔ ہم اگر
نظام مصطفیٰ سے واقعی اخلاص کا مظاہرہ کرتے، تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے مقاصد کے
ذاتی اغراض کے لئے اغماض نہ کرنے تو آج کسی جبر و اکراہ کے استعمال کے بغیر ہی
سیاستِ مصطفیٰ کا ایک بھی مخالف نہ رہتا، اور یہ فتویٰ صادر کرنے کی ضرورت
نہ رہتی کہ اس ملک میں نظریہ پاکستان کی حامی اور مخالف جماعتیں موجود ہیں جن
کے درمیان زور آزمائی کے لئے سیاسی پابندیوں کا بوجھ تھوڑا سا اوپر اٹھالینا چاہیے
کہ ہر خریہ سیاست کی کمر دوہری ہو چکی ہے۔ آؤ! اسلامی خلوص کا مظاہرہ کریں اور تسلیم

کریں۔ کہ سیاستِ اسلام میں اسلامی معاشرہ کو جماعتوں، فرقوں، گروہوں میں تقسیم کرنا غلط ہے۔ نظامِ اسلام میں صنعتی مزدور سرمایہ کار کے ساتھ نفع و نقصان میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ زمین صرف اللہ کی ہے۔ جو اُسے کاشت نہیں کرتا اُسے اس کو اپنی تحویل میں رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ مال و زر پر ہمیں صرف اپنی جائز ضرورتوں کی حد تک حق تصرف ہے۔ اسراف اور تعیش کا رِشطان ہیں۔ جو لوگ زکوٰۃ ادا نہ کریں، ان کے مال کی حفاظت حکومت پر فرض نہیں۔ حاکم کا ذاتی معیارِ زندگی ایک اوسط درجہ کی آمدن والے شہری سے بلند نہیں ہونا چاہیے۔ ماسوائے اللہ کے اور کوئی سرچشمہ طاقت نہیں۔۔۔۔۔ نہ عوام، نہ بیوروکریسی، نہ کوئی اور ادارہ۔ ہر شہری اپنے خویش و اقارب اور ہمسایوں کے لئے اور حکومت عامۃ الناس کے افلاس، بھوک اور اشتہا کے لئے جوابدہ ہے، معاشرہ کے سامنے بھی اور اللہ کے روبرو بھی۔ جہاں اصول ”العفو“ نافذ نہیں، وہاں نظامِ اسلام نہیں۔ تسلیم کریں، کہ افراطِ زر، مہنگائی اور کساد بازاری دور کرنے کا اسلام کا اپنا نظام ہے۔ اس کا اپنا نظام تجارت ہے جو منفرد بھی ہے اور ناقابلِ شکست بھی۔ یقین کریں اور یقین لائیں کہ جس نے محمد مصطفیٰؐ سے مکر کیا وہ ذلیل و خوار ہوا اور عرض کریں کہ ہم صرف نظامِ مصطفیٰؐ کے خواہاں ہیں، تبدیلی اقتدار کے نہیں۔ نظامِ سیاستِ اسلام کا تقاضا کریں۔ اور عرض کریں کہ سرکار! سے

سرمہٗ مفت ”نذر“ ہوں مری قیمت یہ ہے
 کر ہے چہنم خریدار پہ احساں میرا



جناب صدر! صادر کیا ہو گا؟

امرہم شوریٰ بینہم یا امرأہم شوریٰ بینہم

بندہ خدا نواز! یہ تقصیر فقیر ہی سہی کہ عمر بھر انسانوں کی حاکمیت میں ہی گیا۔
افرنگی امپریلزم بھی دیکھی اور مملکتِ خدا داد میں بندوں کی سامراجیت بھی۔ کبھی وکٹوریہ
کر اس پر لٹک گیا تو کبھی انکل سام کی چھڑی نے پیٹ ڈالا۔ دشت کی سیاحی میں تو
نہیں کٹی مگر خود ساختہ خداؤں کی حاکمیت کی سیاہی ہمہ وقت نقشِ پیشانی رہی۔ کوئی
تلوار اٹھائے آوارد ہوا تو کوئی کتابہ جو نوکِ قلم نے مقدر کیا تلوار نے کھرچ ڈالا اگر
کبھی تلوار نے قلم تراشا تو اپنی ہی میان پر نقش اٹھائے۔ ماسوا اس معصوم دولت
کے کہ ہر لمحہ ماں کی گود اور باپ کی چھاتی کے لمس کا احساس رہا، ہم فقیروں کے
پاس نہ کوئی سرمایہ حیات ہے نہ آٹا نہ زندگی نہ توشہ آخرت۔ لئے بھی اور لٹائے
بھی گئے۔ بھٹک کر راہِ زلوں کے ہاتھ لگے اور راہِ ناکردانے گئے۔ ذہن میں
جب بھی گیت ابھرے، دل نے نوحہ چھیڑ دیئے۔ دردِ دل سنایا بھی اور
نخیر بھی کیا۔ مگر فقط نگار انگلیاں اور خونچکاں خامہ حاصل و متاعِ حیات ہیں۔
حیران ہیں کہ دل کوروئیں یا جگر کو پیئیں۔ نہ قصیدہ گوہیں نہ ہجو نگار۔ بس شوقِ گل
بوسی میں کانٹوں پر زبان رکھنے کے سزاوار ہیں۔ دہائی دیتے ہیں تو مرصع تقریر اور

اور مرجع تحریر کی دہائی ملتی ہے۔ جب بھی کوئی غنیمت کھلتا ہے، ان کی تقصیر گم کئے
 ہوئے دل کو پاتی تو ہے مگر خون کیا ہوا ہی دیکھتی ہے۔ مینجانہ حیات میں صراحیاں
 بھرتا اور جام دھونا ہم فقیروں کے متوسط طبقہ کا مقدر سا ہو کر رہ گیا ہے۔ دورِ جام
 کبھی ہم تک آیا بھی تو اس خوف سے جھٹک دیا کہ ساقی نے شراب میں کچھ ملا
 نہ دیا ہو۔ ہم افرنگی تعلیم اور آریائی تہذیب کی گرفت میں سسکتے ہوئے انسان ہیں
 ہم میں سے کسی کو نہ زعم دانش ہے، نہ فخرِ پارسی، نہ بند قبا پرپاکی، دامن کی حکایتیں
 تحریر کرتے ہیں، نہ کلیم بوذر و دلوق اولیس کے سرقہ کی ابتدائی یا انتہائی رپورٹ میں کہیں
 ہمارا نام درج ہے۔ انسان ساختہ تاریخ ہمارے دل میں نہیں اُترتی اور جغرافیہ
 کی قطع و برید کے ذمہ دار افراد سے ہاتھ ملانے کو اس لئے جی نہیں چاہتا کہ زخم شمار
 کرنے والوں کو انگلیاں گننے کی فرصت نہیں ہوتی اور انگلیوں پر گنتا ان کی عادت
 نہیں ہوتی۔ تسبیح روز و شب کے دانے شمار کرنے پر طبیعت ضرور تھی۔ وہ بھی بس
 اتنے باقی رہ گئے ہیں کہ بن گئے بھی نبھائے جاسکتے ہیں۔ ہم فقیروں نے تھوڑی دور
 ہراک راہ روکے ساتھ چلنے کا زمانہ بھی دیکھا۔ جن کو بجلیاں خبر دیتی تھیں، بے خبر
 بھی پائے۔ راہ زلوں پر راہ نماؤں کا گمان بھی کیا۔ انسانوں کو مولانا گردانے کے
 سزاوار بھی ہیں۔ الہیات میں اُلجھے ہوئے تاویلات میں پھنسے ہوئے، راکھ کے
 ڈھیر، اپنے ہی سائے کے عقب میں بھاگتے ہوئے، انسانی ناخداؤں سے اللہ
 ڈھالتے ہوئے، راہ حیات پر سُرخ بتیوں کے روکے ہوئے، دانش افرنگ کے
 پروردہ، زمانہ حاضر کے زنا رپوش توحید پرست دانشوروں نے ہمیں وہ گداگر بنا
 دیا ہے جو ساتھی گداگروں کی جھولیوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں
 اور اس ہاتھ سے بے خبر ہوں جس نے ان کی جھولیاں بھر رکھی ہیں۔ جو ان سے بچاؤ سے
 ان لوگوں نے آلیا جو انسانوں کو لوٹتے ہیں اور ہر مال غنیمت کو فضلِ ربی قرار دے

کر، کذب و افتراء، مکر و فریب کی معاشرتی سیاسی تجویزی میں مقفل کر کے یوں
 ذکر الہی میں مصروف ہو جاتے ہیں جیسے کوئی کعبہ رو، شراب سے وضو کر کے
 کلیدِ میخانہِ مصلیٰ کے نیچے چھپا سبحان ربی الاعلیٰ پکار رہا ہو۔ اور یوں معاشرہ
 کا متوسط طبقہ جسے معاشرہ کا باعزت باوقار انسان ہونا چاہیے تھا، اُس دانشور
 کا مقدر اپنا بیٹھا ہے جس کی دانش نے اسے متنازعہ بنا دیا ہو۔ اللہ سے اور کائنات
 کی تعمیری قوتوں سے پناہ مانگتا ہو یہ متوسط طبقہ اس ملک کا انتخابی ووٹر ہے۔ رائے
 دہندگان کی فہرست میں نام درج ہے مگر کارگر، ابلیس کا وہ نامزد مزدور ہے جس
 کا کام متعین ہے اور اجرت زیر غور ہے۔ وہ مجبور و بے بس دانش فروش بن کر
 رہ گیا ہے کہ انگیخت و جبالت تک میں امتیاز اس کیلئے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔
 نوبت یہاں جا رسید کہ دنیاٹے انفاس میں تریاق کا یہ متلاشی ہر ایک سے
 پوچھ رہا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں؟ اور ہر دشمن ایمان و ایقان کی دکان سے آواز
 آتی ہے، مادھر آؤ نا! بہار میکہ نظارہ کرو۔ جاہ و وفارِ لات و منات پر نظر ڈالو۔
 پیارو! دریا ر پھر دریا رہے۔ حرم میں جز حجر اسود و لا شریک لہ رکھا ہی کیا ہے۔
 یہاں آؤ۔ تم ووٹر ہی نہیں طاقت کا سرچشمہ بلکہ سرچشمے کی قوت بھی ہو۔ ہر چند کہ رائے
 دہندہ ہو مگر میری جان۔ اہل الرائے نہیں ہو لہذا لازم ہے کہ تمہارا کوئی نمائندہ
 ہو جو تمہارے آئندہ کونائیاں و محفوظ کرنے کے لئے تمہاری قانون ساز حاکمیت
 اعلیٰ کا تعین کر سکے۔ ایسی حاکمیت اعلیٰ جو نمائندوں کے ذہنی اختلاط کی غماط ہو کوئی مختلف تمہارے برابر
 کہلوائے جو سلیمانی ٹوپی پہنے سامری سرخاب سجائے سرگرم سفرِ سیاست ہو اور
 تم چیونٹیوں کی طرح سسکتے رہو کہ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ وہ سنگ دل
 جسے تم تراش کر اُس بت کی شکل دو جو تمہارے ہی جنت سے لوڑے ہوئے فالٹو پھرو
 سے تمہیں سنگسار کرے اور تمہارا خدا بن بیٹھے۔ ٹانگ پر ٹانگ چڑھالے۔ مرنی

لبوں سے لگائے تمہارے صنم خانہ، تصور میں آسن جائے کھڑا ہو کہ آؤ مجھے سجدہ کرو۔ اور صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ کا ورد کرو کہ رند کے رند رہو اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے۔ دنیا بھی آباد رہے اور خدا بھی ناشاد نہ ہو۔ ہم پر عہدہ داری روا، تم پر عہدہ طلبی حرام، خلیفۃ اللہ، خلیفۃ الرسول، خلیفۃ المسلمین، امیر المومنین اور امیر مملکت کی اصطلاحیں لغوی معانی تک جانے بغیر استعمال ہوتی رہیں۔ اور ہر نوبت یہ رسید لائے کہ جنہیں تم مولا جانو وہ اوقاف کے ملازم ہو کر رہ جائیں۔ سلطانی جمہوریوں قائم ہو کہ غزنوی مسند آرا رہے اور سبھی ایاز ہاتھ باندھے ایک ہی صف میں کھڑے ہوں۔ ارکعتوا۔ اسجدو کے احکامات جاری ہوتے رہیں۔ قدرت انسان ملک یوم الدین اور اللہ مافی السموات و مافی الارض کی تفسیر سنتی، صدقات و خیرات و زکوٰۃ کی تلقین کرتی، ٹیکس وصول کرتی رہے۔ منافع صدقہ اور زکوٰۃ اڑھائی فی صد کا نظام جاری رہے۔ سرکار کا ہر ملازم عملاً لکھ ہزاری، بظاہر بیس بائیس درجہ کا ہی رہے مگر اس کا پارہ کبھی ایک سو دس درجہ سے کم نہ ہو۔ جو میرا ٹو کر ہے، کھائے ادھار، کرے لوٹ مار۔ جو میرا بندہ ہے، دکھے چنگا مگر پھرے تنگا، کے اصول عملاً دائم رہیں۔ حاکمیت خدا کی حکومت بندوں کی۔ حکم اللہ کا، قانون انسانوں کا۔ زمین اللہ کی مگر ملک جاگیر داروں کی، لیس للانسان الاما سنی، مگر تمام تعریفیں ان انسانوں کے لئے جو انہیں پالنے والے نہ ہوں، ان پر پلنے والے ہوں۔ ہر سیدھی راہ پر و الضالین اور ہر خطرناک موڑ پر صراط مستقیم تحریر، اطاعت انسان کی، عبادت خدا کی۔ مدد انسان سے، اعانت خدا سے۔ ہر نعمت علیہ بے سکون ہر مغضوب علیہ مطمئن۔ جس سے رائے چھین لو، اُسے رائے دہندہ کہو اور جو رائے طلب ہو نمائندہ کہلوائے۔ نہ طلب کا کوئی رابطہ نہ عطا کا کوئی وجود۔ بس تم دو ٹوٹ ہم ممبر، عوام ممبر ساز اور ممبر حیلہ شاہ ساز۔ رہے نام اللہ کا۔ مگر نظام مغربی

جمہوریت کا جس میں سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کے لئے پالے ہوئے قربانی کے
 بکرے کو سیاسی کارکن اور روزِ جنگِ خفیہ رائے دہی کے لئے استحصال شدہ روپا ہوں
 کو رائے دہندگان کے حسین ناموں سے لپکا جاتا ہے۔ وہ نظام جس میں بندوں
 کے ذریعہ بندوں پر بندوں کی حاکمیت قائم کرنے کا رائے دہندہ صلیب پر لٹکائے
 جانے سے پیشتر جو وصیت تحریر کرتا ہے، اُسے بیلٹ پیپر کہتے ہیں اور جس تاریخ
 کے حق میں تحریر کرتا ہے اسے رکنِ اعضاءِ مجالسِ آئین و قانون کا اعزاز عطا ہوتا
 ہے۔ اسی مغربی جمہوریت کا نظام نافذ رہنے دو کہ زمانہ ترقی کر بھی گیا ہے اور
 ترقی پسند بھی ہے۔ رجعت پسند نہ بنو۔ یہ جنوں تو دل شکستگی کا نظام ہے امرِ ہم شوریٰ
 بینیم سے امرِ اٹھم شوریٰ بینیم کا نظام کہیں بہتر ہے۔ ان صیب آوازوں میں گھرے
 ہوئے افراد پر جناب صدر آپ جو بھی صادر فرمانا چاہتے ہیں، فرمائیے۔ جو بھی
 عنایت ہو قہر درویش برجان درویش تھا، ہے اور رہے گا۔ مگر منکہ ایک دوڑا
 ایک رائے دہندہ جس کا نام فرست رائے دہندگان میں درج ہو چکا، اُس بکرے
 کی ماں کی طرح جو مارچ ۱۹۷۷ء میں الیکشن کے مذبح میں گئی اور واپس نہ آئی، مانہ معلوم
 زیر احتساب ہے یا حساب چکا چکی، سوچ رہا ہے کہ پھر یومِ انتخاب قریب ہے۔ اگر
 مغربی جمہوری طرز ہی طرح دار رہی تو کوئی دن جاتا ہے، رقیبانِ امان جان کاغذاتِ
 نامزدگی داخل کریں گے، قاتلانِ اخلاق و معاشرت و معیشت مجھ قربانی کے بکرے
 کو سبز باغ بھی دکھائیں گے اور سرخ نوٹ بھی، اور میری ہی طرح میاٹیں گے بھی، کہ
 من ترکِ نمی داندم کی دلیل کہہ بھی نہ لائی جاسکے اور کہیں گے، ووط تمہارا حق ہے۔۔۔
 تمہارے پاس ہماری مقدس امانت ہے جو تم نے مارشل لاء کے پھرتلے سات سال سے
 چھپا کر رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے بکرے ہم ہی تمہارے شیر ہیں، باقی ہیر پھیر ہے۔
 تازہ خبر آئی ہے، تو ہمارا بھائی ہے۔ یہ سبھی انتخابی نشان ہمارے چہروں کے مختلف

پوز ہیں۔ ہر امیدوار کہے گا، میں ہی گھوڑا ہوں، میں ہی شیر۔ میں ہی کتاب ہوں، میں ہی تلوار۔ جدھر دیکھو گے صرف میں ہی میں ہوں۔ اس لئے کہ آج کل میں جدھر دیکھتا ہوں فقط تو ہی تو ہے۔ میں امیدوار نشان یافتہ ہوں۔ گھوڑے، شیر، کتاب، تلوار، قلم، دوات، تانگے، موٹر پر نشان لگاؤ گے، منتخب انسان ہو جائے گا۔ کتنا بڑا اعجاز ہے۔ یہ اور اعزاز بھی کہ نشان گھوڑے پہ لگے اور منتخب انسان ہو جائے۔ اس لئے اے میرے بکرے، آ ایک گھاٹ پر کوا کولا پٹیں۔ اقبالؒ تو محض فلسفی تھا، شاعر مشکل گو تھا۔ کہ لکھتا رہا کہ آئین پیغمبر ہی مشکل کشا ہے، ہر نوع غلامی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ کہ نہ کوئی فغفور و خاقان، نے فقیر را نشیں۔ حالانکہ بات سیدھی سی تھی کہ نہ تو اہل الرٹے ہے، نہ میں عہدہ برائوں۔ تو رٹے دہندہ ہے، میں عہدہ طلب ہوں۔ تیرا میرا طلب و دہد کا رشتہ ہے۔ تو میرا مال ہے۔ مال مولشی والا۔ اور میں سیاسی سامریوں کا بقر ہوں۔ میری عبادت ہوتی رہے گی۔ موسیٰ اور خدا میں مذاکرات ہوتے رہیں گے۔ قوم میرے ہاتھ میں ہوگی، اور ہارون کی ریش موسیٰ کی مٹھی میں۔ میں تیرا خادم ہوا، تیرا چارہ گر۔ پیٹ بھر کر چارہ کھا اور پی۔ پہلے گنگنا، ہنگامہ سا بپا کیوں ہے تھوڑی سی جو پی لی ہے۔ ڈاکہ تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی ہے۔ اور پھر لڑکھڑا کر میرے حق میں زور سے زندہ باد پکارا۔ کہ آج کے بعد تو مر جائے گا، میں ہی زندہ رہوں گا۔ تیرے ساتھ یہ سبھی لوگ نعرہ زن ہوں گے۔ سو روپے یومیہ اور کھانے پینے پر لایا ہوں۔ یہ سب ناجائز اسلحہ سے مسلح ہیں۔ لہذا اے میرے دل نشین ووٹر میرے ساتھ چند قدم چل۔ علاقہ از خود صاف ہو جائے گا۔ بس ذرا اتنی احتیاط رہے کہ پرچی واپس لا کر مجھے دینا۔ اس لئے نہیں کہ تم پر اعتبار نہیں، اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ نظام معزنی جمہوریت میں امیدوار اور ایمان کبھی یک جا نہیں رہ سکتے۔ ادھر عہدہ طلبی وارد ہوتی، ادھر

ایمان زھوفا ہوا۔ یہ پیشگی لے ، باقی اس ہاتھ پرچی دینا ، اُس ہاتھ لے لینا۔ میرا
 سب مال میرے بھائیوں ہی کے لئے ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ، فقط قوم کی
 خدمت کا امیدوار ہوں۔ قوم ہوگی تو میں ہوں گا اور قوم نہیں ہوگی تو میں تو گزارا کر
 ہی لوں گا ، تم رائے دہندگان کا کیا ہوگا۔ گزشتہ الیکشن میں پندرہ لاکھ اٹھ گئے
 تھے ، اللہ نے پندرہ کروڑ کر دیئے۔ حالانکہ حزب مخالف میں تھا مگر حکومت تو میری
 مخالف نہیں تھی۔ اگر حزب اقتدار میں ہوتا تو کیا کیا وارے نیارے بن ہوتے۔ بس
 کچھ اہل خانہ و خاندان حزب اقتدار میں تھے ، اس لئے میرا حزب اختلاف میں رہنا
 ضروری تھا ورنہ اختلاف کس کو تھا۔ قومی ترقی کے لئے کم از کم پندرہ کارخانے لگانا
 ہماری خاندانی منصوبہ بندی ہے۔ پلاٹ و لاٹ تو خیر افسران خود ہی دے دیتے
 ہیں ، اللہ کا کرم ہے تاہم کچی آبادیوں کی بات کرتے رہنا بھی ضروری ہے۔ غریبوں
 کی تو ازل سے یہی عادت رہی ہے ، ان کی غریبی کا ذکر کر دو ، یہ سمجھتے ہیں ، غریبی
 ددر ہو گئی اور مگر چھپوں سے بغل گیر ہو کر رونا شروع کر دیتے ہیں اور اتنا روتے ہیں
 کہ کچی آبادیاں تر بتر ہو جاتی ہیں۔۔۔۔۔ اور سن اگر تونے ووٹ نہ دیا تو جان رکھا
 کہ سمندر میں رہ کر مگر چھپوں سے بے تاریخ میں کسی کو بھی راس نہیں آیا۔ چوری کروا
 سکتا ہوں ، ڈاکہ ڈلواسکتا ہوں ، چھرا مروا سکتا ہوں۔ جھوٹے مقدمے
 میں ملوث کروا سکتا ہوں۔ چار دیواری تڑوا سکتا ہوں ، چادر اتروا سکتا
 ہوں۔ سیاست دان نیکی و بدی کے جھمیلوں میں نہیں الجھا کرتے۔ سن ! نکل
 جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں ، فقیر مصلحت بین سے وہ رند بادہ
 خوار اچھا۔ کالی دینے کو جی چاہے مگر کالی نہ دینا شرافت نہیں ، منافقت ہے۔
 تین سو برقع سلوا لئے ہیں ، رنگ بے رنگ کے ، کارپین ، پستول ، ٹین گنوں
 کی بھی اب کوئی کمی نہیں۔ شعلہ بیان مقررین کا بند و بست بھی ہو چکا۔ دو ہزار میں

اچھا بکرا مل جاتا ہے اور پانچ چھ سو میں اچھا مقرر دستیاب ہے۔ جھنڈے، بینرز
 کتے تو خیر معمول کی بات ہے۔ الیکشن بھی ایک بزنس ہے۔ سیاست میرا شوق نہیں
 پیشہ ہے۔ جانو! ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے۔ لہو پی کر درس مساوات
 سیاست کی ابجد ہے۔ اسمبلی ہال کو مفکر پاکستان نے سرمایہ داروں کا تکیہ لونی
 قرار نہیں دیا تھا۔ اسلام والے تو دس دنیا اور ستر آخرت کی بات کرتے ہیں،
 جمہوریت کا موجد تو ایک کے ہزار کا داعی ہے۔ اسی لئے تو چھٹتی نہیں ہے منہ سے
 یہ کافر لگی ہوئی۔ امرہم شورعیٰ بنیم اساس آئین اسلام تھا۔ خود جمہوری ہیروئن کے
 عادی اسلام پسندوں نے اسے امرہم شورعیٰ بنیم میں ڈھال کر اسلامی جمہوریت
 کا نام دے دیا۔ لو! سوچتے رہو۔ اسلام ترک ہوا کہ مغربی جمہوریت متروک ہوئی۔
 جمہوریت کا کیا بگڑا۔ سگریٹ کی ڈبیا پر ”خبردار! تمباکو نوشی صحت کے مضر ہے“
 تحریر کروا دینے سے تمباکو نوشوں کا مزاج تو نہیں بدل جاتا۔ طریقی انتخاب مغربی
 جمہوری ہو، تو جمہوریت کو کسی خطرہ کا اندیشہ نہیں۔ لوگ انتخاب کا مطالبہ یوں ہی
 کرتے رہیں گے جیسے نشہ ٹوٹ رہا ہو۔ لاکھ اسلام کا واویلا ہو مگر اے راحت
 جان دشمن ایمان مغربی جمہوریت! کون تجھے مہلا سکا، کون تجھے مہلا سکے۔
 ادھر انتخابات کی آمد آمد ہوئی، ادھر اسلام کے لئے رفت رفت کا نقارہ بجا امیدوار
 اور لائے دہندہ ہر دو جھوٹے وعدوں، منافقت، بے یقینی، شکوک و شبہات، سودا
 بازی، جوڑ توڑ، نفرت، کدورت، تفریق و تقسیم کے صید ہوئے۔ متحارب امیدوار
 کون سی مخاصمانہ و رقیبانہ حرکت روا نہیں رکھتے۔ دونوں رقیب، ایک دوسرے
 کے لئے رو سیاہ۔ پورا معاشرہ ان کی حملیت و مخالفت کے شوق میں تلاطم و
 تصادم کے بھنور میں گھوم جاتا ہے۔ متفکر انسان کی فکر اس کے اپنے ہی جسم کا
 ناسور ہوتی ہے۔ پھر منتخب ہو جانے کے بعد اپنے ہی پارٹی لیڈر سے سودا بازی

قیام و انہدام کے لئے جوڑ توڑ، سیاسی رشوت کے صدر دروازے چوپٹا کھول دیتا ہے۔ اٹھائے جانے والے ہاتھ ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں۔ ڈاکو پستول دکھا کر ہینڈ زاپ کرواتے تو دیکھے ہی ہوں گے روپیہ دے کر ہینڈ زاپ کروائے ہوئے اصل دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ اس معاشرہ کے ہر فرد کے قلب و ضمیر پر اس نظام انتخاب نے کیا کیا داغ دیئے، کسے معلوم نہیں۔ اولاً تو اس کا سدباب کیا ہی نہیں گیا۔ اگر کوئی مرہم تحریر ہوا تو قطع نظر رہا کہ زخم کے بھرنے تک ناخن بھی تو بڑھ گئے ہوں گے اور معاشرہ زخموں سے گرے ہوئے نمک کو پلکوں سے چھٹنے کا عادی ہو گیا ہوگا۔ بندوں کی حرصِ حاکمیت، مغربی جمہوریت کی جنم داتا ہے۔ جسے حاکمیت کی لت پڑ جائے، اس کی عبدیت کا بوند سے اٹھنا لازم ہے۔ جناب صدر! آپ ترکیب شوریٰ کر لسی کے خالق ہیں۔ متوسط اذہان خائف ہیں، حق و باطل کی یہ آمیزش دوئی پسند بن جائے۔ مندرجہ بالا جملہ بدعتوں کا علاج قیام صلوٰۃ، نظام مشاورت، انفاقِ رزق اور تسلیم حاکمیت الہی ہے۔ قل اعوذ برب الناس۔ ملک الناس۔ الہ الناس۔ میرا رب۔ میرا ملک۔ میرا الہ اگر اللہ ہے۔ تو سربراہ مملکت صرف خلیفہ ہیں، حاکم نہیں۔ اہل کار کا زندہ خدا، منتظم آئین پیغمبر۔ اگر یہ کلید صحیح ہے تو پھر مغربی جمہوری نظام محض ایک دوسرہ ہے۔ جمہوری طریقِ انتخاب، النخاس الذمی یوسوس فی صدور الناس۔ مغربی جمہوری طریقِ انتخاب ایسا ہی ہے جیسے وسوسوں سے شکار کرنے والے چتوں اور انسانوں کی مشترکہ حکومت انسانوں پر نافذ کر دی جائے۔ جناب صدر! اگر آپ نے بھی عہدہ طلبی، مہم جوئی، تفرقات و منافرت کا مغربی جمہوری طریقِ انتخاب ہی نافذ کرنا ہے تو یہ حکم صادر فرمادیجئے کہ اسلام کے نظام مشاورت کے حامی سزائے موت کے سزاوار ہوں گے تاکہ کچھ لوگ خودکشی

کے بجائے قانون کے ہاتھوں مر سکیں۔ معاشرتی قتل و غارت کی بجائے اُس
 کرب سے نجات حاصل کر سکیں جس میں وہ بنام ترقی یطر زغلامی گرفتار
 ہیں، متوسط طبقہ کا دانشور اس نظام کے ہاتھوں جیتے جی مر چکا۔ اگر آپ اسے
 زندہ خیال فرماتے ہیں تو یہ سہو ہے۔ اس مرگ انبوہ کا دعویٰ کس پر ہوتا
 چاہیے، سزاوار کون ہے۔ عوام، نظام مارشل لاء یا مغربی جمہوریت۔ اگر آپ
 نے مغربی جمہوری نظام انتخاب ہی نافذ رکھنا ہے۔ تو اعلاناتِ ملتان و پشاور
 واپس لے لیجئے اور ہم فقیرانِ پُر تقصیر کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بھی آئیے گا
 کہ ہماری میتیں بھاگ کھڑی ہوں گی۔ پر دلو کول تو یہی تھا کہ جان کی امان مانگوں
 مگر مغربی جمہوری نظام کے طفیل جان تو ہے ہی نہیں۔ اور سانس کو کسی امان
 کی ضرورت نہیں۔



پرانی سیاست گری خوار ہے یا مگر؟

قومی اسمبلی کے انتخابات میں عوام کی شرکت، حکومت کی خلاف دستور زمانہ، گمانِ حاضر و ایات سابق غیر جانبداری، پیشہ ور، اجارہ دار بزرگ سیاست دان طبقہ کا سائنٹفک استغناء، سیاسی جماعتوں کے دفانا آشنا ارالین مجلس شوریٰ کی زیر و زبر و پشت و پیش رفت، وزراء کے مملکت کی وزرائی صوبہ ذاتی سیاست کی کوچہ رقیب اور کوٹے دوست میں ہمہ گیر رسوائی، امر اور نو اور امیرانِ کہن کا بے اثر اشتہاری اخراج، سیکولرزم، سوشلزم، عدم تعاون اور بائیکاٹ کی مرگِ انبوہ کے باوجود صدرِ نو منتخب کی قائدانہ اور سالاری صلاحیتوں کی ذمہ داریوں میں جو محسوس وغیر محسوس اضافہ ہوا ہے، اس کے پیش نظر جائے پناہ ماسوار لیفرنڈم کے ذریعہ حاصل کئے گئے انتداب کی پابندی و پاسداری کے اور کہیں شاید ہی مل سکے۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب کی پر امن کوتاہی ہائے کوتاہ ساز کے ارتکاب کے باوجود دانائے سبیل، مولائے کل ختم الرسل کی عفو بندہ نواز کے دروازے کھلے ہیں۔ کہ ان کا کھلنا ہی دانش الہی اور رحمت اللعالمین کا تقاضا اور اسلوبِ فطرت ہے۔ تاکہ مصلحتوں کی ابن الوقتی کی جراحی بھی ہوتی رہے اور نیتوں کی اصلاح کا ادراک بھی ہوتا رہے۔ قوموں کی

زندگی میں طرز کہن پہ اڑنا اور تعمیرِ نو سے ڈرنا کٹھن منزل ہوتی ہے۔ بڑی کٹھن منزل، جو آبِ عزم صدر مملکت کو درپیش ہے۔ ہر چند کہ پرانی سیاست گری خوار ہے اور آثارِ واقع ہیں کہ جہانِ نو پیدا ہو رہا ہے اور عالمِ پیر مر رہا ہے جسے فرنگی نواز مقامروں نے قمار خانہ بنا رکھا ہے۔ لیکن ہر تدریجی مادی انقلاب کے لئے ایک پر عزم چوکس نگرانِ قوت کا ہونا لازم ہے۔ وہ انقلاب جو انسان اپنی صوابدید کے مطابق استحصالِ انسانیت کے ذریعے برپا کرتے ہیں، دراصل انسان کشی سے متصل ہوتے ہیں۔ ہر انقلابی انسانی اذہان کا شکاری ہوتا ہے اور ہر ارتقائی آواز ضمیر و قلب کو بانگِ درابنائی ہے۔ انقلاب و ارتقا میں مثبت و منفی عوامل و محرکات کی کار فرمائیوں کا فرق ہوتا ہے۔ گویا انقلاب ایک حادثہ ہوتا ہے اور ارتقا پیش رفت۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ انقلاب و ارتقا میں وہی فرق ہے جو نشد و رجحانیت میں ہے، سزا دینے اور سمجھانے میں ہے۔ اذہان تحریک آزما ہوں تو انقلاب مرتعش ہوتا ہے۔ اور ضمیر و قلب راہِ غاہوں تو ارتقا محرک ہوتا ہے۔ گویا انقلاب تقصیر ہے اور ارتقا تدبیر۔ یہ مفروضہ قطعی غیر حسابی اور عدم اقلیدیسی ہے کہ ارتقائی عمل کے لئے انقلابی عمل سے طویل کاوش و عرصہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس قسم کے مفروضے ارتقا کے رقیبوں کی فکری سازش کے قائم کردہ ہیں۔ امرِ واقع یہ ہے کہ ارتقائی عمل فقط لمحات اور انقلابی عمل ایسے طویل عرصوں کا محتاج ہوتا ہے جو رد عمل کی زد میں ہوں سے بس اکہ نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا۔ نہ ہونگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے۔ ذہنوں کی تربیت کے لئے اتنی طویل تبلیغ کی ضرورت ہوتی ہے کہ تکمیل سے پیشتر و نہائے ابلاغ کے سکرین کا وزیر ہو جانے کے خطرہ سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا جبکہ قلبی کیفیت کے بدل جانے کے لئے ایک لمحہ ہی تو درکار ہوتا ہے۔ انقلاب ہمیشہ

تضادات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ تاریخی واقعات نے پیدا کئے ہوں یا فکری تضاد م نے فکری عمل ارتقا کا اجراء و انتہا نبوت کامر ہوں احسان ہے اور انقلابات نے ہمیشہ مفکرین کو ماتم کناں اور فکر کو سرپیٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ مادی فکر کو الہامی فکر سے گلوگیر کرنے والے انقلابات تاریخ انسانیت کا لوحہ ماتم ہیں۔ اور نبوت کا سلیقہ ارتقا قانونِ فطرت کی سورۃ فاتحہ ہے۔ مادی عقل و دانش کے لائے ہوئے انقلاب انسانوں کی اس ذہنی آمریت کی تحریک ہوتے ہیں جو اذہان نفسِ امارہ سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ نفسِ امارہ جس کا محرک حاجات و ضروریات کا افلاس ہی ہوتا ہے۔ جبکہ ارتقا فکری یک جہتی، یک فکری و یک سوئی کا متواتر و مسلسل عمل ہے۔ ہر محدود کو لا محدود اور ہر فانی کو لافانی کی تربیت و پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی فانی کی فکر لافانی نہیں ہوتی اور لافانی فکر کے سرچشمے ہی فکر انسانیت کے لئے آبِ حیات مہیا کرتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو دیگر نکات کے ساتھ ”ذک الکتاب لاریب فیہ“ میں پنہاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ربوبیتِ فکر انسان اللہ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ انسان فقط تحقیق کرتے ہیں مگر اللہ حقیقت نازل کرتا ہے۔ اللہ نے فانی انسانوں کو اپنے رحمانی و رحیمی خواص کے واسطہ سے عبودیت و استغانت طلبی کی تلقین کی ہے۔ روزِ آخرت پر ایمان کی تلقین میں ہی انسانی حاکمیت کی نفی اور حاکمیتِ الہی کا راز مخفی ہے۔ روزِ آخرت پر ایمان کا نہ ہونا یا اس اعتقاد کا کمزور ہو جانا انسان کی حاکمیت کے نظام اور انسانوں کے ذوقِ حاکمیت کی انگیخت کا باعث ہوتا ہے۔ انسانی جبلتوں کا روزِ حشر کی جواب دہی کے احساس سے غیر متعلق ہو جانا ہی انسانوں کی حاکمیت کے نظام کے راجح ہو جانے کا باعث ہے جسے اللہ کے روبرو جواب دہی کا احساس ہو، وہ کبھی انسانوں کو اپنی حاکمیت کا تابع نہیں کرتا۔ بادشاہت ہو

کہ جمہوریت، مزدکیت ہو کہ اشتراکیت تمام مکتبہ ہائے فکر اصلاً روزِ آخرت پر
بے یقینی کے باعث وجود میں آئے ہیں۔ حق کے قوی مسخ کر دیئے جائیں تو فقط
قوت کو حق تسلیم کر لینے کا احساس کم تری قلب و ذہن پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے۔
نو آزاد ترقی پذیر ممالک میں پُرکاری و ساحری حاکماں کی علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھی
ہوئی دانش و قوت کو مستحارب ہونے سے بچانے کے لئے کوئی معتدل راستہ
تلاش کرنا ضروری ہے۔ پاکستان کو اگر ریاستِ اسلام بنانا مقصود ہے تو صوبوں
کی مساوی نمائندگی سے بھی اہم یہ امر ہے کہ ایوانِ بالا کو نفاذِ اسلام اور فکری
استحکام کا راہ نما ادارہ بنایا جائے۔ اور سیاستِ پاکستان میں فرد کی یکتائی
سے خاندان کی اکائی کو وحدت دیکتائی کی قوت و خاصیت مہیا کر کے وفاق
ریاست کی تعمیر کی جائے اور تعبیرِ تحریر کی جائے۔ کیا نظمِ خاندان کو حزبِ اقتدار
و حزبِ مخالف کی تقطیع، تفریق، گروہ بندی یا دھڑا سازی کے سپرد کر
دینا درست ہوگا۔ کیا کوئی ذی شعور فرد کوئی مغربی جمہوریت نواز سیاست دان
اپنے خاندان کو اس قسم کی تفریق و تقسیم کے حوالے کر دینا پسند کرے گا۔ کیا
ہر فرد اپنے گھر میں اپنے افسرد خانہ میں اتفاق و اتحاد کا خواہاں نہیں، دھڑا
بندی و گروہ سازی کو عملی قلعہ نہیں گردانتا، باہمی مشورہ سے یک رائے اور
یک جہت ہونے کو ترجیح نہیں دیتا۔ ہیرت ہے کہ جو عمل کوئی انسان اپنے گھر
کے لئے درست نہیں گردانتا، ملک و قوم کے لئے اسی عمل کو اپنی سیاست کا
جزو بنالے اور اس تفریقی سیاست کا علمبردار بن جائے۔ جو سیاست
یا فکری عمل گھروں کی بربادی کا باعث سمجھا جاتا ہے، اُسے ملکی استحکام کے لئے
مددِ معاون کیوں کر تسلیم کر لیا جائے۔ کیا گھر اور خاندان باہمی مشاورت، یکسوئی
اور یک جہتی سے نہیں بسا کرتے۔ کیا نفاق اور اختلاف رائے کا دائم ہو جانا ان

کی بربادی کا باعث نہیں ہوتا جو عمل گھروں کو برباد کر دیتا ہے، وہ ملک کو کس
 طرح آباد رہنے دے گا۔ ایسی سیاست صرف سیاسی کھنڈروں کی اپنی انا کی
 تسکین کے لئے معمول تفریح کے لئے برپا کی ہوئی ہوتی ہے۔ نظامِ سیاست
 اسلام میں ایسی سیاست کو شرک بھی کہتے ہیں اور منافقت بھی۔ صاحبو! مغربی
 جمہوریت نوازو! غور کرو، تو یہ ایک پُرکار فریب ہے کہ معاشرہ شکن انسانی
 بے تعلقی اور وابستگی، اغراض کو جمہور نوازی کا حسین نام دے دیا گیا ہے۔
 اس نظامِ سیاست میں انسان مجتمع نہیں ہوتا، بکھر جاتا ہے۔ تفریق و تقسیم
 کو خدا کے لئے اجتماعیت نہ گردانو۔ یہ سروں کو ملانے کا نہیں، سروں کو ٹکرنے
 کا عمل ہے۔ جہاں چہرہ روشن اور اندروں چنگیز سے تاریک تر رکھنے والی
 مغربی جمہوریت کو کامیاب گردانتے ہو، وہاں خاندان کے تصور کی تدریج
 نفی لازم نتیجہ قرار پا چکی ہے۔ جمہوریت معاشرت کی نفی ہے اور ریاستِ اسلام
 اپنی نوعیت میں سیاسی نہیں، معاشرتی ہوتی ہے۔ اگرچہ حالیہ انتخابات
 میں طریقِ انتخاب نیم مغربی جمہوری تھا مگر یہ نظامِ اسلام سے اس کے واسطے
 ہی کافی ہے کہ متوسط طبقہ کی قیادت ہی متحرک نہیں ہوئی، طبقے بھی متوسط
 ہوئے ہیں۔ لوگ تاحال ذی القربیٰ اور اقربا نوازی کے مابین فرق سے آشنا
 نہیں ہوئے۔ نہ ابھی اسلام کے نظامِ حریت اور جمہوریت میں امتیاز اذہان میں
 نمایاں ہوا ہے۔ چنانچہ قیادت کو متوسط و متوازن رکھنے کی ذمہ داری صدر مملکت
 پر آپڑی ہے۔ آئندہ اسمبلیوں کو نظامِ اسلام آشنا کرنا، انہیں نظامِ اسلام
 کی راہ پر گامزن کرنا، بے راہ رونہ ہونے دینا اور اس کا روانِ سیاست کو
 منزل آشنا کرنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ یہ احساس رکھنا بھی لازم
 ہے کہ یہ انسانوں کا کارواں ہے، بھیڑوں کا نہیں کہ چرواہا راہ غائی نہ کرے،

ہانکے۔ یہ مسلمانوں کا کارواں ہے۔ دراصل تو سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا۔ مگر اس زمانے میں سیاست اسلام میں میر کارواں چرواہا ہوتا ہے، ساربان ہوتا ہے، نگہبان ہوتا ہے، قافلہ سالار، صدائے جبریں ناقہ لیلیٰ سنتا ہوا مجبور و بے بس و معذور قیس، یا مغنی بے نفس، آئندہ سیاست پاکستان کے سوچنے اور طے کرنے کی بات ہے۔ کیا اختلاف رائے کو اللہ تعالیٰ اور رسول مقبولؐ کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق باہم افہام و تفہیم سے ختم کرنا، تفرقہ بازی نہ کرنا، اپنی ذاتی رائے کو منشاء الہی کے تابع رکھنا، احکام الہی اور فرمودات رسول اکرمؐ کی من و عن پیروی، احکام الہی کا نفاذ اور ان ہی کے عین مطابق نظام حکومت کا قیام و انتظام مجالس مشاورت کی منصبی ذمہ داری نہیں ہے۔ کیا ان کے لئے ضابطہ اخلاق اور طریق کار اللہ کی طرف سے متعین شدہ نہیں ہے۔ کیا ان احکامات میں کسی ترمیم یا تنسیخ کی کسی مومن کے لئے کوئی گنجائش ہے۔ کیا گروہ بندی اور تفرقہ بازی کو اللہ نے شرک کے مترادف قرار نہیں دیا۔ کیا یہ واضح حکم نہیں ہے کہ جو نظام یہ کچھ برپا کرے، اُس نے گویا اللہ اور روزِ آخرت سے انکار کیا، اختلافی گروہ بندی، منشاء نظام اسلام کے منافی نہیں ہے؛ اس فرمان الہی سے کون اور کس طرح انکار کرے گا۔ کہ انھذه اُمَّتُمْ وَوَاٰهَدَةٌ وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ - وَتَقَطُّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ، کُلٌّ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ۔ اپنی یا دیگران کی مادی و نفسانی خواہشات کی پیروی اور ان کی تکمیل کے لئے تفرقہ بازی اور ایسی خود ساختہ تاویلیں جو نفاق برپا کریں، کیا احکام الہی کی واضح خلاف ورزی نہیں۔ کیا فردّوہ الی اللہ و الرسول خیر کی بات اور احسن تاویل نہیں۔ اب یہ ذمہ داری کس پر لازم ہے کہ اسمبلیوں کو الحاد سے محفوظ رکھا جائے اور انہیں مومنانہ اجتہاد کے ادارے بنایا جائے۔ کس کی ذمہ داری ہوگی کہ

روزِ آخرت کی جواب دہی کا احساس اراکین مجالس مشاورت پر طاری رہے
 جس اتقا کو بیدار کرنا اور یہ اندازِ فکر برپا کرنا کہ اراکین اللہ کی ناراضی کے
 پیش نظر منکر کی نہی کریں اور بالمعروف امر کا کردار اپنائیں، کس کے ذمہ ہوگا۔
 مغربی جمہوریت کی بجائے اسلام کے نظامِ حریت و مشاورت کا کامل نفاذ یوں
 کہ تمام شہریوں کو امورِ مملکت میں عملاً شرکت کا اعتماد حاصل ہو، کس خوش نصیب کی
 سرفرازی کا باعث ہوگا۔ کون نگران ہوگا کہ آزادی رائے اور آزادی عمل شرع
 الہی کے تابع رہے۔ کون فیصل ہوگا کہ مغربی جمہوریت میں اکثریت کے فیصلے
 عموماً جذباتی ہوتے ہیں۔ ان کا عقلی ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ نفسیاتِ اجتماع کی
 رو سے ہجوم یا جماعت ہنگامی اشتعال کا شکار ہو جاتی ہے۔ مغربی جمہوریت
 میں نابغہ اور واقعی اہل اشخاص کے لئے ترجیح نہیں ہوتی اور اکثر و بیشتر اعلیٰ
 دماغی جوہر تک بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ مغربی جمہوریت محض عقلی بنیادوں پر قانون
 سازی کرتی ہے اور الہامی اساس سے منکر رہنا اس کی بنیادی اساس ہے۔ اختیارات
 کی متوازن تقسیم تو صاحبانِ اختیار کا ترازو کرے گا۔ راقم کے نزدیک وزیرِ اعظم
 کو اگر شرح صدر حاصل نہیں۔ اور وہ صدری تحریکات، قلبی کیفیات اور ضمیر کا
 تابع فرمان نہیں۔ تو اس کی باقی ماندہ تمام صلاحیتیں اُسے سزا دیں گی۔ جو کوئی
 بھی عقلِ مہم جو و مصالحت بین کا تابع ہو جائے، فکری صدری امراض کا شکار
 ہو جاتا ہے۔ صدر اور وزیرِ اعظم میں وہ رشتہ قائم نہ ہو جو مومن کے دل و دماغ
 میں ہوتا ہے۔ تو مغربی جمہوری اسلام تو نافذ ہو سکتا ہوگا، مابین اسلام نہیں۔
 انسانی جسم کی وزارتِ عظمیٰ اگر متوازن خیالی کھوپڑی تو یوں ہوتا ہے جیسے معاشرہ
 کے کندھوں پر کسی پاگل کا سر نصب کر دیا گیا ہو۔ صدر اور وزیرِ اعظم معاشرہ کے
 اعضاءِ رئیسہ ہوتے ہیں اور اعضاءِ رئیسہ اگر ذہنی عوامل کو قلبی واردات کا تابع

نہ کریں تو معاشرہ سافلین کا جگمگٹا بن کر رہ جاتا ہے۔ تسلیم کہ نظام اسلام
 کے نفاذ کے فیصلہ میں صدر کی صدی واردات، ایمان بالغیب، پرعزم
 جرات اور شرافت طبع کا نمایاں حصہ ہے اور انتخابی نتائج کا مثبت ہونا۔ منفی
 سیاست۔ سیکولرزم، سوشلزم اور مغربی جمہوریت نوازی کا کوشہ نشین
 ہو جانا اللہ کا انعام ہے۔ لیکن اذہان نہ ابھی واضح ہیں نہ یک سو۔ ایتار ابھی
 انتشار زدہ ہے۔ ان امراض کی تشخیص ہی کافی نہیں، دار و اوپر پہنچ بھی لازم ہے۔
 اگر کسی دیگر نظام مشاورت، گروہ بندی یا تفرقہ بازی کی اجازت دی گئی یا روا
 رکھی گئی تو اسمبلیاں مجالس مشاورت کم اور نقار خانے زیادہ نظر آئیں
 گی۔ لوگوں کی ناراضی سے زیادہ اللہ کی خوشنودی پیش نظر نہ رہی تو معاشرہ
 اپنے آپ کو ایسی کشتی میں سوار پاٹے گا جس کا ناخدا کشتی رانی سے
 نا آشنا ہو۔ اور اس ناخدا کو راہ دکھاتے ہوئے مسافر خدا نا آشنا ہو
 جائیں۔ رب کائنات سے سلو اتلیما کا رشتہ استوار نہ کیا جائے تو حراط
 مستقیم اور انعمت علیہم میں ربط قائم نہیں رہا کرتا۔ مجالس مشاورت
 کے لئے لا تفرقوا راہ نما اصول ہے۔ جناب صدر کا کوئی پارٹی نہ بنانا ہی کافی
 نہیں۔ پارٹی بازی کی بازی کو ممنوع قرار دینا بھی ضروری ہے۔ غیر جماعتی انتخاب
 کی کوکھ سے پارٹی باز مجالس مشاورت کا جنم لینا ایک سانحہ ہو گا جس
 سے ملک و قوم کو محفوظ رکھنا کسی کے تو فرانس میں شامل ہونا چاہیے۔ جو
 مغلوب گماں نہ ہو، جاودال نہ ہو، وہ نہ فکر اسلام ہے نہ نظام اسلام۔
 فقط وزیر یا اراکین مجلس تبدیل ہو گئے اور حالات وہی رہے تو کاوش
 لا حاصل کا افسوس سرمایہ سیاست حاضر ہو گا۔ اور ما بعد شاید چراغوں
 میں بھی روشنی نہ رہے۔ اور اندھیرے دور کرنے کے لئے ستاروں پر

کمند ڈالنی پڑے۔ جو لوٹ جائیں تو شہابِ ثاقب کہلاتے ہیں۔ انسانی مادی
خواہشات کے قائم کئے ہوئے نظام کی بجائے انسانی وجدان کا نظام قائم
کرنا ایک ذمہ داری بن چکی ہے۔ اللہ کرے کہ آئندہ آئینی ادارے اسے نبھا
سکیں۔



جناب صد! ایک جام اور!

بفضلِ خدا رموزِ سلطانی سے آگاہِ فقیرِ نشین، والدہ نہ کسی خوف کا
شکار ہے نہ حزن کا۔ نہ خوشامد اس کا شیوہ ہے نہ سازش اس کی عادت،
نہ کسی سے ذاتی دشمنی نہ غرض کی دوستی۔ کون تخت نشین ہے اور کون زیر زمین،
کون صاحبِ اقتدار ہے اور کون رقیبِ اقتدار، کس کے چمچے ٹھنک رہے ہیں
اور کس کی رال ٹپک رہی ہے۔ تصبیحِ اوقات کا موقع ملے تو اسے موضوعِ فکر
بنائیں۔ ہو بھی تو نہ تو من تیل اکٹھا ہوتا ہے نہ ان تفکرات کی رادھا ناچتی ہے مسجد
میں شکستِ رشتہ تبیحِ شیخ کی وجہ سے منہدم کرنے کھرام حجار کھا ہے۔
سیاسی شاہراہیں سنسان پڑی ہیں۔ محروم اقتدار ایک دوسرے کو لیسن
سنا رہے ہیں۔ مغربی جمہوری فنِ کاری کو کلمہ شہادت سنایا جا رہا ہے۔ سیاست
کاروں کا جلوسِ جنازہ مرقدِ منازل پر پہنچ چکا ہے۔ پرکاریوں کی میتیں دفن کئے
اپنی باری کی منتظر ہیں۔ مگر اعلانِ انتخاب ہے کہ ان کے پھول جانے کا منتظر
ہے۔ طرزِ انتخاب زیر غور ہے مگر شوقِ انتخاب ہے کہ بوسیدہ لنگر اٹھائے
پھٹے ہوئے لنگوٹے کندھے پر رکھے اپنے اپنے اکھاڑوں کی مٹی ہموار کروا رہا
ہے اور تاثر دے رہا ہے کہ متوقع امیدوار ہوں اس انتخاب کا جس کے

احساس بانجھ پن کی وجہ سے پاؤں ہلکے اور سر بھاری ہو گیا ہے۔ اُبکائیوں پر
 پابندی ہے، جمائیاں تاحال آزاد ہیں۔ فقط سراب پیش نظر ہے۔ مگر دریا کی
 گرائیوں اور گیرائیوں کے اندازے لگائے جا رہے ہیں۔ عقد کی تاریخ مقرر نہیں
 ہوئی، فقط وعدہ نکاح پر ہی رخصتی کے باجے بچنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہر متوقع امیدوار
 کی کیفیت اُس سادہ لوح کی سی ہے جو محکمہ موسمیات کی پیش گوئی پر اعتبار کر کے
 چلچلاتی دھوپ میں ”رین کوٹ“ پہنے آم خریدنے جا رہا ہو۔ غیر متوقع انتخاب اور
 متوقع امیدوار دونوں مرکزی صنعتی نمائش میں دکھائے جانے کی صنعتیں ہیں۔
 کافر ہو، جسے وعدہ انعقادِ انتخاب پر یقین نہ ہو اور کافر الکافرن ہو جسے طریق
 انتخاب پر یقین ہو۔ قبل از تولید خوشی بھی اتنا ہی احمقانہ فعل ہے جتنا کہ قبل از
 مرگ واویلا۔ لہذا یہی کافی ہے کہ تک الایام نذا ولھا بین الناس پر یقین رکھا جائے
 اور بروٹے سربراہی دول پر نگاہ رکھی جائے۔ کیا خبر اس بحر کی تہ سے کیا ابھرتا ہے
 اور گنبد نیلوفر کی کون سا رنگ بدلتا ہے۔ البتہ معلوم یہ حسن اتفاق ہے، فطرت
 کی گرفت آزمائی ہے یا کسی کی سیاسی فراست کہ جو لوگ بجالی جمہوریت کے پردے
 میں اپنے لئے اقتدار طلب تھے انہیں ہر اک لفافہ رنگین، ایک پرچہ سادہ
 اے دل سکوں دشمن لے تیرا جواب آیا۔ کی کیفیت میں گرفتار ہونا پڑا۔ اور حکم
 ہوا کہ اے عزیز انتخاب دوستو! جاؤ۔ پہلے منہ دھو ڈالو۔ قیام صلوات کرو۔ گلی
 گلی، کوچہ کوچہ، دیہہ دیہہ، شہر شہر لا الہ غیرک پکارو۔ اللہ کے ملک یوم الدین ہونے،
 آئینی طور پر سیریم ہونے، یوم جزا مختار و مالک لا شریک ہونے کا اقرار کرو۔
 معاہدہ کرو کہ اے پروردگار، ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ استدعا کرو کہ
 اھدنا الصراط المستقیم پکارو، سبحان ربی العظیم، ربنا لک الحمد، سبحان
 ربی الاعلیٰ۔ پکارو! اے نبیؐ آپ پر سلام ہو۔ ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں

پر سلامتی ہو۔ اے اللہ ہمیں مقیم الصلوٰۃ بنا۔ جناب صدر انکی کے اعمال و افعال میں تعاون اور منکر سے اختلاف و عدم تعاون و مجاہدہ و مقابلہ ازل سے فقیر منشیوں کا دستور ٹھہرا۔ لہذا دیگر مثبت اختلافات کے باوجود قیام صلوٰۃ کے اہتمام و انتظام و انصرام پر مبارک ہو۔ جو بروقت تنقید سے کبھی باز نہیں آئے، وہ بجا تعریف میں تامل کیوں کریں۔ فی زمانہ اس جرعہ کے لئے جرأت قابل ستائش ہے۔ وعدہ رہا کہ جس انداز سے منکرات کی نہی ہوگی، اسی انداز سے معروف کی تعریف بھی ہوگی۔ ہمارا آپ کا حاکم خدا۔ ہم آپ سبھی محکوم، اطاعت الہی ہم پر فرض اور آپ پر بھی۔ ہم آپ ساجد صرف وہی مسجود۔ الحمد صرف ہمارے اور آپ کے رب واحد کے لئے۔ ہم سب عابد فقط اک وہی معبود۔ ہم آپ صراط مستقیم کے متلاشی، اک وہی ہادی۔ ہم آپ انعام کے طالب صرف وہی منعم۔ ہم آپ صرف اسی سے اعانت طلب، ریاست و حاکمیت فقط اسی کی۔ ہم آپ فقط اطاعت گزار۔ میخانہ میکا ولی کے تمام در بند، ساقی، مدینہ کا فیض عام جاری۔ روسیو، شیلے، ہیگل۔ کارل مارکس کے فریب کن نعرے مسدود، اذان محمد بند۔ نہ کوئی بندہ نہ کوئی صاحب۔ نہ کوئی محتاج نہ کوئی غنی، دربار الہی آویزاں اور ہم آپ ایک ہی صف میں صف آرا۔ یوں ہے تو ہم با وضو ہیں۔ ادھر قد قامت الصلوٰۃ کا اعلان ہوا، ادھر ہمارے روئیں روئیں تے اللہم لیک پکارا۔ قیام صلوٰۃ کے عوامل پر غور کریں تو کیا اللہ کے سوا کوئی اور اللہ نہیں باور کر لینے سے آج کے تمام سیاسی مطالبات اور انتظامی عمدہ جات کی نفی نہیں ہو جاتی، بندوں کی حاکمیت کے آئینی شرک سے نجات نہیں مل جاتی حکومت کا قیام صلوٰۃ کا نفاذ کرنا، کیا آج کے نظام حکومت کی نفی کر کے حاکمیت الہی کے برپا کرنے کا بنیادی عمل نہیں ہے۔ قیام صلوٰۃ ریاستی ذمہ داری اس لئے

یہ کہ بندوں کو اپنی حاکمیت کے قیام سے روکا جائے۔ کوڑی کوڑی دانش فروش اگر یہ وسوسے قائم کرتے ہیں کہ یہ عمل کامیاب نہیں ہوگا۔ تو اپنے توہم گرفتہ ہونے کا ثبوت لارہے ہیں۔ ایک لاکھ پچھتر ہزار ناظمین صلوات کا تقرر ہو۔ ملک کی تمام آبادی کو بالغ بھی تصور کر لیا جائے۔ یہ مفروضہ بھی قائم کر لیا جائے کہ اس وقت ملک بھر میں ایک بھی صلوات گزار نہیں۔ تو ایک ناظم صلوات کو فقط قریباً پانچ صد افراد کو ترغیب صلوات دینا ہوگی اور اگر نصف آبادی ہی بالغ ہے اور اس کی نصف مستورات ہیں۔ تو ایک ناظم کے حصہ میں فقط ۱۲۵ افراد کے قریب آتے ہیں۔ ناظمت صلوات کا تقرر بھی ہو جائے، ہو جانا چاہیے تھا، تو ایک قلیل عرصہ میں جملہ آبادی کا صلوات گزار ہو جانا لازم ہے۔ کتنا حسین ہوگا وہ دن جب اس مملکت حداد کی تمام آبادی بوقت فجر و ظہر و عصر و مغرب و عشا، دست بستہ کھڑی پکار رہی ہوگی، اللہ کے سوا کوئی الہ کوئی حاکم نہیں۔ لا شریک حاکمیت، ملک، زمین اسی کی ہے۔ سروری فقط اسی کو زیبا ہے اور جواب مل رہا ہوگا، کی محمد سے وفاتوں نے تو ہم تیرے ہیں۔ یہ جہاں چپیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔ مگر جناب والا! مغربی جمہوریت تعلیم و دانش افزنگ اور انسان ساختہ قوانین کی کار فرمائی نے کچھ انسانوں کو بھوت بنا رکھا ہے اور تمام بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ کچھ بھوت لاقول کے بھی ہوتے ہیں۔ وہ یا تو سفلی اور بدکار ہوتے ہیں یا پھر اہل مرتبت و قوی و ذی اثر۔ ان کے علاج کے لئے نسخہ تحریر ہونا بھی ضروری ہے جو اذان سے متاثر نہیں ہوتے۔ کاروبار حیات حکومت میں "لیس متی" کا اعلان سنیں تو ہوش ٹھکانے لگیں۔ جو اس کو بے ٹھکانے لگائے ہوئے لوگوں کے جو اس ٹھکانے لگانا اور ٹھکانے رکھنا بھی تو حکومتی ذمہ داری ہے۔ ذاتی معاملات میں نرمی،

حسَن اخلاق، مروّت، رواداری، عفو و درگذر و چشم پوشی حَسَن طبیعت ہے۔ مگر خدائی معاملات میں، روگردان افراد سے روگردانی اللہ کے ہاں لائق سرزنش ہے۔ انسانوں کی حکم عدولی کی سزا ہو سکتی ہے، ایک انسان یا اُس کے نظام کے خلاف آواز اٹھانے پر اگر تعزیری دفعات کے الفاظ میں کوڑے لیکنے لگتے ہیں تو احکام الہی کی پابندی کے لئے فقط وعظ و تبلیغ پر کیوں اکتفا ہو۔ آخر کیوں؟

صلوٰۃ، جنت سے نکلنے والے ہوئے انسان، نہیں، وجودی قربت الہی سے محروم کئے گئے انسان، دوریوں اور فرقتوں کے کرب میں کراہتی ہوئی انسانیت، منزل کے متلاشی، بے راہ رو، بھٹکے ہوئے، مغضوب، ضال انسان کو معراج النبیؐ کے دوران عطا کیا گیا وہ روشن و ہادی عمل ہے جس کے ذریعہ وقت اور فاصلے کی گرفت میں جکڑا ہوا انسان، خالق و مخلوق کے درمیان حائل وقت اور فاصلے کو عملی طور پر کم ترین کر لیتا ہے۔ دوری اور فرقت کے کرب کو پوری انسانیت شعوری اور تحت الشعوری طور پر محسوس کرتی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسانی ایجاد دراصل انسانوں کی وقت اور فاصلے کو سکیڑنے کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ پیٹے سے لے کر خلائی جہاز تک ہر ایجاد کے پس منظر میں یہی جذبہ کار فرما ہے۔ حضرت آدمؑ اور محمد مصطفیٰؐ، نبیؑ اول اور پیغمبرؐ آخر میں زمین پر اتارے گئے اور عرش تک لے جا گئے انسان کا فرق ہے۔ وقت اور فاصلہ پر یوں عبور حاصل کرنا کہ خالق و مخلوق کے درمیان فاصلہ سکر کر کمان کے دوسروں سے بھی کم رہ جائے۔ اعجاز و عطائے الہی نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسے عمل کے دوران ایک ایسے نظام صلوٰۃ کا عطا ہو جانا، کہ قیام کے دوران اللہ کے روبرو، اور دوران التعمیرات پیغمبر کے حضور صیغہ متکلم میں معروضات و ہدیہ تبریک پیش کیا جاسکے، کوئی معمولی عمل نہیں کہ اسے روزمرہ کی عام اور معمولی توضیحات پر ٹال دیا جائے۔ یہ رحمتِ خداوندی ہے

کہ انعامات صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو بھی عطا ہوتے ہیں اور نہ چلنے والوں کو بھی، مگر کچھ ان انعامات کے تصرف سے منعم اور کچھ مغضوب ہو جاتے ہیں۔ جو بھٹک جائیں ان کے لئے وہی انعام غضب کا باعث ہوتا ہے اور جو نہ بھٹکیں، ان کے لئے باعثِ رحمت۔ چاقو سے قلم بھی بنایا جاسکتا ہے اور خود کشی بھی کی جاسکتی ہے۔ قلم سے قرآن بھی تحریر کیا جاسکتا ہے اور فحش نگاری بھی کی جاسکتی ہے۔ لا الہ الا اللہ بھی تحریر کیا جاسکتا ہے اور ہرگز کوئی اللہ نہیں ہے بھی تحریر کیا جاسکتا ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان فاصلے طویل رہیں، دوریاں بڑھتی جائیں تو انسانی عمل منفی ہو جاتا ہے۔ دوریاں اور فاصلے سکر جائیں تو انسانی اعمال مثبت عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ صلوٰۃ ان ہی دوریوں اور فاصلوں کو سکر دیتی ہے۔ حیرت ہے کہ مسلمان اللہ کی حاکمیت پر، اس کے حاضر و ناظر، سمیع و مجیب و نصیر ہونے پر ایمان بھی رکھے اور اسی کی اتنی قریب موجودگی میں کسی اور حاکم والہ کو بھی تسلیم کرے، حاکم والہ بن بھی بیٹھے۔ اسی کیفیت سے محفوظ رہنے کے لئے صلوٰۃ رحمتِ مجسم کا دورانِ ملاقاتِ الہی اپنی امت کے لئے حاصل کیا ہوا تحفہ ہے۔ انسانی حکومتوں کے دارالخلافوں تک جانے کے لئے وقت بھی درکار ہے اور سرمایہ بھی۔ مگر دربارِ خداوندی میں حاضری کے لئے وقت مقررہ پر جو چاہے، جہاں چاہے وقت اور فاصلہ کو شکست دے لے۔ نہ کوئی تحریری درخواست، نہ کورٹ فیس، نہ ڈاک کا ٹکٹ۔ دن میں پانچ مرتبہ ملاقات، عرض گزار، ہدایت طلبی، مشاورت اور پھر شاہ و گدرا، صدر و مزدور، توانا و ناتواں، تو نگر و مفلس سبھی ہم منصب، سبھی کا ایک مقام، سبھی برابر، سبھی ایک صف میں۔ سب اسی اللہ کے محکوم، سبھی فریادی، سبھی ہدایت طلب۔ نہ کوئی انسانی مصنوعی حفظِ مراتب، نہ کش مکش من و تو، تمام دنیوی اللوں

سے گلو خلاصی، تمام مکروہی سجدوں سے نجات۔۔۔ جناب صدر! پیغمبرؐ کے لائے ہوئے اس نظام کو آپ نے قوم کی جھولی میں ڈال دیا۔ ہم زخم سہلاتوں کو کیا خبر تھی کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی جھولی میں یہ رحمت بھی ہے، ورنہ روز اول ہی طلب کر لیتے۔ گاؤں گاؤں ناظم صلوٰۃ مقرر کر دیئے۔ دنیوی طور پر سب راہ حکومت سے بلا واسطہ رابطہ کا حق دے دیا، اللہ تعالیٰ سے بلا واسطہ رابطہ قائم کرنے کی ترغیب دے دی۔ معلوم ہے، آپ نے کیا کیا۔ خالق و مخلوق کے درمیان رابطہ کا نظام برپا کر دیا جو انسانی حکومت کے منمنی افراد کے لئے ایسا ہی عمل ہے جیسے اُن کی راہ میں بارودی سرنگیں پھیلا دی جائیں۔ صلوٰۃ جو بندگانِ حُر و جود میں لاتی ہے، وہ قیصر و کسریٰ کے لئے کبھی سازگار نہیں ہوتے۔ لیکن ادھر آپ نے اللہ کی رضا کے لئے اپنی حاکمیت کو خطرات میں ڈالا، ادھر آپ کے ادنیٰ ناظمین صلوٰۃ کے درمیان رابطہ کا نظام بھی ہو گیا۔ یقین تو ہو گیا ہو گا کہ اللہ کتنا سریع الحساب ہے اور اپنے ذمہ لحو بھر کے لئے بھی قرض نہیں رکھتا۔ اس رابطہ نے آپ کو ایک لاکھ پچتر ہزار کارکن متیا کر دیئے جو کسی مخالف و موافق سیاسی جماعت کو آج تک میسر نہیں ہوئے۔ اتنے صلوٰۃ گزاروں کا رابطہ فقیر سے ہوتا تو کسی روز ان سب کو اکٹھا کر کے بالمشافہ قیام صلوٰۃ کی درخواست کرتا۔ ان کے رو برو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور منت کرتا کہ وعدہ کرو، صلوٰۃ تم پر گراں نہیں گزرے گی۔ وعدہ کرو، کہ اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم والہ تسلیم نہیں کرو گے۔ فقط اللہ ہی کے احکام کی پابندی کرو گے۔ اُس کے معروف پر عمل اور منکر کی نہی کرو گے۔ آپ سیاسی آدمی نہیں ہیں۔ ہونا بھی نہیں چاہیئے۔ یہ تو سن رکھا ہو گا، ملاں اور مجاہد کی اذال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ سیاسی جماعت ہرگز نہ بنائیئے۔ حزب اللہ تشکیل دیجئے۔ یہ آپ کا فرض بھی ہے اور منصب بھی۔ خطبہ حجۃ الوداع

فقط ریفرنس یا حوالہ جات کے لئے ہی نہیں، دہرانے اور وارد کرنے کے لئے بھی ہے۔ آپ کے سیاسی مقاصد ہوں یا نہ ہوں، صلوٰۃ کے لئے ریاستی مقاصد ہیں۔ صلوٰۃ اسلام کے سیاسی نظام کی خشتِ اول بھی ہے، ستون بھی اور معراج بھی۔ سیاست میں معذرت خواہانہ رویہ جرم بھی ہے اور مہلک بھی۔ اسلام ڈپلومیٹک نہیں، دین فراست ہے۔ دربار و دیارِ غیر میں نیزے کی نوک سے قیمتی قالینوں کو مجروح کرتے جانا اور سادگی کا تاثر قائم رکھنا فراست ہے، ڈپلومیسی نہیں۔ فراست اور ڈپلومیسی کے انداز جداگانہ ہوتے ہیں۔ میٹھے زہر اور کرہ وے تریاق میں کیا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ یہ تاثر ابھرتا ہے کہ آپ اس فرق سے بخوبی آشنا ہیں مگر تکلف فرما جاتے ہیں، اور آپ کے پہلو بچاتے بچاتے پہلو تہی ہو جاتی ہے۔ جراتِ زندانہ و نعرہٴ مستانہ سیاستِ اسلام کے رنگ و روغن ہیں۔ بندوں سے یوں ڈرنا کہ خوفِ خدا نہ رہے، اتقا کا ازلی دشمن ہے۔ یہ رویہ انسان کو اقتدار بھی دے تو کاسہ گدالی میں ڈال کر دیتا ہے۔ اسی رویہ کو عرف عام میں جمہوری رویہ کہتے ہیں۔ عوام کا حاکمیت الہی کو تسلیم کر لینا اور سربراہ حکومت کا حاکمیت الہی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے عبدیت اختیار کر لینا فقیرانہ راہ کو رازِ سلطانی سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ایسے ہی عوام اور سربراہان حکومت ہیں جن کی پیغمبرِ آخر الزمان نے تمنا کی تھی۔ سبحان اللہ۔ اس سربراہ کا مقدر جس کا عمل و مرتبہ رسول اللہؐ کا پسندیدہ ہو جائے۔ لوکل باڈی اور کائناتی شخصیت کی پسند و خوشنودی میں فرق کیا بتانے، دکھانے یا سمجھانے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں غالباً یہ پہلا نظام ہے جس کے نفاذ کے لئے بیت المال اور بیت المال پر بوجھ نہیں پڑا ہوگا۔ اپنے اللہ کے سامنے جھکنے کے نظام کا حکومتی سطح پر اعادہ کیا ہے تو کسی اور کے سامنے نہ جھکنے

کا انعام بھی پوری قوم کا مقدر ہونا چاہیے۔ جو اس نظام کی پیروی قبول کرے، اللہ اور بندوں کے سامنے بیک وقت جھکنا اُس کے لئے بڑا کرب ناک ہوتا ہے۔ بندوں کے سامنے جھکنے کے نظام کے زیر اثر لوگوں نے اللہ کے سامنے جھکنا ترک کر رکھا ہے۔ اپنی خواہشات کے سامنے جھک جانا اس سے بھی قبیح عمل ہے جو ایسے نمازیوں کو جنم دیتا ہے جن کی نمازوں پر اللہ نے ”فویل“ کیا ہے۔ اللہ اور بندوں کی حاکمیت کی دو عملی کو ختم فرمائیے، وہ افرادی ذات پر ہو یا معاشرتی طور پر۔ جو امامت مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار کرے، فتنہ ملت بیضا ہے۔ فکری طور پر سلاطین اور صلاطین میں فرق نمایاں کرنے کی اشد ضرورت ہے، مسلطین، مصلین کو گوارہ نہیں ہوتے۔ سنگ آستاں سنگ میل نہیں ہوتے۔ اپنے ہی گھر منزل ہوتے تو لوگ سفر کیوں اختیار کرتے۔ فاصلے نہ ہوتے تو سفر کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دین اسلام کی راہِ سیاست میں ایسا سنگ میل نصب نہیں کیا جاسکتا جس پر صرف میل کے سوا کچھ اور اعداد الفاظ تحریر ہوں۔ تصویر یا رعایا کے دل کے آئینے میں ہوتی ہے۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی اور منتظم ریاست کے سامنے بھی لٹکی رہتی ہے کہ جب ذرا گردن اٹھائی دیکھ لی۔ دورانِ صلوٰۃ مسلمان اللہ سے براہ راست مخاطب ہوتا ہے، بذریعہ حکمران نہیں۔ اللہ کو اپنی حاکمیت قائم و جاری و ساری رکھنے کے لئے کسی براہِ پناہ کی ضرورت نہیں۔ تختِ شاہی پر ایستادہ انسانی احکام نافذ کرتا ہوا ہر انسان بمع اپنی تمام تر اہلیتوں کے اللہ کی قہاری و جبروت کی زد میں ہوتا ہے۔ اللہ کے چلے پر چڑھے ہوئے تیر فاصلوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ ان سے بچاؤ کے لئے کوئی زرہ بکتر بھی ایجاد نہیں ہوئی۔ رعایا کو دورانِ صلوٰۃ کسی انسان کے حاکم ہونے کا واہمہ نہ ہو اور بزعم خود دینی

حاکم خوفِ ربِّ "الاعلیٰ" سے لرز جائے، آئین اسلام بھی ہے اور دستورِ کائنات بھی۔ آپ کو جبینِ سجدہ آشنا کا واسطہ، نظامِ صلوٰۃ کا تقاضا ہے، نظامِ خلافت و مشاورت اور انسانی حریت کا نفاذ ہو۔ یعنی حاکم وقت حاکم نہ ہو، خلیفہ ہو جو احکامِ الہی کی پابندی کرے اور کروائے۔ ہر شخص کو وہ مرتبہ دے جو انی جاعل فی الارض خلیفہ کے سرچشموں سے سیرابی کے صلے میں عطا ہوتا ہے، اپنے اور شہریوں کے درمیان تمام فاصلے مشاورت کے ذریعے ختم کرے۔ صلوٰۃ سے اللہ اور بندوں کے درمیان فاصلے سکر جاتے ہیں۔ اور مشاورت سے خلیفہ اور شہریوں کے درمیان فاصلے نابود ہو جاتے ہیں۔ نظامِ قیامِ صلوٰۃ نے سیاست کاروں کو بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ مخالفت کر نہیں سکتے، حمایت و تعاون کو دل نہیں چاہتا۔ سیاسی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے خرگوش گھات لگائے بیٹھے ہیں کہ کوئی ایک خرگوش بھاگے تو یہ بھی سرپٹ ہوں۔ کوئی کہہ رہا ہے، اس میں بھی کوئی چال ہے۔ کوئی کہتا ہے، صلوٰۃ پر سنل معاملہ ہے۔ کسی کو اعتراض ہے حکومتی صلوٰۃ کیوں۔ ایک سیکولر صاحب کا فرمان ہے۔ یہ اکراہ فی الدین ہے۔ انگریزی حکومت میں تاجِ برطانیہ کے کراس کے سامنے رکوع و سجدہ جائز تھا، مسجد میں اللہ کے سامنے سر بسجدہ ہونا گوارا کیوں نہیں۔ یہ سب کچھ فرنگی سیاسی کسرت کی کثیر نفسی کا ورد ہے۔ لوگ میکا ولی کے رنگ میں بیٹھکیں لگا سکتے ہیں، ڈنٹر پیل سکتے ہیں، صفِ محمدؐ میں رکوع پذیر ہونا گوارا نہیں۔ یہ نظامِ صلوٰۃ کی مخالفت نہیں کر رہے، اپنا نیا مقدر بھی تحریر کر رہے ہیں۔ یہ لاہور کے بلال گنج کے بلال ہیں۔ ان کے نوشتہٴ تقدیر پر اقتدار کو دیمک لگ چکی ہے۔ یہ تعاون فروش وقت آتا ہے، تعاون

نیلام کریں گے۔ کوئی بولی نہ لگا دیجئے گا۔ نظام صلوات کے نفاذ سے یہ سیاسی جنگ ہار گئے۔ انتظامی جنگ کے لئے نظام خلافت و مشاورت برپا کرنا آپ کے ذمہ ہے۔ بس اس لئے سرور آور کا ایک جام اور۔ یوں جیسے سورج شام سیاہ قبا کو طشتِ افق سے اٹھا کر لائے کے پھول مارے اور شفق چاندی کے گئے اتار کر سونے کے زیور پہن لے۔ ورنہ کوئی جیت کر بھی ہار سکتا ہے۔



جناب صداب! اب زرم حق و باطل بھی ہے اور حلقہ پیاراں بھی

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے لیکن اجتماعی گناہوں کو معاف نہیں کیا کرتی۔ اور یہی خوف تحریرِ بڑا کا باعث ہے۔ ملت کی توجہ اس طرف دلانا مقصود ہے کہ اسلام کے نظامِ سیاست میں نہ تو کسی اکبرِ اعظم اور اُس کے نوریوں کی گنجائش ہے اور نہ ہی سربراہِ مملکت اور سربراہِ حکومت کے عہدوں کے قیام یا اُن کے اختیارات کی تقسیم کی ان عہدوں کی علیحدگی "ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس۔ جب ذرا انسان ہوا ہے خود شناس و خود نگر" کے میکا دلی مکتبہ فکر کی ایجاد ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا نظام، بندگانِ خدا کے واسطے سے خلافتی و مشاورتی ہے۔ امیر مملکت تابع فرمانِ الہی امورِ روزمرہ میں مشاورت کا پابند اور احکامِ الہی کی پابندی کا نظام برپا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ احکامِ الہی کی عدم پابندی نا اہلیت وارد کر دیتی ہے۔ پارلیمنٹ، حزب ہائے اقتدار و اختلاف علیحدہ علیحدہ انتظامی و ملکیتی سربراہ، کابینہ، انسان ساختہ قوانین کے تابع طریقِ انصاف قائدین ایوان و حزب اختلاف، سیاسی پارٹی بازی، عہدوں کے لئے ساز باز، اقتدار طلبی و منصب نوازی کا سیاستِ اسلام سے کوئی رشتہ و پیوند نہیں ہے۔ مکتبہ فکر و سیاستِ اسلام میں یہ بتانِ وہم و گماں ہیں۔ اور لا الہ الا اللہ کی آئینی

اساس کے منافی ہیں، اہل الرائے کا تعین کئے بغیر کرائے گئے انتخابات کا بھی دینِ اسلام سے کوئی ربط نہیں۔ سانحہ یہ ہے کہ صدر مملکت کی واضح تصریحات کے باوجود وطن عزیز سہواً یا عمدتاً یا مجبوراً نظامِ اسلام کے نفاذ کی بجائے مغربی جمہوریت کی بحالی کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے اور کوئی دن جاتا ہے کہ راہیں گریس، گناں ہوں گی کہ مسافرو! میرے کارواں سے عرض کرو۔ ”سانول موڑ مہاروے“۔ انتقالِ اقتدار اور شرکتِ اقتدار کی منفیوں کو مغربی جمہوری طریقِ انتخاب کے اثبات کا سہارا دے کر نظامِ اسلام کا نفاذ نہیں کہا جاسکتا کہ نظامِ اسلام تو اقتدار صرف اللہ کو لوٹانے کا داعی ہے۔ باوجود جملہ آئینی ترمیم کے ابھی تک اسلام ہمارا ریاستی مذہب اور جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ ترمیم شدہ آئین کی بحالی کے ساتھ ان راہ نما اصولوں کا احیاء بھی وارد ہو گیا ہے۔ یہ احیائے اسلام نہیں، احیائے سیکولرزم ہے۔ ہم نے بین الاقوامی سیاست کے سامنے جھولی پھیلا دی ہے، اسلام کا پرچم لپیٹ لیا ہے اور قراردادِ مقاصد کو وقتی مقاصد کی چادر میں لپیٹ کر حکومتی چار دیواری میں محفوظ کر لیا ہے۔ نظامِ اسلام کے نفاذ کے لئے صدر مملکت کے ذاتی اخلاص پر تک شاید گوارا نہ ہو مگر پاکستان میں وارد شدہ معروضی حالات کے پیش نظر نئی سیاسی لغت تحریر کی جاسکتی ہے، نہ انسائیکلو پیڈیا میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ ”ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ہم الکافرون اور لاتفروا کے بین السطور معانی و مطالب، موسموں کے رد و بدل، جغرافیائی تقاضوں اور سیاسی تیوروں کے محتاج قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ صدر مملکت کا عندیہ، اعتقاد اور نظریہ جو ان کی متعدد تقاریر اور اسلامی انتخابی منشور میں بیان ہوا، اس کے عینِ اسلامی ہونے میں کسی آئین کے طالبِ علم کو کلام نہیں ہو سکتا مگر شاید زاویہ نگاہ بدل گیا، یا گرفت لرز گئی کہ نشانہ خطا ہو گیا۔ سیاست

اسلام میں پارٹیوں، حزب ہائے اقتدار و اختلاف، پیشہ وری سیاست، غیر
 اہل رائے کے حق رائے دہی و نمائندگی، انسانی حاکمیت اور احکامِ الہی کی عدم
 پابند قیادت کا کوئی تصور نہیں۔ ان بنیادی اصولوں کا صدر مملکت نے بار بار
 اعلان فرمایا۔ تصدیق فرمائی کہ تعطل زدہ معطل آئین کے فکری تضادات شعور لیا
 ہیں، قلب و ذہن میں تضاد کا باعث ہیں۔ مغربی جمہوری نظامِ انتخاب میں اکثریت
 اکثر محروم رہ جاتی ہے۔ آئین اسلام میں امیر مملکت کی مجلس شوریٰ ہوتی ہے
 مجلس شوریٰ کا امیر نہیں ہوتا۔

مستاورت میں اعلیٰ و اعظم، رکنِ محض و وزیر، ضرورتِ وقت تو ہو سکتی ہے،
 آئینی ضابطہ نہیں۔ مغربی جمہوریت کا نظام اقتدار کی مسلسل جنگ کا محرک ہے۔ اسلام
 ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس کا اپنا ایک منفرد سیاسی نظام ہے، آئینی
 بھی اور انتخابی بھی، جو امور مملکت میں ہر شہری کی بلا واسطہ شرکت کا اہتمام کرتا ہے
 ان اعلانات کی صداقت پر یقین نے گنگنا شروع کر دیا ہے دیکھ کر رنگ چمن ہونے
 پر لیشاں مالی۔ کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چکنے والی۔ سے کتاب ملت بیضا کی پھر
 شیرازہ بندی ہے۔ یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا۔ مگر کرنا گردشِ ایام
 کا یہ ہوا کہ استصوابی انتخابِ صدر مملکت اور نظامِ اسلام کے نفاذ کے قطعی نلی فیصلہ
 کے باوجود امیر مملکت کی مجلس شوریٰ کا وقت آیا۔ تو یہ انتخاب قطعی جمہوری سیاسی
 غیر جماعتی ہو کر رہ گیا۔ تمام اسلامی قدریں بے قدر اور جملہ جمہوری قباحتیں جن کی
 نشاندہی مفکرِ پاکستان نے آئین پیغمبر کے تقابلی مطالعہ کے بعد کی تھیں اور صدر
 مملکت نے ان پر صاف کہا تھا، انتخابی مہم جوئی پر محیط ہو گئیں۔ انتخابات منصفانہ
 غیر جانبدارانہ و عاقلانہ و پرامن ہوئے مگر اسلام کے ساتھ وہ بے انصافی ہوئی
 کہ ہر بنیادی اسلامی اصولِ انتخاب بے امکان نظر آنے لگا۔ اسلامی فکری اجتماعیت

کا پیرہن تارتا رہا اور جمہوری عرضی انفرادیت نے قوم کے ذہنی افہام پر ابہام
 سے مسلح ہو کر ہلہ بول دیا۔ کاش کوئی ایک تو یہ سوچتا کہ سانپ کے انڈے مورنی لاکھ
 خلوص کے ساتھ سینتے ہر آمد تو وہی ہوگا جو ان سے ہونا چاہیے۔ کسی کو بھی یہ یاد نہ
 رہا کہ نظام اسلام کے نفاذ کے لئے منتخب صدر کے لئے مجلس مشاورت درکار ہے۔
 اقتدار یا شرکت اقتدار خلاصہ نہیں۔ آئین اسلام کے نفاذ کی ذمہ داری میں شرکت و
 معاونت کا عمل جاری ہوا ہے انسانی حاکمیت کے قیام کا نہیں۔ انتخابی ہتھکنڈوں
 کی ہتھیلیوں پر جو سروسوں جی اُس نے زرد سرمایہ کے بل بوتے پر اندھا دھند بسنت
 منائی اور اسلامی انتخابی منشور کا ”بوکاٹا“ ہو گیا۔ باوجود صدقِ دل اور خلوص نیت
 کے یہ نہ جانا کہ امیدواروں میں مقابلہ اور ہم جوٹی جو طالع آزمائی کی بجائے انتخابی امر
 کو مشاورتی طریق سے سرانجام دینا ضروری ہے کہ مغربی جمہوری طریق انتخاب سے
 قومیت اسلام کی جڑ کٹتی اور ملت اسلامیہ گروہوں میں بٹتی ہے۔ تسلیم کہ مغربی جمہوریت
 کی دین سیاسی پارٹیاں موجود تھیں۔ حکومت و صدر مملکت کے خلاف ان کا رویہ
 منفی تھا۔ سیاست کی چاندی کو لاجواب ہو کر ”چھپ کا پہاڑ سناؤ“ کہنے کی عادت
 تھی۔ تسلیم کہ بائیکاٹ کے خطرات و اثرات سے بھی بچنا تھا مگر اسلام کے
 انتخابی نظام کے اسوہ حسنہ میں ان قباحتوں کا علاج موجود تھا۔ جسے آزبایا جاتا
 تو ان افراد کے بائیکاٹ سے پیشتر انتخابات ان کا بائیکاٹ کر دیتے۔ صد
 افسوس کہ اسلامی انتخابی منشور بلیک بورڈ پر لکھا ہی رہ گیا اور بیوروکریسی نے
 چھٹی کی گھنٹی بجادی کہ ”فائن ڈے“ ہے، قوم کا حق ہے کہ انتخابی موسم ”اینجائے“
 کرے۔ یہ حربہ مؤثر رہا اور مغربی جمہوریت کے دیوا استبداد نے نیلم پری کارو پ دھارے
 وہیں صدائے گدا لگائی۔ جہاں شبِ گزشتہ نقب زنی کی تھی۔ بیوروکریسی نے
 غالباً دورانِ ریفرنڈم ہی یہ طے کر لیا تھا کہ انتقال اقتدار ہو یا شرکت اقتدار،

پالسنہ ہو کہ پڑا ہماری ہی مٹھی میں رہنا چاہیے۔ قارئین اپنی اپنی بساط، تجربہ اور
 مشاہدہ کی بنا پر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ امیدواروں اور رائے دہندگان کے واسطے
 سے کتنی اسلامی قدریں محفوظ رہیں، کتنی پروان چڑھیں اور کتنی برباد ہو گئیں۔ اے
 قوم! مسئلہ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن پیدا کرنے کا نہیں تھا،
 سربراہ مملکت اور سربراہ حکومت کے دو مختلف عہدوں کے وجود و عدم وجود کا تھا،
 یہ سوچنے کا تھا کہ حاکمیت الہی میں امیر مملکت کے مشیر و عمال تو ہوتے ہیں۔ کیا
 منتخب نمائندوں کے مرہونِ منت و وزیر احسان ارکان کا بیٹہ بھی ہوتے ہیں۔ مملکتی
 حکومتی سربراہی کے لئے اللہ اور رسولؐ کے معتمد و رکار ہوتے ہیں یا ان عوام کے
 جنہوں نے اللہ اور رسولؐ کی پسند و ناپسند پر اپنی اغراض و پسند کو ترجیح دی ہو۔
 کیا کپکپاتے ہوئے مغربی پارلیمانی نظام کو قرارداد مقاصد کے لحاف میں لپیٹ دینے
 سے معاشرتی امراض کا علاج ہو جائے گا یا اس کے اندر کے چور کو بکڑنا بھی ضروری
 ہے۔ کیا یہ مغربی جمہوری انتخابی قباحتوں کی کامیابی نہیں کہ گوشواروں سے مستثنیٰ
 قرار دینا پڑا، سرکاری ملازموں کے رشتہ دار ہونا اہلیت و فضیلت قرار پایا۔ کیا
 یہ بند باندھنے کی بجائے پل تعمیر کرنے کا عمل نہیں ہے۔ اسے خود اعتمادی کی ٹوٹ
 پھوٹ کہا جائے گا۔ جناب صدر اور پارلیمان کی آئندہ ذمہ داری نظام اسلام
 کا مکمل نفاذ ہے۔ پارٹی بازی اور تفرقہ آرائی کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔ تو پھر
 سیاسی پارٹیوں کے وجود اور عدم وجود کا فیصلہ آئندہ پارلیمنٹ کی صوابدید
 پر چھوڑنے کی بجائے بحال کردہ آئین کی ہر شق کو آئین اسلام آشنا کرنا، پارلیمنٹ
 کی ذمہ داری ہونا چاہئے۔ کسی پارلیمنٹ کو قرآنی محکمت میں ترمیم کی اجازت
 نہیں دی جاسکتی۔ پارلیمنٹ اجتہاد کا ادارہ ہے۔ اس کے دائرہ کار میں امور
 روزمرہ کے واسطے سے قرآن سے دانش حاصل کر کے لائحہ عمل متعین کرنا ہے۔

آئین اسلام کا من و عن نفاذ اولین پارلیمانی کارروائی ہونا چاہیے۔ محکمت تشخیص طلب نہیں ہوتے، اطاعت طلب ہوتے ہیں۔ مغربی طریق انتخاب نے اسلامی انتخابی منشور کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کا تجزیہ جناب صدر اور پارلیمان کی ذمہ داری ہے۔ ہم تو فقط آہ سرد ہی بھر سکتے ہیں۔ حزب احتساب اور یہ پراپوزیشن کہ سیاسی جماعتیں بحال ہونا چاہئیں یا نہیں، اگر ہوں تو تعداد کیا ہو، راہ لگانے کا نہیں راہ دینے کا عمل ہے۔ مجالس مشاورت امیر مملکت کی قوت کا سرچشمہ نہیں ہوتیں۔ فریق نہیں ہوتیں، رفیق ہوتی ہیں۔ کسی معاون کا اختیار طلب کرنا ذوق تعاون نہیں ہوتا۔ جذبہ رقابت ہوتا ہے۔ مارشل لا کے جلدی اٹھائے جانے کی بجائے اگر نظام اسلام کا فوری نفاذ ہو تو کیا مارشل لا جاری رہ سکتا ہے۔ مارشل لا اور سول حکومت اگر بیک وقت قائم نہیں رہ سکتی تو آئین اسلام اور آئین جمہوریت غرب کا بیک وقت اطلاق بھی ناممکن ہے۔ دونوں میں اللہ کی حاکمیت اور انسانوں کی حاکمیت کا فرق ہے۔ آئین اسلام کے نفاذ کے بغیر فقط قوانین اسلام کا نفاذ نظام اسلام نہیں ہو سکتا۔ مارشل لا جلدی اٹھنا چاہیے، جمہوریت فوراً بحال ہونی چاہیے۔ پارلیمنٹ با اختیار ہونی چاہیے، ترمیم پر پارلیمنٹ میں فیصلہ ہونا چاہیے۔ صدر مملکت اور ان کے ساتھ فوج کو بے اختیار ہونا چاہیے، دھڑے بندی و گروہ سازی پارلیمنٹ کے ارکان کا بنیادی حق ہونا چاہیے، سیاسی پارٹیوں کو بحال ہونا چاہیے۔ یہ سب فکر صدر اور رجحان پارلیمان کو محاذ آرائی کرنے کی چالیں ہیں۔ بائیکاٹ کرنے والے پارلیمان کی پیٹھ ٹھوک رہے ہیں کہ تو ہی ملک کی سپریم پاور ہے، اپنے وجود کو منوا۔ جس دن منوانے کا یہ عمل شروع ہو گیا، بائیکاٹوں کی پانچوں گھنٹی میں ہوں گی اور پارلیمان کڑا ہی میں ہوگی۔ بائیکاٹوں کا ترنوالہ۔ پتہ ہی تب چلے گا جب سب کچھ نکل کر

مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہے ہوں گے۔ صورت حال کا علاج مجوزہ سیاسی مفاہمت
 نہیں۔ یہ از خود مغربی جمہوری سیاست کے جال میں پھنسنے کا عمل ہوگا۔ مارشل لا
 بٹائیے مگر نظام اسلام لائیے۔ صحیح راہ اختیار کی گئی تو کوئی رقیب اقتدار قوت دم
 نہیں مار سکے گی۔ بشرطیکہ موجودہ پارلیمنٹ حدود اسلام کی پابند اور صدر مملکت نگران
 و پیش رو اور مخلص میرکارواں رہیں۔ صدر مملکت کے پارلیمنٹ سے خطاب
 اور وزیراعظم کے قوم سے خطاب میں بالترتیب نظام اسلام اور جمہوریت پر زور
 کے تفاوت میں ہی آئندہ کے حضرات پنہاں ہیں۔ نہ اسلام پھلے پھولے گا، نہ
 جمہوریت بار آور ہوگی۔ تا وقتیکہ یہ بھی عسکری حکمت عملی نہ ہو جس سے ہم
 سویلین اپنی ناتجربہ کاری اور کم علمی کی وجہ سے نا آشنا ہیں۔ مغربی جمہوریت سے
 تو بہ نہ ہوئی، نظام اسلام نافذ نہ ہوا تو مارشل لا کو اٹھانے اور بٹھانے کے عمل
 سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔ اور اس کسرتِ بلا جواز سے ہر محب وطن کا دل
 دکھے گا۔ یہ ہوائی تو چھوڑی جا چکی کہ بائیکاٹ حزب اقتدار طلب مذہب کو سیاست
 سے جدا رکھنے کے اصول کی پیروی کا رہے۔ یوں ہوا تو ملک و سیاست کا تو نہ معلوم
 کیا ہوگا اگر فقط صدر مملکت کی ذات سے ہی دین کو علیحدہ کر دیا جائے تو باقی ایک
 فوجی سربراہ کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ شرافت، دیانت، مروت دین سے
 جدا سیاست میں ذاتی اوصاف ہوتے ہیں، سیاسی نہیں۔ اگر ہوتے تو
 امریکہ میں واٹر گیٹ سکیڈل کے علاوہ برطانیہ میں جنسی سکیڈل رونما نہ
 ہوئے ہوتے۔ انتخابات نفاذ اسلام کے لئے ہوئے تھے مگر انتخابات کے
 بعد اکیں اصرار کے ساتھ جمہوریت اور اسی کی بجالی کے نغے الاپ رہے ہیں۔
 نظام اسلام کا نام کوئی لیتا بھی ہے تو فقط زیب داستان کے لئے۔ یہ فکر و
 عمل راسخ ہوا تو یقیناً گنگا الٹی بہے گی۔ محرابِ پیشانی تو ہوگی مگر بتانِ آزر کا

طواف سیاسی مجبوری بن کر رہ جائے گا۔ صاحبو! مجالس مشاورت اور مشیروں کا دائرہ کار ہرگز وہ نہیں جو مغربی جمہوری پارلیمنٹ کے دیواستبدال کا ہوتا ہے۔ تاج پہننے اور کپڑوں میں پیوند لگا کر نظام حکومت قائم کرنے میں بڑا فرق ہے۔ تاج بندوں کو ڈرانے کے لئے پہنے جاتے ہیں اور پیوند اللہ سے ڈر کر لگائے جاتے ہیں۔ وزیر اعظم کی تقریر کے محرر پر یہ امر واضح ہو کہ گروہی وزارتی تقسیم کو قومی حکومت نہیں کہتے۔ نامزد وزیر اعظم کو سبھی کا منظور کر لینا اظہار بے چارگی نہیں، مظاہرہ رو باہی ہے اس لئے کہ انتخاب پر سرمایہ خرچ نہیں کیا گیا، لگایا گیا ہے اور متعلقہ قوانین نافذ العمل ہیں۔ استحکام پاکستان کے لئے صدر اور پارلیمنٹ کا فکری طور پر یک جہت ہونا لازم ہے اور اللہ کی رسی اجتماعی طور پر مضبوطی سے پکڑنے کے لئے ہوتی ہے، رستہ کشی کے لئے نہیں ہوتی۔ مغربی جمہوری نظام سیاست کے قمار باز عالم پیر کو عالم نزع میں طاقت و نشہ کے لئے ٹیکے لگا رہے ہیں۔ اور جہان نو نمود کو مؤخر رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگ رہا ہے۔ سربراہ مملکت و سربراہ حکومت کے عہدوں کی تقسیم، صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن، با اختیار پارلیمنٹ، یہ وزارت طلبیاں، یہ مقبولیت کی نمائشیں، یہ قبول فی الفور، یہ انکار مؤخر، یہ وقت مناسب کا انتظار اسی ایک سلسلہ کی ترتیب وار کڑیاں ہیں ارادے بالآخر سیر طہی کھینچ لینے کے ہیں۔ با اختیار پارلیمنٹ اور کابینہ کے ساتھ جو کھیل، ماہر بیورو کریسی مغربی جمہوری نظام میں کھیلتی ہے، ٹیلی وژن پر ”لیس منسٹر“ کی سیرز دیکھنے کے بعد واشگاف ہے اور پھر ہمارے ٹیلیوژن پر وگرام ترتیب دینے والے اُس شخص کو حُسن کارکردگی کا ایوارڈ ملنا چاہیے۔ جس نے انتخابات کے نتائج سنائے جانے کے دوران ”گٹ گٹ باجرہ میں کوٹھے اُتے پانی آں۔ ہاں وے ماہی میریا میں کوٹھے اُتے پانی آں۔ آؤن گے کاگ اڑاجان گے۔ مینوں نواں پواڑا پا جان گے“ والا نغمہ

بھی سنایا۔ موجودہ مغربی جمہوری انداز انتخابات کے نتائج نے نظام اسلام کے نفاذ کے صدق و خلوص کو جس پریشان سوچ و بچار کے سپرد کر دیا ہے، وہ لمحہ فکریہ بھی ہے اور اُمت کے لئے سانحات کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ ورودِ حالات کے باوجود پارلیمان اگر مغربی جمہوریت کے خول سے نکل کر نظام اسلام کو بلا شرکت غیرے اپنالینے کا تہیہ کرے تو حدشأت سے اب بھی بجز و خوبی نپٹا جا سکتا ہے۔ ناخدا اور مسافر ایک ہی کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔ مختلف سمتوں میں چپو چلانے کا عمل نہ سازگار ہو گا نہ کارساز، اور نظام اسلام سے مراد آئین اسلام کا نفاذ ہے۔ آئین اسلام کے نفاذ کے بغیر ریاست اسلام کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں۔ جناب صدر رزم حق و باطل ہو تو فطرت کے مومنوں سے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ مگر حلقہٴ یاراں ہی رزم آزما ہو تو فطرت اغماض نہیں کیا کرتی۔



جناب والا ! حاکمیت اللہ ہی کی ہے لٹائیے نہیں لٹائیے

جس کا عالم پُر آب اپنی نگاہ سے نہ دیکھا ہو، اُس کی دل گرفتگی اور رقت کی تصدیق محض انداز گفتگو یا تیورِ کلام کے پیشِ نظر نہ ممکن ہے، نہ مناسب۔ خدا معلوم! زبانِ خنجرِ پکاری یا آستینِ کالو بول اٹھا۔ قلب و نظر کے ایمان نے انگڑائی لی کہ قلبِ انتشار کو خدا یاد آیا۔ فریب خوردہ شاہینِ خیال پر اتفاقاً طریقِ شہبازی فاش ہو یا فطرت نے ہم نچیروں کا بھی اندازِ نگاہ بدلنے کی ٹھکان لی۔ صوفی و ملا کی کورنگاہی کے ڈبوئے سیفینے پھر اُبھرنے لگے۔ کوئی جذبِ بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا یا بتِ خانہ آزر میں کلہاڑا محض سہواً اٹھ گیا۔ حضرت موسیٰ دریا پار کر گئے یا ڈوہتی خدائی لیلیائی۔ یہ دربارِ پرویز کی چوبِ شاہی کی دھمک ہے کہ تیشہ فرہاد کی ضربِ کوہ کنی۔ اکبر جلالہ کے دل میں زیارتِ سلیمِ چشتیؒ کی امنگ پیدا ہوئی یا سلیم نے الف ثانی کو زیر کرنے کے لئے کوئی نئی چال چلی۔ دورانِ صلوة مصلیٰ اپنی بساط سے آگاہ ہو یا اقتدار کی ذہنی بساط پر مصلے تک کے فویل پکارا اٹھنے کا سماں برپا ہوا چاہتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کی متمنی ۱۹۴۷ء کی بکھری ہوئی لاشیں دربارِ الہی میں فریاد کناں ہوئیں یا ۱۹۷۷ء کے سینہ کھول کر گولی کھاتے ہوئے نظامِ مصطفیٰؐ کے کسی فدائی کی کوئی ادا کام کر گئی۔ یہ عقلِ پختہ کار کی مصلحتِ بینی ہے یا عشقِ صادق نے ابنِ الوقتی کا گلا دبوچ لیا ہے۔ یہ واقعی درمانِ دردِ دل ہے یا صرف سیاست

مغرب آلود کا علاج ڈھونڈ نکالا گیا ہے۔ کسی بے لوث فقیر کی بات دل میں اتر گئی یا ذہانت شاطر نے بساط سیاست پر فریب کے خالی خلعے میں اپنے اسپر فکر کو لاجبایا ہے۔ کہ حرص اقتدار کے تمام پیادے حیران و ششدر پڑے گھرک رہے ہیں کہ اب کہاں جمیں۔ ہم تو خیر سر پھیرے ہیں لیکن کسی باوردی انسان کا موجودہ زمانے اور حالیہ بین الاقوامی حالات اور وابستگیوں کے ہوتے ہوئے ایک نیرامداد ترقی پذیر ملک کی سر زمین اور اسلامی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یوں لٹکار کر مغربی جمہوریت کو دفنانے کے انداز میں خیر باد کہنا اور اسلامی ممالک کی غیر اسلامی گروہ بندی، سپر نوازی، اشتراکیت، سرمایہ داری و یہود و نصاریٰ کی اطاعت گزاری کو یوں لٹاڑنا کوئی سر راہ گذر اظہار خیال بے گرفت نہیں۔ بندوں کی حاکمیت کے پروردہ پختہ ذہن یہودی و نصرانی، مغربی و مشرقی چابک دستوں کی شہ رگ سے بھی نزدیک چوبند موجودگی کے باوجود بندوں کی حاکمیت کے نظام ہائے سیاست سے اتنا برجستہ انکار اگر مبنی بر اخلاص ہے، مصالحت گزیدہ نہیں تو ایسا جہاد فکر ہے کہ تاریخ ارتقاٹے انسانی کے نام نہاد راہ نمادوں کا ماتم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ جمہوریت کے دیواستبداد کو یوں رسن دار سے باندھ دینا نواٹے قیصری کو شور تکبیر میں یوں گم کر دینا، سراب رنگ و بو کو سر سبز گلستان میں تبدیل کر دینا، قفس کی تیلیوں کو یوں بکھیرنا کہ آستیان بلند از خود تعمیر ہو جائے۔ بندوں کو گننے کی بجائے یوں کھلے بندوں تو لنے پر اصرار کرنا، غاڑہ و ساعز و مینا کی کرامات سے روشن چہروں کے چنگیز سے تاریک تر اندرون سے یوں پردہ اٹھانا کہ چھپائے نہ بنے، شاہی کے جمہوری لباس کو اتار کر جمہور کے اندر پنہاں حرص و آزار کو بیکسر برہنہ کر دینا، سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کو یوں ضرب کاری لگانے کا اعلان تعمیر انسان اور تعبیر خودی

کی وہ درخشاں مثال ہے کہ یقین نہیں آتا کہ صدر مملکت نے واقعی مغربی جمہوریت اور آئین پیغمبر کے مطالعہ اور غائر تقابل کے بعد یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تصور اقبال کی دین کے اس ملک میں مغربی جمہوریت کا نہیں، آئین اسلام کا نفاذ ہوگا۔ اور طے ہو چکا کہ اسلام ریاستی مذہب نہیں، دین ریاست ہوگا اور اسلام ہمارا مذہب ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے، کے تضادات ختم کر کے پاکستان کو آفاقی آئینی یک سوئی کی راہ پر ڈال دیا جائے گا۔ وطن و قوم و قومیت کی اصطلاحات کو اسلامی ملی توضیحات عطا ہوں گی۔ نہیں۔ یقین نہیں آتا، ایسا کیونکر ہو سکتا ہے، کوئی ایسا کیونکر کر سکتا ہے۔ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی یا دشمنی میں اڑ گئی ہوگی۔ اس لئے کہ دین اسلام کا نظام، آئین شریعہ پیغمبر کا نظام، محمد مصطفیٰ کا نظام تو بڑے بڑے جُعبہ پوشوں اور دستار آویزوں کو بھی دل سے قبول نہیں ہوا تھا، ثانوی مسئلہ قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ تو بے بد بیضا پھیلی ہوئی آستینوں کا زمانہ ہے۔ تاویلات و پاپائی پیشوائی الیات کا زمانہ ہے۔ نسل، قومیت، سلطنت، تہذیب، رنگ کے خواجہ ساز مسکرات کا زمانہ ہے۔ خیالی دیوتاؤں کے لئے کٹ مرنے اور سکر کی لذت میں نَفذ حیات لٹوانے کا دور ہے۔ جناب صدر کے ماحول میں تو ابھی گرمی ہنکاٹہ جمہور دید، پردہ پر روٹے بلو کیت کشیدہ کے مظاہرات کے شب و روز ہیں۔ جو بیوروکریسی کی گھڑیاں دیکھ کر طلوع و غروب ہوتے ہیں۔ ابھی تو گرمی گھنٹا۔ اعضاءے مجالس، آئین و اصلاحات و رعایات و حقوق کے خواب آوری بیٹھے مزے لینے اور آزادی افکار کے بڑ بڑانے کا عرصہ حیات ہے۔ ابھی کر مک نادان کے طواف شمع سے آزاد ہونے اور فطرت کے تجلی راز میں آباد ہونے کے دور دور تک آثار نہیں ہیں

ابھی حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفرین نظام کے برپا ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ابھی تو لوگوں کو یہ سننا بھی گوارا نہیں تھا کہ یہ زمین پادشاہوں یا ریاست کی نہیں، اللہ کی ملکیت ہے۔ ابھی تو یہ دریافت کرنا بھی لائق تعزیر تھا کہ بیج کوسٹی کی تاریکی میں کون پالتا ہے۔ کون بارش لاتا ہے اور کون موسم بدلتا ہے۔ خوشوں کی جیب دانوں سے کون بھرتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ انسان نہیں کرتا تو زمین پر حق قبضہ و ملکیت کیوں جتا ہے۔ ابھی تو اجتہاد و الحاد میں امتیاز دانش انسان کو ناپسند تھا۔ ابھی تو سرکاری مشاورت تک حدود و تعزیر کے بنیادی اصولوں سے ناواقف تھی۔ ابھی تو عقلِ انسان شرکتِ دانشِ خداوندی کے لئے سرنگیں کھود رہی تھی۔ ابھی تو وہی سلطان تھا جس کی نظر غیر کی کھینتی پر ہو۔ ابھی تو دانشوروں کو پیغمبرانِ بے کتاب کی تلاش تھی۔ سرمایہ پر اجارہ داری کا دور تھا۔ وسائلِ زمین ملکِ سلطنت تھے۔ ابھی تو علمائے دین مراتبِ زن بھی طے نہ کر پائے تھے ابھی تو سیاست کی ”بی جالو“ جوان تھی، ابھی تو دانش نے اجرت پر بھنگڑا ڈالنا تھا۔ ابھی تو صد ہزاروں کے ہزاروں دس ہزاری زندہ و پائندہ تھے۔ ابھی نو قارون کے اونٹ خالی شکم ہونے کے شکوہ کناں تھے۔ ابھی نو چادر زہرا پر بولی چڑھ رہی تھی۔ کلیم بوزر کے تاجر آوازے اٹھا رہے تھے کہ نیا مال آیا ہے۔ دلِ اولیس کے لئے دل آویز شوکیس تیار کئے جا رہے تھے۔ ابھی تو سیاست کی نویلیاں نئی ”ٹور“ دکھانے کے لئے ستاروں والی جوتیوں کا تقاضا کر رہی تھیں۔ ابھی تو رقصِ زنجیر کی گرمیاں برپا تھیں۔ طاؤس و رباب و سرور شراب کی محویت اپنے عروج پر تھی۔ ابھی تو رقصِ زنجیر کی گرمیاں برپا تھیں طاؤس و رباب و سرور و شراب کی محویت اپنے عروج پر تھی۔ آزادی افکار

کا الحاد اپنے نصف النہار پر تھا۔ طوقِ مغرب کی چمک دیدہ مومن تک کو چڑھیا
 رہی تھی۔ دین کے مقابلِ رقصِ لادینیت برپا کرنے اور لہو پی کر درس مساوات
 دینے کے دن تھے۔ ابھی تو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اجارہ پرستوں
 کا درسِ سوشلزم مکمل نہیں ہوا تھا۔ اور بڑے انہماک سے سنا جا رہا تھا۔ ابھی
 تو اللہ کی حاکمیت کے غاصب بندوں کی حکمرانی کے فضائل بیان کر رہے تھے
 ابھی اسلام کے تصورِ آزادی انسان کا تابوتِ مکار و انشوروں اور سیاستدانوں
 کی صف ہائے نماز جنازہ کے سامنے سجایا رکھا تھا۔ رعنائیِ تعمیر میں، رونق
 میں، صفا میں، بینکوں کی عمارات کو مساجد پر فوقیت حاصل تھی۔ معیشت
 تجارت و حکومت سود اور شہ کی زد میں تھی۔ ابھی تو بجلی کے چراغوں سے روشن
 گھروں کے رہائش پذیر پیروں کو مریدوں کے گھروں کے بہت سے دیئے بجھانے تھے
 جس کھیت سے دہقان کو روزی بیسرنہ ہو اس کو سرسبز رکھنا اور خالق و مخلوق
 کے درمیان پردے ڈالے رکھنا مقصود تھا۔ ابھی توفی سبیل اللہ فساد کر کے
 قبروں کی تجارت کو مزید فروغ دینا تھا۔ ابھی تو خود نہ بدلنے اور قرآن کو بدل دینے
 کا دستور کار فرما تھا۔ ابھی تو لٹتی ہوئی عصمتیں، بکتے ہوئے انصاف کے پلازوں
 میں اپنی چادریں تلاش کر رہی تھیں۔ ابھی تو بھرے بازار میں بندوں نے خدا
 کا مول لگانا تھا۔ ابھی تو عزت نفس کا رُواں رُواں حزنِ حزن اور تحف،
 تحف پکار رہا تھا۔ ابھی تو کروڑوں بیویوں کی اپنی خاوندوں کو قتل کرنے
 کی خواہش تشنہ تھی۔ ابھی تو دریودھن کا دربار سبنا اور درویدی کا ننگا سوتا
 باقی تھا۔ ابھی تو اکثر مائیں اپنے ارحام میں قتلِ اولاد کے منصوبے بنا رہی تھیں
 ابھی تو بھائیوں کو بھائیوں کا گوشت مزیدار معلوم ہوتا تھا۔ ابھی تو بتانِ آزر
 کو مزید سجایا جاتا تھا۔ ابھی تو بیت المال کے تیل سے شاہوں اور ان کے اعمال

کی دیوالی کے دیئے سیراب رکھنے کا دستور زیبا تھا۔ خوٹے غلامی کو مزید سختگی
 درکار تھی۔ ابھی تو ہر فرہاد دیوندا اور بریلی کے درمیان آگ کے دریا بہانے
 کے ٹینڈر فارم پُر کر رہا تھا۔ ابھی تو دین و دنیا کے گرگ ہائے جہاں دیدہ نے
 مار ہائے آستین کی کھلی جنگ دیکھنا تھی۔ ابھی تو ڈیموکریسی کی زلفیں
 سنور رہی تھیں۔ بیوروکریسی فتنہ لگائے بیٹھی تھی۔ یہ بے وقت اعلان کیوں
 صا اور ہو گیا کہ پاکستان مغربی جمہوریت کے پنجے سے آزاد کر دیا جائے گا۔۔۔ اور
 یہ کہ ملت اسلامیہ کے اتحاد سے غافل لوگ اپنے فرائض سے غیر آگاہ ہیں۔۔۔
 یارو! یقین دلاؤ۔ کیا یہ واقعی سچ ہے۔ اگر یہ واقعی سچ ہے اور یہ اعلان اتفاقی
 یا سانسختی نہیں تو پھر جناب صدر! گزارش ہے کہ تقاضائے آئین اسلام یہ
 ہے کہ حاکمیت اور اقتدار بندوں کو نہیں، اللہ اور شرع الہی کو یوں منتقل کیا
 جائے کہ بشمول آپ کے ہر کوئی اہل کار بن کر رہ جائے۔ مولائے ملک نہ ہو۔ عبدہ
 ہو۔ آئینی طور پر تسلیم کیا جائے کہ قرآن پاک اصول ہائے تشکیل حکومت، قانون
 سازی اور ضابطہ حیات کی مکمل موثر اور متحرک کتاب ہے۔ آئین کا یہ ضمن
 ناقابل ترمیم بھی ہو اور ناقابل تنسیخ بھی۔ اسلام کو فقط ریاست کا مذہب (دین
 نہیں) قرار دینا اور باقی تمام سرچشمے دیگر مکاتب فکر مثلاً جمہوریت، سوشلزم
 اور عوامیت کے نام منتقل کر دینا اور پھر ان پر ذاتی اجارہ داریاں قائم کر
 دینا عقل عیار کو مختلف بھیس بدلنے میں ماہر بنانے کے عمل کے سوا کچھ بھی
 نہیں۔ اسلامی جمہوریت، مغربی جمہوریت، مشرقی جمہوریت۔ قومی جمہوریت
 مغرب زدہ فکر استبداد پسند کی نیلم پریاں ہیں۔ جو اپنی فکر میں منافق،
 نظریہ میں مشرک اور پیشہ کے لحاظ سے تاجر ہیں۔ یہ کپنچنیاں سیاسی خانہ
 بدوشوں نے پال رکھی ہیں۔ جو دن کی روشنی میں پیشہ وارانہ گدائی کرتی ہیں۔

اور راہ زنوں کو راہ نمائی کے بہرہ میں وارد کر دیتی ہیں۔ اسلام کا آئینی نظام جمہوریت نہیں، جناب والا! "عبودیت" ہے۔ یہ اللہ کی حاکمیت، بندوں کی عبودیت اور انسانوں کی انسانوں سے حریت کا نظام ہے۔ اسلام اسی نظام حریت کا علمبردار ہے، جمہوریت کا نہیں۔ یہ درس فریب ہے کہ یورپی نے اسلام سے جمہوریت سیکھی ہے، نہیں، یورپ نے اسلام کے نظام حریت کے خلاف ایک سازش کی ہے۔ اللہ کی حاکمیت کو غصب کیا ہے۔ انسانوں کی حاکمیت سے آزاد کئے گئے۔ انسان کو نہایت عیاری سے پھر بندوں کی حاکمیت کا مطیع کیا ہے۔ انسانوں سے مقام عبودیت کی تکمیل اور اس کے فضائل و انعامات چھینے ہیں۔ جناب والا! لفظ اسلام آئین اسلام کی ایک لفظی قرارداد مقاصد ہے۔ "اسلاماً دینا" سے مراد اسلام بطور دین ہے۔ اسلام کا دین نہیں۔ سورۃ فاتحہ اس قرارداد مقاصد کا دبیہا ہے۔ الحکم اللہ الملک اللہ اور الارض اللہ آئین اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ لا الہ الا اللہ ہر ضمن آئین اسلام کا مؤثر و متحرک راہ نما اصول ہے۔ مادی وسائل کی نہ حکومت مالک ہے۔ نہ فرد، نہ عوام۔ حکومت و فرد و افراد صرف امین ہیں ان امانتوں پر کسی کو جائز ضرورتوں سے زیادہ حق تصرف حاصل نہیں۔ ملکی وسائل پر ہر شہری کا برابر کا حق ہے۔ یہ حق اگر تسلیم کر لیا جائے۔ نافذ کر دیا جائے تو آج کی صوبائی محرومیوں کی شرارت کی امر بیل از خود سوکھ جائے گی۔ قانون کہ حاکم کی مرضی کا ہی نام ہے۔ اسی کی مرضی کا ہی نافذ ہوگا۔ جس کی حاکمیت پر اسلام اصرار کرتا ہے۔ آج کے نظام میں جو قانون ہے وہ ہی حق ہے۔ اسلام کے نظام میں جو حق ہے۔ صرف وہی قانون ہے جو مبنی بر عدل نہ ہو۔ اسلام اسے حکم تسلیم نہیں کرتا۔ انسانوں نے مختلف ہتھکنڈوں اور

بہانہ ساز یوں سے جمہوریت، پادشاہت، آمریت اور کئی دیگر معروف
 پردوں میں اللہ کی حاکمیت غصب کر رکھی ہے۔ مگر نادہندہ صدیوں سے
 لوٹا نہیں رہے۔ ان غاصبوں نے نواسٹہ رسول کی جانِ علیؑ، اللہ کی حاکمیت
 نہ لوٹائی۔۔۔ جناب صدر! آپ بھی ایک بندہ ہیں۔ آپ نے بندوں سے
 حاکمیت لی۔ آج حاکمیت آپ کے پاس ہے۔ یہ دراصل اللہ کی حاکمیت ہے
 اسے اللہ کو لوٹائیے۔ اور بہ بانگِ دہل اعلان فرمائیے ”ایاک نعبد وایتیخ
 کے صفحات پر چند سطر ہی خالی ہیں۔ ان پر کچھ اور لکھا گیا تو شاید آپ
 اسے پڑھنے کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں۔۔۔۔۔ اسلامی ریاست انسانی
 احکام و فرمان کی نہیں۔ اللہ کے احکام کے مطابق عدل و احسان کی ریاست
 ہوتی ہے۔ یہ دونوں ذمہ داریاں حکومت کی ہوتی ہیں۔ مجرم کو جرم کی جزا
 دینا اور جرم کے سرزد ہو جانے کی وجہ سے شہری کا جو نقصان ہوا ہے حکومتی
 کوتاہی تسلیم کر کے حکومت کا اُسے معقول معاوضہ ادا کرنا۔ حق دار کو اس کا
 حق دلانے کی ذمہ داری قبول کرنا نظام عدل و احسان کا بنیادی تقاضا ہے
 حکومت آئینی طور پر عدل و احسان کی پابند نہ ہو۔ آئیں اسلام نافذ نہ ہو۔ تو
 اسلام کے قوانین یا نیم اسلامی قوانین کے نفاذ کی کاوش کا بے سود رہنا
 مقدر ہو جاتا ہے۔ جناب والا! اللہ کے اصول ہائے قانون سازی اور
 انسانوں کے تمام مروجہ اصول ہائے قانون سازی کی شرع مختلف ہی نہیں
 متضاد م بھی ہے۔ پھر نفاذِ شرع اور نفاذِ شرع کے عوامل و نتائج بڑے
 مختلف ہیں۔ ان میں امتیاز ہی کی نہیں، احتیاط کی ضرورت ہے۔ حکم اور امر
 کا دائرہ اختیار بھی مختلف اور دائرہ کار بھی۔۔۔۔۔ آئیں اسلام میں اللہ
 کی حاکمیت اور اقتدارِ شریعت ابدی و ناقابلِ منتقلی ہیں۔ عبدی حاکمیت بہر

اسلام کے نظام حکومت کی نفی ہے۔ اسلام کے نظام میں اہل کار تبدیل ہوتے ہیں اقتدار منتقل نہیں ہوتا۔ انتقال اقتدار کے لئے آپسے ایسے انتخابات کا بھی مطالبہ کیا جا رہا ہے جنکے طفیل دیگر بندوں کی حاکمیت قائم ہو سکے۔ ان کی مرضی کو اقتدار و بالادستی و حکمرانی میسر آ جائے۔ یوں ہوا تو دین اسلام فقط مذہب بن کر رہ جائے گا۔ جو لوگ سیاست چھوڑ کر حصار دین میں داخل نہیں ہونا چاہتے وہ درخور اعتنا نہیں ہیں۔ یہ خانہ ابراہیم میں آزر کے سجائے ہوئے بت ہیں۔ میں خود بھی آزر تراشیدہ ہوں۔ مگر قرآن پاک کے آیتنی و دستوری مطالعہ کے بعد ”ھو اللہ احد“ پکارنے کے لئے بتے تاب ہوں۔ ذیر لب پکارتا تو ہوں مگر یہ نقار خانہ ذیر لب آوازیں دبانے میں بڑا مشاق ہے۔ اسلام کے طریق انتخاب میں اپنی پسند کے افراد منتخب کئے جاتے ہیں۔ نمائندے حکومت کرنے کے لئے نہیں اللہ کے اہل کار بن کر مشاورتی اداروں میں جاتے ہیں۔ اس طریق انتخاب میں عہدہ طلبی، نامزدگی اور مہم جوئی کی اجازت نہیں۔ اختلاف برائے اختلاف پر اتفاق نہیں ہوتا۔ اختلاف برائے اتفاق کا اصول کار فرما ہوتا ہے۔ مشاورت تلاش حق کے لئے ہوتی ہے۔ اخفائے حقائق کے لئے مجتہد برپا نہیں کی جاتی۔ اختلاف رائے کو اللہ اور رسول کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق ختم کیا جاتا ہے اتفاق تلاش دانش اور حدود اللہ کی پابندی بنیادی اور لازمی صفات قرار پاتی ہیں۔ بلوغت سے مراد جنسی بلوغت نہیں، شعوری بلوغت ہوتی ہے۔ انسان کو مکرم تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ تا وقتیکہ وہ اپنی تکریم اپنی بد اعمالی سے ضائع نہ کر دے۔ اسلام کا نظام انتخاب عددی نہیں صفاتی ہے انسانی درجات مادی وسائل کی بنا پر نہیں اہلیت اوصاف کی بنا پر متعین ہوتے

ہیں۔ وطن عزیز کو مختلف الحادی مکتبہ ہائے فکر نے کشت ویران بنا کر دکھ
 دیا ہے مگر ذرا نم ہوں تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ سیاسی
 فکری بیج کی دکانیں گندم ناجو فروشوں نے کھول رکھی ہیں۔ پھر فصل پکتی
 ہے تو یہ پُرکار مذاکرات کے لئے یہ کہہ کر آسن جمالیتے ہیں کہ اگر گندم نہ
 ملے گی۔ بھس تو ملے گا۔ یہ آج تک والسراٹے کو نسل اور آزاد قومی اسمبلی
 میں امتیاز نہیں کر پائے۔ خلفائے راشدین کی مجلس شوریٰ اور پیغمبر خدا کی
 محفل مشاورت کا فکر و سوز و عزم اُن لوگوں کا مقدر نہیں ہوتا جن کے گھر
 والے ہی پوچھتے ہوں کہ تو درونِ درجہ کر دی کہ اب باہر نکلنے کے بھی ارادے
 ہیں۔ نہ اُن لوگوں کا جن کا قصد صرف دو مسٹھی آٹا ہو مگر گلیوں میں ”میرے
 مولا مدینے بلا لو مجھے“ کی صدا بیٹے لگا رہے ہوں۔ جناب والا! اگر آپ واقعی
 اسلام کا نظام عبدیت لائیں گے تو کیفِ حریت کے زیر اثر کسی کا بھی دل نہیں
 چاہے گا کہ مغربی جمہوریت یا کسی دیگر ازم کے نظام کا تعاضا کرے۔ یا کسی ایسے
 شخص کا ہم نوا بنے جو لا دینیت کا پرچارک ہو۔ اور اگر یہ سب کچھ انسانوں
 گروہوں پارٹیوں یا اداروں کے درمیان اقتدار کے لئے رتہ کشی یا جنگ کے
 ہتھکنڈے ہیں تو پھر ہم فقیروں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ذرا اتنی احتیاط
 فریقین پر لازم رہے کہ اس رتہ کشی میں رتہ ہی نہ ٹوٹ جائے۔

جینتوں تو پیاسے ہمارے تو پیاسیری

اے انبوہ خوش فکراں، اے اجماعِ تہی دامناں، اے یعقوبانِ بے یوسف
 اے مختارانِ اذہانِ شکستہ، اے مغیلانِ چمنِ پژمردہ، اے مقلدینِ تیلوہِ آزر،
 اے آزر دہِ دلواورِ پژمردہ فکرو۔ اے کہ تمہاری ذہنی کیفیات قنوطیت نواز
 اور وارداتِ قلبِ حزنِ آزما ہو چکیں۔ تمہاری عرقِ آلودِ پیشانی پر تحریرِ تیوریل
 کی زبانِ بے حال پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تمہارے ذہن کی جواں سال بیوہ سے
 یہ فرمائشِ ناعاقبتِ اندیش کر دی گئی ہے کہ ہماری دلہن کی شبِ عروس کے لئے
 آرائشِ حسنِ کرو۔ بہاگ کی سڑوں پر یوں ملہاڑ گاؤ کہ درباری کا انگ نمایاں رہے
 اور بھاؤ بڑھ جائے۔ زلیخائے سیاستِ جشنِ حراستِ یوسف منائے شیرِ افگن
 کے تڑپتے ہوئے لاشے پر کھڑا نور الدین جہانگیر مہر النساء سے پوچھے، تیسرا کبوتر
 پکڑاؤں تو اڑاؤ گی تو نہیں۔ تم ایسی کیفیتوں میں گرفتار کر دیئے گئے ہو، جیسے
 لمحہ ممتاز محل کے سرہانے بیٹھا تاج محل بتوانے والا نکاحِ ثانی کے لئے سوچ رہا ہے
 میاں میرج بفسد ہوں کہ ایک مزید دربار صاحب کا سنگ بنیاد رکھنا ضروری ہے
 ورنہ ”پنجابی دربار“ کا مصرف کیا ہوگا۔ نظام الدین اولیا، حضرت علی ہجویری
 سے کہہ رہے ہوں، اب کسی ناقص کو کامل اور کامل کو راہ نما کرنے کی ضرورت

باقی نہیں رہی کہ علماء اور مشائخ کے ادارے قائم ہو چکے ہیں اور زمانہ دعاؤں یا
 نگاہِ فقر کا نہیں، ایف سولہ کا ہے۔ اور سولہ کا تو سن بھی قیامت ہوتا ہے۔ لہذا
 کوئی ضروری نہیں کہ عالمِ نو بھی منظرِ نورِ خدا کا فیض گنخور جاری رہے۔ تقاضائے اوقاف
 یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجدد الف ثانیؑ اب جو دھا بائی کی فرمائش پر جہلِ جلالہ کی طویل
 عمری کے لئے دعا گو ہوں۔ قرآن ایسے ہیں، جیسے ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں پردہ
 تہذیب میں غارت گری اور آدم کشتی کی تجویز پیش کر دی گئی ہو۔ جیسے رنجیت سنگھ کی سادھی
 پر کھڑا کوئی اجنبی بینارِ پاکستان کا نظارہ کر رہا ہو اور امریکی ریلوے انجنوں سے نکلتا ہوا دھواں
 درمیان میں حائل ہو جائے۔ جیسے بذریعہ عنبرائیل وحی نازل ہونے کا دعویٰ کوئی کاذب پیغمبر تو
 کر رہا ہو۔ جیسے جامِ جمشید میں لاشوں سے پٹا ہوا ایرانِ گلستانِ سعدی نظر آ رہا ہو۔
 جیسے ہابیل و قابیل کو جنم دینے کے خوف سے حوا خود کشتی کر رہی ہو۔ اور حضرت آدمؑ
 ہذہ الشجرۃ پڑھ کر حیثِ شتتہ کی تاویل نکال رہے ہوں۔ جیسے کوچہ رقیب میں
 غالب کی دستار بندی کی جا رہی ہو۔ جیسے دربارِ فرعون میں اکبر الہ آبادی کو بطور رشوت
 خلعت عطا کر کے دریافت کیا جا رہا ہو کہ بتاؤ الہ کہاں آباد ہے۔ جیسے فرشتے شکوہ اقبال
 پر لگائے گئے فتوے مطالعہ الہی کے لئے پیش کر رہے ہوں۔ جیسے حواریانِ عیسیٰ صلیب
 تک جانے والے راستے آراستہ کر رہے ہوں۔ جیسے قاتلانِ عیسیٰ عرض کر رہے
 ہوں کہ اے پالنے میں کلام کرنے والے مدعی نبوتِ پاپوش پہن لے کہ خدا نخواستہ
 کوئی کانٹا تجھ آبلہ پا کو چھب نہ جائے اور کوئی نہیں جو تم حالاتِ گرفتگاہ کو یہ یاد لائے
 کہ اے سقوطِ مشرقی پاکستان کا آئینی انصرام مہیا کرنے والو! تمہاری آبادیاں کتنی
 کٹی ہوئی گردنوں، لٹی ہوئی عصمتوں اور جلے ہوئے گھروں کی مرہونِ احسان ہے۔
 کتنے صد ہزار انجمِ غروب ہوئے تو تمہاری یہ سحر بھوٹی۔ کتنے ہلالِ قمر و بدر گرہن زدہ
 ہوئے تو تمہارا چاند چمکا۔ کتنے خون سفید ہوئے، کتنے دیدے سبز ہوئے تو تمہارا پرچم

لہرایا۔ اہں مقدس سرزمین کی طرف جلتے ہوئے کتنے پاؤں کٹے۔ اس سرزمین کی طرف آنے کے لئے کتنے بازو پھیلے کہ قطع کر دیئے گئے۔ رزق حلال کی تلاش میں بڑھتے ہوئے کتنے مسافروں کی انتڑیاں کاٹ دی گئیں۔ تلچ و بیاس و راوی میں کتنی لاشیں بہیں، کتنے نوے پھوٹے، کتنی سسکیاں خاموش ہو گئیں۔ ان شہیدوں کی روحیں جن کے بے تاب لب ہلے آرزو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوئے چونکتیں برس ہو گئے۔ تم سے پاکستان کے لخت لخت ہونے کی داستان پوچھیں گے، تو کیا جواب دو گے۔ اسلام کے بدترین دشمنوں کے ذریعہ سے تاریخ اسلام پر تحقیق کرنے والو۔ خلفائے راشدین کی باہمی رقابت پر مقالے لکھنے والو۔ خلیفہ اول کے انتخاب پر جھگڑا کھڑا کر کے جسد پاک رسولؐ کو انتظارِ تدفین میں رکھنے والو۔ قتلِ عثمانؓ و علیؓ کو مزے لے لے کر بیان کرنے والو۔ صلح حدیبیہ کے وقت عمرؓ کے ہاتھ میں شمشیر برسنہ دکھانے والو۔ جنگِ جمل کی مبالغہ آراء داستانیں تحریر کرنے والو۔ احادیث کی صحت اور عدم صحت پر تنازعے کرنے والو، تفسیر و تاویل میں امتیاز رکھے بغیر خود کو بدلنے کی بجائے قرآن کو بدل دینے والو۔ صحابہؓ رسولؐ ہی نہیں، ان کے متعلق بھی جواز روئے قرآن اُمت کی مائیں ہیں، انت نئی داستانیں تراشنے والو۔ پیغمبر اسلام کی ازدواجی زندگی کو اپنے معیار پر پرکھنے والو، تاریخ اسلام کو عمداً مسخ کرنے والو! تم جو آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ماہِ رمضان میں سحری و افطاری کے صحیح اوقات کیا ہیں۔ اذانِ صلوٰۃ مغرب کس وقت ہونا چاہیے۔ عشاء کی صلوٰۃ کی دراصل کتنی رکعتیں ہیں۔ تراویح میں نوافل کتنے ہیں۔ تم جو السلام علیک ایھا النبیؐ پکارنے اور رسالت و عبدیت کی شہادت لانے کے بعد تنازعہ کھڑا کر دیتے ہو کہ درود با آواز بلند ہونا چاہیے یا نہیں۔ تم اگر واقعی محقق واقعات و وارداتِ تاریخ ہو۔ اصل واقعات جاننے کے لئے تمہارے قائم کئے ہوئے کلیے اگر واقعی درست ہیں تو صرف اتنا بتادو کہ جن پر اللہ راضی ہوا، ان پر تم کیوں ناراض ہو۔

یہ بتانا چاہتے ہو کہ اللہ کا راضی ہونا صحیح نہیں تھا، یا یہ کہ اللہ کے راضی ہو جانے کے بعد وہ اللہ سے راضی نہ رہے۔ یہ سب امور جنہیں اپنی دکانیں چمکانے کے لئے تم نے قنازعہ کر دیا ہے، صدیوں پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے۔ تم اگر واقعی محقق ہو، اسلوب تاریخ نویسی سے آگاہ ہو، حقائق کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو تو بتاؤ، ایک رائے ہو کر، کہ قائد اعظم کی وفات کن حالات میں ہوئی اور وجہ حالات کیا تھی۔ لیاقت علی کے قتل کے محرکات کیا تھے۔ قتل کس نے کیا اور کیوں کیا۔ سہروردی اور فاطمہ جناح کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ غلام محمد، سکندر مرزا، محمد علی بوگرہ سربراہان حکومت کس طرح بنے۔ آئیٹن در آئیٹن کا عدم ہونے کی اصل وجوہات کیا تھیں۔ وہ رات کتنی روشن تھی جس میں سکندر مرزا جلا وطن ہوا۔ یحییٰ خاں آیا تو بادل کہاں کہاں چھلے اور برکھا کہاں کہاں ہوئی۔ سقوط مشرقی پاکستان کا اصل باعث کیا تھا۔ کون کون اس کا ذمہ دار تھا۔ ہتھیار کون کون ہتھیایا گیا۔ اتنی بڑی تعداد میں قیدی کیوں ہوئے۔ سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ عطا ہونا کس خدمت کا انعام اور کس فوجی خدمت کا صلہ تھا۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف کیا کیا اور کہاں کہاں سازشیں ہوئیں اور کس کس نے کس انداز میں کیں۔ صرف اندازے بیان ہوں گے، اصل حقائق سے کوئی دانشور تاریخ نویس آگاہ نہیں۔ فرینڈز ناٹ ماسٹرز پڑھو یا دیدہ ورا، عدم آگہی مقدر رہے گی۔ انصاف سے کہو، جو لوگ اپنے ہی زمانے کے اتنے اہم واقعات و سانحات سے آگاہ نہیں۔ تحقیق نہیں کر سکے، حق نہیں جان سکے، متفق نہیں ہو سکے، ان پر یہ اعتماد کیوں کر ہو کہ وہ صدیوں پہلے کے واقعات سے آگاہ ہونے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ اسلام کو ان کی تحریر کردہ تاریخ و تفسیر و تاویل سے جاننا و الفہمائیں ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ اپنے ماضی قریب سے آگاہ نہیں، ان کے ماضی بعید سے آگاہ ہونے پر یقین کر لینا حقائق کو قریب دینے کے

سوا کچھ بھی نہیں۔ اور اس سے بڑھ کر احمق اور دروغ گو شاید ہی کوئی ہو جو حال کو ماہی
 سے منقطع کر کے سوچتا ہے۔ جو ہو چکا جس کی نظر میں نہیں، جو ہو رہا ہے اس سے
 بے خبر رہنا اس کے مفرد میں ہے اور جو ہونے والا ہے اس کی سمجھ میں ہرگز نہیں آئے گا۔
 وہ نہیں جان پائے گا کہ جغرافیائی حدود اور نظریاتی حدود میں کیا فرق ہے۔ آزادی
 مملکت اور آزادی افراد کی صحیح توضیحات کیا ہیں۔ تحریر و تقریر و فکر کن حالات میں
 پابند ہوتے ہیں، اور ان کا اصل ذمہ دار کون ہوتا ہے۔ تہذیب و ثقافت و اعتقاد
 کو محفوظ ارتقا پذیر رکھنے کے لوازم کیا ہیں۔ وحدت ملت اور وحدت افکار میں کیا
 رشتہ ہے۔ بے تیغ اور بے زرہ لڑنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ کرگس و شاہیں کے
 جمائوں میں امتیاز کیوں کر کیا جاتا ہے۔ وہ بس اس ہی کو آزادی تصور کرے گا
 کہ منافع کی شرح بڑھانے کی آزادی ہو۔ لباس کی تراش ہر چھ ماہ کے بعد تبدیل
 جاسکے۔ جب جی چاہے گیسو دراز ہو جائے اور جب جی چاہے مادھو لعل حسین بن
 جائے۔ لاؤڈ سپیکر پر اذان دے سکے۔ چتر ہار اور الف نون دیکھ سکے۔ قانون اور
 رسوم و رواجات کی آنکھ بچا کر اخلاقی اقدار کو مسخ کرنے کی حد تک مجروح کر کے
 خود کو آزاد کملوانے والے کاش جانتے کہ مادر پدر آزادی کا نام سیاسی آزادی
 نہیں ہوتا اور جسے سیاسی آزادی کہتے ہیں وہ یہاں آج تک صرف سُنی اور پڑھی
 گئی ہے، دیکھی کبھی نہیں گئی۔ جس مملکت کے سیاسی معاملات درون ملک طے
 ہوتے ہوں اور اندرون ملک صرف تمہ ہوتے ہوں، وہ آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں
 ہوتی۔ جو ملک اپنے دفاع کے لئے خود کفیل نہیں، اس کی آزادی غیروں کی
 محتاج نہیں، مرہون احسان بھی ہوتی ہے۔ تجارتی اغراض کے لئے آزاد کئے گئے
 غلام تجارتی اغراض کے لئے کسی وقت بھی غلام بنائے جاسکتے ہیں اور آزاد
 ہوتے ہوئے بھی غلام رکھے جاسکتے ہیں، رکھے جا رہے ہیں۔ آزادوں کے غلام

بنا دینے والی آزادی بڑی ملک ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا ترقی یافتہ ممالک سے
 یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے مفادات سے قطع نظر ان کی ترقی کے خواہاں ہیں اور واقعی
 ترقی یافتہ بن جانے دیں گے، شکستہ آئیے دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آج کے سیاستدان
 یہ بھی طے نہیں کر پائے کہ جن کو وہ آزاد مملکتیں گردان رہے ہیں، وہ کس کی ملکیت ہیں۔
 تمام افراد کی، چند افراد کی، فرد واحد کی یا خالق کائنات کی۔ ان کی سمجھ میں نہ ہر ملک
 ملک ماست کہ ملک خدائے ماست آئے گا، نہ انہیں خلافت و ملوکیت و جمہوریت
 میں کوئی فرق نظر آئے گا۔ لہذا لازم ہے کہ آج کے انسان کا ضمیر مر جائے۔ جہاں جہاں
 یہ ضمیر مر جائے گا، معاشرہ مہم، بکرم، عمی ہو جائے گا۔ ایسا معاشرہ خود لاپرواہ ہوگا
 اور شکوہ کناں ہوگا کہ ہمارا خالق سمیع و بصیر نہیں ہے۔ ایسے معاشرے کو یہ احساس
 کبھی نہیں ہوگا کہ اگر صرف لالہ کہیں تو کمیونزم کی تصدیق ہوتی ہے۔ لا الہ الا اللہ
 کہیں تو صرف وحدت الہی ہی نہیں، آزادی افراد کا صحیح تصور بھی قائم ہوتا ہے اور
 محمد رسول اللہ پکارو تو اسلام کا ضابطہ حیات و سیاست و اقتصادیات و معاشرت
 یوں پھوٹ نکلتا ہے جیسے اسمعیل ایسٹریاں رگڑ رہا ہو تو زم زم پھوٹ نکلتا ہے۔ ایسا
 معاشرہ نہیں جان پائے گا کہ اسلام میں قوم ملک، سلطنت کا کوئی تصور نہیں۔ سلطانی
 فرد واحد کی ہوا، افراد کی، یا عوام کی یا جملہ ابنائے آدم کی، حاکمیت الہی کی توثیق
 ہے۔ سایہ خدائے ذوالجلال کسی کے ظل الہی ہونے کا پیش خیمہ ہے اور قوت
 عوام کو سرچشمہ قرار دینا اللہ کے قوت کا سرچشمہ ہونے کی نفی ہے۔ نہیں جان پائے کہ
 حاکم آزاد ہو، مالک الملک بن بیٹھے تو نہ افراد آزاد رہتے ہیں، نہ ملک۔ ایسے
 معاشرہ کے لوگ بسیط ہونے کی بجائے محیط ہو جاتے ہیں۔ اور ایک ہوں مسلم
 حرم کی پاسبانی کے لئے گنگناتے سانحہ مشرقی پاکستان سے دوچار ہو جاتے ہیں،
 اسرائیل اقوام متحدہ کا رکن قرار پا جاتا اور ہر قرارداد کو ویٹو کرنے کا اہل ہو جاتا

ہے۔ لوگو! جب تک حاکم وقت خالقِ انسان کا محکوم اور اس کے احکامات کا پابند
نہیں ہوتا، ہر سقراط زہر کا پیالہ پیتا رہے گا، ہر مسیحا مصلوب ہو گا۔ کوئی جنگِ بد
نہیں لڑے گا، گلی گلی کوچہ کوچہ کر بلا بپا رہے گی اور لوگ بادشاہانِ وقت کے روبرو
کو لہے مٹکا مٹکا کر دیتے رہیں گے کہ

سے اس شرط پہ کھیلوں گی میں تجھ سے پیا بازی
جیتوں تو پیا میرے، ہاروں تو پیا تیری



یا الہی! یہ ماجرا کیا ہے

کچھ مہربان تو احمقوں کی جنت میں بستے ہی تھے، اُن کرم فرماؤں کا کیا کریں جو دانشوروں کے دوزخ میں ڈیرے ڈالنے لگے ہیں۔ ان بزرگوں کو کہاں بسائیں جن کی تحقیق نے دانش کے تختہ سیاہ پر یہ تحریر پایا کہ تحریک پاکستان کا مقصد ترین نعرہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" محض کچھ لڑکوں کا تراشیدہ تھا۔۔۔۔۔ اسلام میں حق رائے دہی کے معاملات میں نیک و بد، معروف و منکر کے پیرو کاروں میں کوئی امتیاز روا نہیں ہے۔ گروہ بندی، تفریق و تقسیم، دینی و سیاسی جماعت سازی کی کھلے بندوں، کھیلتی کھلکھلاتی کارروائیوں کی اجازت ہے۔۔۔۔۔ سیاست میں دوستی و دشمنی کی وہی فقہ ہے جو مصلحت بینی خود غرضی اور منافقت کے عنوانات و ضمانات کے تحت ضابطہ اخلاق کی لغات میں تحریر ہے۔۔۔۔۔ حکومت حاصل نہ ہو تو از خود سیاسی ولیمہ کا انعقاد کر کے اعلان کر دینا چاہیے کہ بیڑا پار ہو گیا۔۔۔۔۔ والدین لاکھ سجدہ شکر ادا کر رہے ہوں۔ تاجر دکاندار۔ ٹرانسپورٹر۔ استاد۔ ذہین اور محنتی طالب علم اور محنت متفق ہوں کہ زیر تعلیم پوری موجودہ نسل کو بہت پہلے اس بے راہ روی سے بچالینا چاہیے تھا۔ پوری قوم نے اطمینان کا سانس لیا ہو کہ اب ہونہار بھی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ مگر

دانشِ سیاست کو بظن رہنا چاہیے کہ دین و سیاست چاہے جدا ہو جائیں، طالب علم اور سیاست کو جدا کیا جائے تو دیکھ لینا باقی چنگیزی ہی رہ جائے گی۔ اور تمام تردینی دعوے لادینیت کی گود میں افیون چٹوا کر سلا دیئے جائیں گے۔ نہ سابقہ معاہدات کا پاس کیا جائے گا نہ گزشتہ مختصمت و رقابت کا۔ نہ ان مقدمات کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے گا جو بہ امر مجبوری چند سال پیشتر بغرض فیصلہ از خود انسانی عدالتوں سے عدالت الہیہ میں منتقل کر دیئے گئے تھے اور تمام وہ عبوری فیصلے جو قدرت کی جانب سے صادر ہوئے، سیاسی طور پر کالعدم قرار دیئے جائیں گے۔ مارشل لاء جس کی تائید و توصیف اس کو نافذ کرنے والوں نے بھی نہ کی، اپنے مقاصد اور اغراض پس پردہ کے پیش نظر اس کی استواری کے جائز و ناجائز میں ہر فرق پر سبز پردے ڈال دیئے جائیں گے۔ لیکن اس دوران اگر شریعت کے اقتدار اعلیٰ، اللہ کی حاکمیت، اسلامی نظام مشاورت کی بات سہواً بھی کسی کے منہ سے نکل جائے تو فرمان صا اور ہو گا کہ ہم اپنے دیرینہ مخالفوں اور رقیبوں کے ساتھ مل کر تحریک چلائیں گے۔ اور وہ تخت جسے ہم اپنے کندھوں پر اٹھائے یوں پھر رہے تھے کہ قضائے صلوات کی بھی پروا نہیں تھی۔ نہ صرف یہ کہ کسی ویران یا سنان جگہ پر لے جائیں گے بلکہ اس کے پاؤں سے سر پھوڑ کر رقصِ خون آشام کرنے اور ”سوامنی مکتیر پٹی پھر کدی اے، کسے یارنی دے سرمانی ایس“ گانے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔۔۔ جو سیاست ”اندراجی“ کو اندرونی مداخلت کی دعوت دینے اور پیش قدمی حریف خدائے مسلمان کی دھمکیاں دینے سے بھی باز نہ آئے، وہ اگر اپنے پیروکاروں اور پیش روؤں کے لئے دانشوروں کے دوزخ کی شہریت کی طالب نہیں تو اور کیا ہے۔

”لا الہ الا اللہ“ لڑکوں کا تراشیدہ نعرہ تھا، اس سے گھمبیر طعن فکر اقبال،

عمل قائد اعظم اور جذبات و اعتقاد ملت اسلامیہ پر شاید ہی تراشا جا سکے۔ مفکر پاکستان نے اپنے گرد و پیش کے اسی خستہ درون کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنے ذہن و قلب کا اظہار یوں کیا تھا کہ اگرچہ جماعت نے آستینوں میں بت چھپا رکھے ہیں مگر ان پر حکم اذراں صادر ہو چکا ہے۔ اگرچہ ”پاسبان مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے“ ان کے زیر نظر ہے۔ تاہم وہ لا الہ الا اللہ کا اعلان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اقتدار شریعت صرف صہیونی مکتبہ فکر ہی نہیں ہر انسان ساختہ نظام حکومت کے لئے اس قدر ناپسندیدہ ہے کہ زبانی اعتراف و اعلان بھی گوارا نہیں۔ جسے یقین یا احساس نہ ہو وہ پشاور کے جلسہ عام اور پاکستان کی امداد پر مزید پابندیوں کی حالیہ یہودی امریکی تجویز کی کڑیوں پر نشان ساخت عینک اتار کر بھی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔ کیا اس تجویز کے ہر ضمن کی شہ سرخی یہ نہیں ہے کہ ”ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں“ اس کی ہر سطر اس کا ہر لفظ چلا چلا کر یہ نہیں کہہ رہا کہ ”الحذر آئین پیغمبر سے سو بار الحذر“ اندرون ملک یا بیرون ملک اس صہیونی تجویز کی کوئی بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ قولاً یا عملاً حمایت کرے گا ”وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا۔ روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو“ کی یہودی و نصرانی تحریک کا کارکن ہی ہوگا۔ وہ صف نشین ہو یا منبر نشین، جبہ پوش ہو یا جتہ نواز ”ہے جمالو“ کی دھنوں پر مبتلائے رقص ہو یا اللہ اکبر کہہ کر لیبلی دباتا ہو..... ”لا الہ الا اللہ“ کے چار لفظ انسانوں کی حاکمیت کی مکمل نفی ہیں۔ اللہ کے سوا مسلمان کا کوئی اور الہ نہیں اور جس کے سوا کوئی اور بھی الہ ہو وہ مسلمان کا اللہ نہیں اور پھر اس سے بڑھ کر اور ستم سیاست پاکستان پر کیا ہوگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند کئے ہوئے نعرہ توحید کو قیام پاکستان کے لئے شمع راہ ہی نہیں، منتہائے منزل قرار دینے کے عمل کو انتہائے دانش تسلیم کرنے کی بجائے ”کھیل بچوں کا ہو ادیدہ بینا نہ ہوا“ کی شہ سرخیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ انسانی حریت و مساوات کا یہ چار لفظ

لاثانی نسخہ تاریخ حیات انسان میں مردمان ساختہ تمام تر دساتیر آئین کی شکست و
 تسخیر کا وہ واشگاف اعلان ہے کہ سیاسیات کے علم سے آشنا کسی بھی فرد کو ان چار
 الفاظ کے ذریعے جن میں سیاست کی تمام تر خرابیوں، خامیوں، کوتاہیوں کا موثر ترین
 حل پیش کیا گیا ہے، حریت انسان کی ضمانت دی گئی ہے، انسانی حاکمیت کا عدم قرار
 دے دی گئی ہے۔ ماسوا بے اختیار محمد رسول اللہؐ پکارا ٹھٹھنے کے اور کوئی چارہ کار ہی نہیں۔
 میدان سیاست میں جس دانشور نے لا الہ الا اللہ کے احاطہ دانش سے باہر قدم رکھا،
 اس نے گویا دانشوروں کی دوزخ کی ٹھہری قبول کر لی۔ خود پیدا کردہ حالات کے سامنے یوں جھکا
 کہ نہ من اس کا اپنا رہا نہ تن۔ کبھی بادشاہوں نے لوٹ لیا تو کبھی شیخ و برہمن تاراج
 کر گئے۔ آخری رمت تک من کی دولت لٹ گئی۔ تن کی دولت کے سایوں کے پیچھے وارفتہ
 بھاگتا اپنی ہی چادر میں پاؤں اٹک جانے سے بار بار گرا۔ مگر اعتراف شکست کی بجائے
 دہائی دینے لگا: میں تو خدا کی تلاش میں تھا، قرارداد مقاصد تحریر کر رہا تھا، آئین ہائے
 پاکستان کی موشگافیوں میں حاکمیت رب العالمین تلاش کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ
 قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے، قوانین اسلام کے منافی نہ بنانے اور فقط قوانین
 اسلام ہی کا نفاذ کرنے میں فرق اگر واضح ہو گیا ہے تو قانون ساز اداروں کا مصرف کیا
 رہ جائے گا اور پورس کے یہ سفید ہاتھی پاکستان کے کونسے عجائب خانہ کی مناسب
 زینت بنائے جاسکیں گے۔ محبت اگر بے لوث، صداقت بے باک اور طلب صادق ہو
 تو نظم کائنات میں منشاے ایزدی یقیناً یوں کار فرما ہے کہ آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری
 مل جائے۔ لیکن منافقت قلب وہ موذی علت ہے کہ رتی بھر بھی موجود رہے تو
 ولایت کی تلاش میں نکلے ہوئے افراد کا بھی آگ لازم مقدر ہو جاتی ہے۔ لائحہ کی
 بجائے فویل اور الحذر کی صدا میں سنائی دینے لگتی ہیں۔ اگر حصول پاکستان سے مراد
 صرف اللہ ہی کی حاکمیت نہ تھی تو پھر بندوں کی اور وہ بھی فرزند ان تہذیب افرنگ۔

لادین کی حاکمیت مقصود تھی۔ یا بندوں اور اللہ کی مشترکہ حاکمیت کا قصد تھا، تضاداً
 کی حکمرانی کی تمنا تھی۔ دین بھی کسی انسان کا لگایا ہوا پودا تھا جسے مزید پیوند کاری
 سے حسب منشا ذائقہ دار بنایا جاسکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور شرک کیا ہوگا کہ
 انسانوں کو دانش خداوندی بھی ترمیم و اضافہ طلب نظر آنے لگے۔ کیا قیام پاکستان
 سے صرف یہی مقصود تھا کہ ایوان حکومت میں افرنگی امپریلزم کے شجرہ ہائے نسب
 نصب کر دیئے جائیں، 'لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخرا کا دستور کار فرما
 رہے اور دیواستبداد اقتدار کی نیلم پری کی باہوں میں باہیں ڈال کر انسانی حریت
 کی نعشوں کے گرد شب و روز رقص کرتا ہے' یہ لڑکوں کا نعرہ تھا، اعلان فرما کر
 مفکر پاکستان اور معمار پاکستان کے مزاروں پر رومن چادریں چڑھانا مقصود ہے
 یا کسی ایسے دوست کی تائید ہے جو تخلیق پاکستان کو افرنگی سازش قرار دینے کے
 لئے جواز ٹٹولتے رہنے کا عادی ہو گیا ہو۔ ہمارے مقدر ہیں تو سیاسی مگر مچھوں کے آنسوؤں
 میں محلول کئے گئے نوع درنوع نسخے ہی سہی، وہ مفکر و معمار و شہدائے تحریک پاکستان
 کیا کسی جرم میں مارے گئے کہ یوں پوسٹ مارٹم کی ضرورت آپڑی۔ جن کی ضرورت ہو ما
 ان کا مرجانا اور غیر ضروری ضرورت مندوں کا نہ مرنا کیا ناساچ پیدا کرتا ہے۔ تاریخ نے
 بارہا دیکھا، اب بھی دیکھ رہی ہے لیکن مندرجہ بالا توضیحات و تشریحات کے موجود
 اگر در توبہ اپنے ہاتھوں سے بند کرنے پر مضر ہیں تو جان لیں کہ تاریخ ان القابات
 کی تلاش میں ہے جو آئین پیغمبر سے یوں منحرف ہونے والوں کو زیب دیتے ہیں۔
 اسلام کو ثانوی مسئلہ قرار دینے والے ایک مرتبہ پھر جائزہ لیں، ہو سکتا ہے فطرت
 اسے اولین امر قرار دیتی ہو۔ جن افراد کو کسی مسیحا کے وعدے پر اعتماد نہیں تھا
 مان لیا کہ بجا طور پر نہیں تھا۔ اب تو نماز بھی ہے، روزہ بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے،
 عمرہ بھی ہے، حج بھی اور اعلان نفاذ اقتدار شریعت بھی۔ اب کیا جواز ہے، کیا

یہ کہ سیاستِ حاضرہ ابھی بے وضو ہے۔ اللہ کی حاکمیت اگر قائم ہو جائے اور نفاذِ مارشل لا نہ رہے تو کیا یہ اعتراض کیا جائے کہ اقتدار جسے ہمارے دستِ سیاست پر بیعت کرنا تھی، شریعت کے نام کیوں منتقل ہو۔ حاکمیت بندوں سے کیوں چھنی، اللہ ہی کی کیوں تسلیم کر لی گئی۔ نادان دوستوں! یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند لا الہ الا اللہ، سب بتان و ہم و گمان ہیں۔ مارشل لا نہیں ہونا چاہیے، ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ مگر نفاذِ مارشل لا جاری ہے، صرف اس لئے کہ ہماری پیشہ ور بہ باطن لادین سیاست اپنی اعراض کے خول سے باہر نہیں جھانکتی اور خائف ہے کہ جھانکا تو اندھی ہو جائے گی۔ لڑکوں کے نعرہ تراشنے کا توفصہ گزشتہ تھا۔ حیرانی سرپٹتی ہے، کہ ان بزرگوں کا مزار کہاں تمہیر ہوگا جن کی سیاسی و غیر سیاسی بلوغت رازِ سر بستہ ہی رہی اور جو بیکاپک سر تسبیح لٹکے ہوئے سگوں کو مسل مسل کر ورد کرنے لگے ہیں کہ رائے دہندگان کا معیارِ اخلاق و کردار مقرر کرنا اسلامی شعار نہیں، تقاضائے سیاستِ اسلام نہیں۔ نسخہ متفقہ حضور سنبھالے بیٹھے ہیں نہ معلوم مجرب ہے یا مجربو ہے۔ مگر مغربی طریقِ انتخاب کا تقاضا کرنے والے خدا کے لئے عمدہ طلبی و ہم جوئی کو شعار مومن قرار نہ دیں، مغربی طریقِ انتخاب اور مشاورتِ اسلام میں بجد جانیں خدا کے لئے سوچیں کہ اہل دوزخ کی رائے سے جنت تمہیر ہوگی تو اہل جنت کی تمناؤں کا کیا ہوگا۔ کیا یہ زیب دیتا ہے کہ رضوان کا انتخاب اہل دوزخ کی رائے کا محتاج قرار دے دیا جائے۔ سیاستِ مزید اگر مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے لئے کھاتے پیتے افراد کو وافر کھلانے پلانے کے لئے بمعِ آلِہم و اصحابِہم اکٹھا کر کے اعلان کر دے کہ فی الحال حکومت نہ سہی سایہ حکومت ہی سہی۔ حکومت سایہ دار کو سبھا دے کہ حکومت تمہاری اور سایہ حکومت ہمارا یا یہ کہ تم سایہ خدائے ذوالجلال، ہم جانِ استقلال۔ دیوار تمہاری دسترس میں، سایہ دیوار ہمارے مہر میں۔ مصلحت

پہچانو تو اپنا جان لو، نہ جانو تو ہم بے وقت جگانے کی شرارت کریں گے کہ
 اپنے مرغوں کو ڈربوں میں بند کیا جاسکتا ہے، انہیں اذان دینے سے نہیں روکا
 جاسکتا۔ اگر یورپ کے کلیساؤں اور افریقہ کے پتے ہوئے صحراؤں میں اذانیں دی
 جاسکتی ہیں تو حکومت پاکستان اتنی مضبوط بھی نہیں کہ ”مگڑوں کوں“ بھی نہ
 کہا جاسکے۔ مارشل لاء سے ناپسندیدگی کے اظہار کا یہ کوئی مفید و موثر انداز نہیں ہے۔
 یہ تو مارشل لاء کے استقلال کی راہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے مفر کی راہیں
 ڈھونڈ نکالی جائیں۔ صحیح اسلامی آئین کے مکمل نفاذ کے بغیر مارشل لاء سے سیاسی
 چھٹکارا حاصل کرنے کا اور کوئی موثر طریقہ نہیں۔ نفاذ نظام مصطفیٰ سے بحالی جمہوریت
 اور پھر سکرٹ کر ایک فرد کی، جو لافانی بھی تھا اور لاثانی بھی نہیں تھا، اقتدار سے
 علیحدگی پر آٹکنا، تمک ہمارے ساتھ وہ گر گیا جو نوے دنوں کو سات سالوں تک
 پھیلا گیا۔ اب بھی منفی سیاست سے تائب ہونے اور مثبت اندازِ فکر اپنالینے کا
 شاید وقت ہو۔ پشاور کے نو نکات ہماری سیاست کو برے نہ لگیں، اپنے ہی نامہ
 اعمال سے یوں نفرت ثبوتِ دانش نہیں۔ ماؤں نے بچے بے نام راہوں پر ہنگامہ
 آرا ہونے یا مرنے مارنے کے لئے نہیں جنے۔ بسوں اور راہ گیروں سے کوئی ایسا جرم
 سرزد نہیں ہوا کہ انہیں سنگسار کیا جائے۔ ملک میں مارشل لاء نافذ ہے، شب
 برات نہیں کہ بچوں کی پٹاخوں کی ضد پیش نظر ہے۔ باپ کی امیدوں پر پانی پھرنے
 اور ماؤں کے کلیجے تپا دینے کے عمل کو سیاست نہیں کہتے۔ معصوم ہاتھوں سے قلم
 چھڑوا کر انگلیاں بلبلیوں پر رکھ دینا کسی روشن مستقبل کو نشانے میں نہیں
 لائے گا۔ ملک کی کسی ماں نے اپنے بچے کو یہ بد عادے کر نہیں بھیجا کہ جا تو قید
 ہو جائے، تو گھر نہ آئے، تیرے ساتھیوں کے ہاتھوں تیری تڑپائی ہوئی لاش آئے
 پابندی کی ذمہ دار جو حرکات ہیں، ان ہی کو دہرانے سے پابندی شاید نہ ہٹے۔ شاید

بات بڑھ جائے۔ اولاد مردا کر یا پٹوا کر یا قید کروا کر گھر بسانے کی تمنا کرنے والے
اچھے والدین ہوتے تو مارشل لانا فذہی کیوں ہوتا۔ ہم متعدد سیاسی امراض میں
متلا ہیں۔ موجودہ نظم و حکم بھی اسی مرض سیاست کا جزو لاینفک ہے۔ آؤ! آئیں
پیغمبر سے دریافت کریں، آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔



جناب صدیہ دوریاں، یہ فاصلے

عالی مقام! مقام عالی پر اُن کا مقیم ہو جانا جو خوفِ خدا سے عاری اور رضا و قضائے الہی سے نابلد ہوں، تاریخِ انسان کو ساخت سے دوچار کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ توجہ مبذول فرمائیے، یہ آخر کسی خطا کی سزا ہی ہوگی کہ سپر طاقتوں کے پنجہٴ استبداد کے خوف سے سہمے ہوئے اسلامی ممالک کی کیفیت اُن گھروں کی سی ہو گئی ہے جنہیں مفروضہ نقصِ امن کے خطرہ کے بہانے سر بھر کرنے کا حکم کسی بے عنان "پولیس مین" نے خود مستغیث بن کر حاصل کر لیا ہو۔ نوے کروڑ مسلمان جن کی نمائندگی کا شرف آپ حاصل کر چکے ہیں، تاریخِ اسلام کی ماندگی اور بے مائستگی کا بابِ نو: تحریر ہوتا دیکھ رہے ہیں و دل کا کیا حال کروں خونِ جگر ہونے تک، کا سماں ہے۔ خلیجی ممالک، پنجہٴ یہود میں جکڑے ہوئے مغربی یورپ کی رگِ جان ہونے کے باوجود، ایسے مریض تصور کئے جا رہے ہیں جن کا تمام خون بدل دینا، اقتصادی صحت کے معالجوں نے لازم قرار دے دیا ہو۔ خلیج کے جس کنارے کی طرف نظر اٹھاؤ، کوئی نہ کوئی علامہ الدینِ خلیجی متعین ہے اور مٹھ رہے کہ ہر آئینہ روپد منی میرے، سپرد نہ کی گئی تو پر تھوی کی خیر نہیں۔ تیل جو کبھی انعام الہی تھا۔ فقط بابرانِ عیشِ کوش وجود میں لایا۔ زمین اپنے خزانے اگلتی رہی اور قارون تالیاں بجاتے، دو کوہانی

اونٹوں کی ٹانگوں میں زنجیریں باندھ کر انہیں مجبوراً رقص کرتے، اپنے سیاسی قمار خانوں سے ہدایتیں جاری کرتے رہے کہ صدائے جرس ناقہ لیلیٰ بھی مدہم نہ ہو اور مجنوں کا قدم بھی نہ اٹھے۔ تیل کے ہر چاہہ پر دعویٰ ملک یوں عائد رہا کہ ہمارے یوسف اسی میں گرائے گئے تھے۔ لہذا ڈول ڈالنا اور نیلام یوسف کے لئے منڈیاں مقرر کرنا ہمارا حق سوداگری و آقائی ہے۔ سپر طاقتیں یہ طے کئے بیٹھی ہیں کہ تیسری عالمی جنگ برپا کئے بغیر عالم اسلام کو دوسری عالمگیر جنگ کے نتائج کے سپرد کر دیا جائے۔ یوں، کہ ہینگ بھی مسلمانوں کی ہی لگے اور پھٹکڑی بھی ان ہی کی صرف ہو۔ جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کے تصورات کے تاج محل آٹھویں عجبہ کے طور پر، اپنے نقشوں کے مطابق تعمیر کر کے نئے لارڈ لارنس کی تحویل میں دے دیئے جائیں اور تیل تیرا، پانی میرا کے کلیہ پر بقائے باہمی کے لئے صلح کر لی جائے۔ چاہے افغانستان، ایران، پاکستان، بھارت کی نئی جغرافیائی تقسیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اھیائے اسلام کو یوں دبے پاؤں اور آڑے ہاتھوں لیا جائے کہ تاریکی آسمان کے نورِ سحر سے آئینہ پوش ہونے اور ظلمتِ شب کے سیماب پا ہونے کی صدائے بازگشت صدیوں تک دوبارہ بلند ہونے کا کوئی احتمال نہ رہے۔ ضیائے حق تاریکی باطل کی گھمبیرتائیں لرزتی رہے۔ خود مستی و بد مستی میں ہر امتیاز، غارہ و ساغر و مینا کی کرامات کے سامنے سجدہ ریز رہے اور عالم اسلام اُس سجدے کو جو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے، از خود متروک قرار دے دے۔ سپر طاقتیں آگاہ ہیں کہ اگر کوئی تاخیر سرزد ہوگئی تو نہ معلوم کتنے اور بیروت بے روپ کرنا پڑیں۔ نہ معلوم کس کس لبنان کا لبن چوسنے کے لئے میکا ولی اور مارکس کے اژدھے چھوڑنا پڑیں۔ کس کس کو جادوئے سامری اور شیوہ آزری کی زد میں لانا پڑے۔ عالی جناب بکاروانِ اسلام کے لئے یہ کون سی منزل متعین ہوئی کہ اسلام مسافر نظر آنے لگا ہے۔ یہ فریبِ نظر جو ہم کھا رہے ہیں، دوریِ منزل دے رہی

ہے یا کھٹن فاصلوں کی عطا ہے۔ یہ نصب شدہ میزائل اور اپنے سینوں پر طیارے
لا دے ہوئے جہاز اعجازِ غرقِ فرعون کے اعادہ کا سدباب کرنے اور فرارِ موسیٰ کو
نا کام بنانے کے لئے نہیں تو کیا چیونٹیوں کو سلیمان کے لشکر سے محفوظ رکھنے کے لئے
ہیں۔ آپ بھی تو آگاہ ہیں کہ یہ خلائی جہاز ابابیل کی راہ نمائی کے لئے نہیں، اصحابِ
فیل کی حفاظت کے لئے اڑائے جا رہے ہیں۔ یہ ساز و سامان آج کے پٹرول فروشوں
کو عطر فروش بنانے کے لئے ہے۔ بظاہر قلعہ اسلام کے ارد گرد بچھتی ہوئی سرنگیں دراصل
اس کے لئے کھودی جانے والی آبی سرنگیں ہیں۔ ان دوریوں، ان فاصلوں کو دوڑین
لگا کر نہ دیکھئے۔ سانپ تو پاؤں کے قریب رینگ رہے ہیں اور وہ وقت شاید دور نہ
ہو جب مسجدوں کے میناروں سے اٹھتی ہوئی اذانیں فقط عبدالوہاب کے مسمار کئے
ہوئے مزاروں کی آسامیوں کے لئے ہی مخصوص کر دی جائیں، ترک نادان کی چاک
کی ہوئی قبائے خلافت نیلام کر دی جائے اور دنیا اسلام زخموں سے گرتے ہوئے
نمک کو پلکوں سے چننے پر مجبور ہو جائے۔ آپ کے بھی سقوطِ مشرقی پاکستان پر ٹپکتے
ہوئے آنسو شاید ابھی نہ تھے ہوں، ہمارے تو نہیں تھے۔ ایسا نہ ہو کہ وقت پھر گھوٹال
سے منادی کرنے لگے کہ لو! مبارک ہو۔ گردوں نے گھڑی موت کی اک اور گھڑادی۔
سربراہا! جو اپنی ہی پھونکوں سے اپنے چراغِ بجا دیں، لقب زن انہی گھروں میں در
آیا کرتے ہیں۔ سانپ بین بجانے سے مسحور ہو جاتے ہوں تو انہیں موسیقی نواز گردان
لینے سے بڑی گردن زدنی سیاسی غلطی یہ بھی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کر دی جائے کہ
مینڈکوں کے ٹرانے سے اڑد ہوں کی اشتہا بڑھ جاتی ہے۔ دوریوں اور فاصلوں کے
باوجود فقیر پتیر دور بین لگائے دیکھ رہا ہے کہ آج کے اڑد ہے ڈپلومیٹک انعامات
کی بارش ہی اس غرض سے برس رہی ہے کہ مینڈک ٹرائیں اور یہ گرم پانیوں کو نہ ہر
آلود کرنے کے لئے گامزن ہونے سے پیشتر مختصر ترین فاصلوں کا تعین کر سکیں۔ فقیر

پر اعتبار نہ کیجئے۔ انسانوں کے اندازے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ شرف تو آپ کو
 حاصل ہے کہ آپ مطلق العنان حاکم ہونے کے باوجود بے عنان نہیں ہیں اور
 اللہ کے سامنے سر بسجود رہتے ہیں۔ سجدہ جود و ریاں اور فاصلے کو تہاہ کرتا ہے۔
 اللہ سے ہی پوچھ لیجئے، کیا طاغوتوں کے یہی ارادے نہیں ہیں۔ اے ہمارے رعی!
 رعایا عرض کرتی ہے کہ آج کا ہر سو منات اپنی ترشے ہوئے پتھر اٹھائے غزنوی کو سنگسار
 کرنے کے لئے نئے طریقے سوچ رہا ہے اور لٹکار رہا ہے کہ تجھے پے درپے حملوں
 کی سزا بھی دوں گا اور آخری فتح کا بدلہ بھی لوں گا کہ تیرا اسلام نہ ہوتا تو چانکیہ
 کی فکری مملکت میں سچا سودا کرنے والا گورو ناتک ہی نہ ہوتا اور آج واہگورد کے
 گوردوارے چندرگپت کی سیاست اور اشوک کی چکر بازی کا منہ نہ چڑاتے۔ یہ اسی
 سومناتی سیاست کی دین ہے کہ سیاست کے ہر ٹوکے میں سیواجی مرہٹہ چھپا
 بیٹھا ہے۔ اذہان میں مایوسیوں کی کنفیڈریشن اور محرومیت کی فیڈریشن کے نقشے لٹک
 رہے ہیں۔ جناب والا! عالم سجدہ میں کبھی آپ نے اللہ کی حاکمیت اور فیڈریشن
 اور کنفیڈریشن کے تضادات پر غور فرمایا ہے۔ یا صرف ان ہی کی سنتے رہیے گا جن کی
 دانست کے منہ سے ابھی فیڈر بھی نہیں چھٹا اور وہ مارشل لاؤں کے دودھوں پائے،
 افلاطون و ارسطو تک کو اپنے ذہنی کٹھروں میں کھڑا کر کے فرداتِ جرائم عائد کرتے
 رہتے ہیں۔ کہ تم نے مملکت کو مزید لخت لخت کرنے کا موثر طریقہ تحریر نہ کر کے جو جرائم
 کئے ہیں وہ ہماری سماعت کے قابل اور لائقِ تعزیر ہیں۔ ڈانٹتے ہیں کہ نالائقو! تم سے
 تو محرومیت و یاس و قنوطیت و علیحدگی کی بنیادوں پر ریاست استوار کرنے کا کوئی
 طریقہ بھی تجویز نہ ہو سکا۔ جناب والا! اپنے اثر سے نہیں، اپنے عمر سے دریافت
 فرمائیے تو شاید یہ راز بھی کھل سکے کہ بفیضِ فقہانِ عجم، پاسداریِ ملوکِ کینے، دین
 کو کس پرکاری سے متنازعہ بنا دیا گیا۔ تصورِ خلافت کو مسلمانوں کے اذہان سے مفقود

کرنے اور دستارِ ملوکیت کو متبرک تسلیم کروانے کے لئے کس طرح الفاظ و معانی کے خم و پیچ سے تعاون حاصل کیا گیا۔ احکامِ الہی کی اساس و دانش پر کس طرح دبیر و رنگین جُتے پھیلا دیئے گئے۔ عقلِ لافانی کو کس پرکاری سے عقلِ فانی کی دسترس میں دے کر جزئیات کو بنیادی اصولوں پر فوقیت دی گئی۔ مقالاتِ قرآن کو کس ہوشیاری سے حالات کے تابع بنایا گیا۔ حالات کے پروردگار کیوں کر حالات کی پیدائش معذور بن کر رہ گئے۔ کتابِ ناطق کے لئے انسانوں نے کس طرح اپنے کان بہرے کر لئے۔ الحادی دانش کے اُبلتے ہوئے لاوے سے انسانی قلوب پر کس طرح مہرین ثبت کر دی گئیں۔ مساجد میں زرتشت کے فکری آتش کدے کس نے دہکائے۔ مسلکی رقابتوں کے سنگسار کئے ہوئے اذہان کس کے ہاتھوں دستار بند ہوئے۔ آپ کی رعایا کو وہ انسان کس نے عطا کئے جو چراغِ خانہ سے گھر جلاتے ہیں۔ دربارِ شاہی میں سدھائے ہوئے شیر چھوڑ کر قائم کیا ہوا رعبِ شاہِ محض خود فریبی ہے۔ نہ معلوم شیر کو کب احساس ہو جائے کہ وہ توجنگل کا بادشاہ ہے۔ فلصلے تعزیر سے بڑھنے اور تدبیر سے سکرٹتے ہیں۔ وقت کا اندازہ تمازتِ آفتابِ اقتدار سے نہیں، اپنے سائے سے لگانا صحیح سیاسی عمل ہے۔ اللہ نے قضائے صلوات کی رعایت عطا کر رکھی ہے، قضائے دانش کی ضرب کی دی ہوئی دوریاں اور فاصلے بڑے کرب انگیز ہوتے ہیں۔ معاملہ چونکہ شوقِ وفاداری اور شرطِ استواری کا نہیں، اس سرزمین کے تحفظ کا ہے جو مملکتِ خداداد ”برائے خداداد“ ہے اس لئے جان کی امان کی خاطر سچی بات کہنے سے رک جانا جان دے دینے سے زیادہ کرب ناک ہوگا۔ لہذا عرض ہے کہ دو سپر طاقتوں کے سیاسی پڑاؤ کے درمیان پس جانے سے محفوظ رہنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ خود کو سپریم طاقت کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ ملک کو بھی اسی سپریم قوت کی حاکمیت میں دے دیا جائے۔ پاسبانِ کعبہ عبدالمطلب اور سومنات کے پجاریوں کی قوتِ ایمان

میں بڑی دُوریاں ہیں، بڑے فاصلے ہیں۔ کہتے ہیں، بُتوں سے امیدیں اور خُدا
 سے ناامیدی بڑے مہلک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ جس معاشرہ میں عبدالمطلب کی
 پختگی، ایمان موحزن نہ ہو، محمد رسول اللہ کے عرفان سے فیض یاب ہونا اس کا
 مقدر نہیں ہوتا۔ کافر اللہ کی غیرت کو لکارتا اور تباہی کو مقدر بنا لیتا ہے۔ مومن
 کا اتقا اور توکل انعام پا جاتے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ نہ کرنے والے خدا کے بھروسے
 کے انسان نہیں ہوتے۔ ایمان متزلزل انسانی خطاؤں کا سرچشمہ ہے۔ نہ ہوتا تو ہمارے
 سیاسی میر عشق سیاست میں عشقِ سادات بھی داؤ پر نہ لگا بیٹھے ہوتے۔ انسانی
 طاقت کے سرچشمہ سے جس کسی نے پیاس بجھائی، اس کے ہر عمل کو رعشتہ نے آلیا۔ ہر
 کوئی آگاہ رہے کہ مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ سیکولرزم ادیان الہی کے خلاف انسانی
 سازش ہے جس نے ترقی کر کے اللہ سے انکار برپا کر دیا اور کمیونزم نام پایا۔ اس فکر
 نظر کی پیداوار سپر طاقتیں جنگ کے لئے صلح کریں یا صلح کے لئے جنگ، فطرت کے
 فکری اور مادی شہابِ ثاقب بہر طور ان کا تعاقب کریں گے۔ جن کی دانست میں
 یہ امر صائب نہیں وہ صرف مسائبِ طلب ہیں۔ دینی فاصلے طویل نہیں ہوتے، رُخ
 بدلتے ہی طے ہو جاتے ہیں۔ سیاسی ایمان اور قلبی ایمان کے عوامل و نتائج کا فرق
 تو ہمارے دساتیر کے سرورقوں تک پر تحریر ہو چکا۔ درونِ درقنوطی سیاست سے
 لوگ مایوس ہو چکے، لیکن ان کی یہ سزا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ امید کے چراغ دھواں
 دینے لگیں۔ حرمتِ مستورِ حرمتِ مستورات سے کہیں زیادہ محفوظ رکھنے کی چیز ہے
 یہ محفوظ ہو تو انسان کوہ طور بھی ہے اور کوہِ نور بھی۔ جناب والا! آج کے معاشرہ
 کی تمام تر مکروہات آئین و قوانین کی عطا ہیں۔ لوگ بُرے نہیں، آئین و قانون
 ساز غیر دانشمند ہیں۔ جو حکمران ماڈل کو ان کے تصورات کے بچے نہ لوٹا سکے، اس
 کا حکم رانوں پر تو نقش ہو جاتا ہوگا، دلوں پر نقش نہیں ہو پاتا۔ اسی سہونے یہ

فاصلے، یہ دوریاں قائم کی ہیں۔ مظہرات کے زیر نظر قانون سازی فقط انسانی ذہن کی ہنگامی شکست و ریخت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ جرم کے لئے فقط سزا کا تعین اسلوب قانون سازی نہیں۔ اندازِ نمک پاشی ہے۔ فقیر اللہ کی حاکمیت کے نفاذ کا تقاضا صرف اس لئے کرنا ہے کہ انسان ناقص قانون ساز ہے۔ خلافتِ احکامِ الہی کے پابند ہو جانے کے نظامِ سیاست کو کہتے ہیں۔ نظامِ خلافت اور انسانوں کے وضع کردہ تمام تر نظام متضاد و متصادم ہیں۔ تسلیمِ حاکمیتِ الہی، نفاذِ احکامِ خداوندی ایمان بالغیب و آخرت، قیامِ صلوات، مشاورت فی الامور، الفاقِ رزق، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلامی نظامِ سیاست کے ستون ہیں۔ جناب والا! ہمارے ملک میں تمام تر قانون سازی اصولِ تثلیث پر سہور ہی ہے۔ تعمیرِ عمارت میں اصولِ تثلیث روارکھ کر دانشوروں نے گھروں کو سلیب بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر مکعب کو فنِ تعمیر کی بنیاد بنانا ہوتا تو رکعت و رقت میں آج کے فاصلے اور دوریاں پیدا نہ ہوتیں۔ اسلامی فنِ تعمیر مثلث کو نہیں مکعب کو بنیاد بناتا ہے۔ اسی طرح اسلام آئین و قوانین و احکام و ادا امر مکعبی فکر و دانش پر تشکیل دیئے گئے ہیں۔ فکرِ مغرب نے ہر فکر کی بنیاد مثلث کو بنایا ہے۔ اور دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ اس مثلث کے زاویوں کی تنصیف کرتے ہوئے خطوط ایک مرکز پر جا ملیں گے اور یوں فاصلے برابر ہو جائیں گے۔ حالانکہ اصل مسئلہ فاصلے برابر کرنے کا نہیں، فاصلے ختم کرنے کا ہے۔ کون سمجھائے کہ تثلیث کا مرکز تلاش کرنا ہوتا ہے اور کعبہ خود مرکز ہوتا ہے۔ موجودہ آئینی نظام حکومت بھی تثلیثی ہے۔ آج کل مارشل لا، اس مثلث کا ایک خط ہے۔ خطِ قاعدہ بھی نہیں اور خطِ قائمہ بھی نہیں۔ اسے صرف مقام و تر حاصل ہے جو قاعدہ و قائمہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کی اساس رومن اور یونانی فقہ ہے۔ جو بغیر مرہم لگائے زخموں پر پٹیاں باندھ دینے کے عمل کے سوا کچھ بھی نہیں

بات سخن گسترانہ سہی۔ نہ مبہم ہے، نہ مہمل۔ تفصیل اس لئے لا حاصل ہوگی کہ مثلث کے خطوط طویل کرنے سے فاصلے بڑھتے ہی نہیں بے ڈھنگ بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ عمل کیا جائے تو پھر مثلث کے خطوط کا کسی مقام پر مل جانا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اصول کعبہ کی بنیاد پر آئین و قوانین تشکیل دینے والے کا نام تاریخ اسلام کا حجرِ اسود ہوگا۔ یہ قلندرانہ راز کسی کے ذوقِ عبادت کی نذر ہے۔ ورنہ حاکم آتے جلتے رہتے ہیں اور ملک بھی تاریخ نے وجود میں آتے اور معدوم ہوتے بارہا دیکھے ہیں۔ ہم فقروں کا کیا ہے۔ رہے تو کیا، نہ ہوئے تو کیا۔ صف ہی تو ہے، گھر میں نہ بچھے گی، قبر کی آسامی میں بچھ جائے گی۔ ہر لباس میں ننگِ وجود رہے، کفن بھی پرانے کپڑے کا ہوا تو قلعی نہ ہوگا۔ یہ فرحت کیا کم ہے کہ لوگ تاج بچاتے رہے، ہم دل کی حفاظت کرتے گزر گئے۔



ہائے اس زو پیشماں کا پیشماں ہونا

احساس محرومی کا دادیلا اتنی اونچی بے سڑی سے برپا کیا جا رہا ہے جیسے کسی نچلے کھلنڈرے کا پاتھ کھڑکی میں آگیا ہو۔ اقتدار سے محروم افراد نے اپنے احساس محرومی کو عوام الناس کے سرمنڈھ لینے کے لئے نہایت پُرکاری سے یہ اصطلاح ایجاد کی ہے۔ کیا بوا بعبی ہے، فکری اغوا کا کیا نرالا انداز ہے کہ ایک صوبے کو دوسرے صوبے سے مایوس قرار دے کر دکان سیاست میں جگنو سجائے جا رہے ہیں اور سیاسی طوطے پنجرے میں بند "جگنی" گا رہے ہیں۔ ایک طرف سے صدا آتی ہے، صوبائی خود مختاری ہی بقائے وطن کا واحد حل ہے تو دوسری طرف سے آوازہ لگتا ہے، کنفیڈریشن کے قیام کے بغیر سیاسی سانس کے پھولنے کا علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی سجدہ گاہ سیاست میں آئین بلائے طاق کی تلوات ہو رہی ہے تو قریب ہی سیاسی مندر میں زنا رپوش گھڑیاں بجا رہے ہیں کہ صوبائی ثقافتوں کے تحفظ کے لئے نسلی اور لسانی تعصبات کے ڈھلے ہوئے بتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک لو کہ ہر سیاسی اونٹ ایک نرالی کروٹ پیٹھنے والا ہے۔ نہ معلوم بداندیش بہو کی طرح جو سیاست دان بھی جملہ عروسی سے برآمد ہوتا ہے، بٹوارے کے لئے کھسر پھر کیوں شروع کر دیتا ہے۔ بسورنے

لگ جاتا ہے کہ مجھے بسانا ہے تو ماں کو چھوڑنا ہوگا، علیحدہ گھر بسانا ہوگا۔
 تمہاری ماں کے ساتھ محبت نے مجھے احساسِ محرومی میں مبتلا کر دیا ہے تمہارے
 جیتے جی میں راند نظر آنے لگی ہوں، میری کوکھ میں بانجھ پن گنگنا نے لگا ہے۔
 انسانِ حبِ وطن سے عاری ہو جائے تو احساسِ محرومی اس کا مقدر ہو جاتا ہے۔
 حرصِ اقتدار کے مریضوں کو محروم اقتدار ہوتے ہی یہ مرض لازماً لاحق ہو جاتا
 ہے۔ سیاسی رقابت ایسی نامراد علت ہے کہ جوں جوں دو اکروا یہ بڑھتی
 ہے اور دعا کرو تو ناسور بن کر سنے لگتی ہے۔ صوبوں کا احساسِ محرومی نہیں،
 چند افراد کا احساسِ مایوسی ہے جو اس قسم کی اصطلاحیں تخلیق کر رہا ہے۔ جو
 لوگ قیامِ پاکستان کے خلاف تھے، وجودِ پاکستان ان کے افکار و اذہان
 پر کھنکتی ہوئی مسلسل ایک ضرب ہے۔ نہایت پرکاری سے انہوں نے پہلے
 نظریہ پاکستان میں مغربی جمہوریت اور غیر مغربی سوشلزم کی آمیزش
 کی۔ نیت یہ تھی کہ قوم کو فکری و نظریاتی تضادات کے اکھاڑے میں کھڑا کر
 دیا جائے اور فکری حصار اس طرح استوار کئے جائیں کہ نہ اسلام ان کا دین
 رہے نہ جمہوریت ان کی سیاست ہو، نہ اشتراکیت ان کی معیشت ہو۔ اسلام،
 جمہوریت اور سوشلزم کے تضادم سے وہ کھرام برپا کیا جائے کہ ہر ذہن اس
 تلاش میں لگ جائے کہ جسے میں اپنا خدا تسلیم کیا کرتا تھا وہ کہاں ہے۔ وہ
 ضابطہ حیات جسے اپنانے کے لئے میں نے پاکستان کی تمنا کی تھی، تجوریوں میں
 کیوں مقفل کر دیا گیا ہے۔ اُفق یکایک شفق کیوں نظر آنے لگا۔ صدیوں کی
 غفلت کے بعد ابھی بیداری آنکھیں بھی نہ مل پائی تھی کہ جسے آفتاب جانا
 تھا وہ نیسیویں کا چاند نکلا۔ رات کی تاریکیوں میں کسی نے شمع روشن
 نہ کی، دن کو تارے دکھانے والے یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ سیاست

شعبہ بازی کا نعم البدل ہو کر رہ گئی۔ جسے دیکھو دودھ بھری بوتل کی بے سوراخ
 پوسنی بننے میں لئے رو رہا ہے کہ لوگو! میرے بھائیوں نے میری ماں اغوا کر
 لی ہے، چوسنی میں مطلوبہ سوراخ کر دینے سے میرا علاج نہیں ہوگا۔ مجھے
 ان مداریوں کا تماشا دکھاؤ جو صب فرمائش لوٹے کو بھرا ہوا اور پھر معاً خالی
 دکھا سکتے ہیں۔ میں اپنے پاؤں چل سکوں یا نہ چل سکوں مگر قلابا نہ یاں لگتی
 ضرور دیکھوں گا۔ ایسے طائفے مہیا کرو جو مجھے فکری جوڈو کراٹے بہ انداز رقص فکر
 بدحواس سکھا سکیں کہ سیاست کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا۔ نہ اس کے
 جذبات ہوتے ہیں، نہ اس کی عزت نفس۔ سیاست میں آج کا دشمن کل
 کا دوست ہو سکتا ہے اور آج کے دوست سے کل دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ جو
 تکمیل غرض کے لئے ہر جاٹی نہیں، وہ سیاست دان نہیں۔ کاش بزرگانِ جہان
 مارشل لاء دیدہ جانتے کہ لوگ احساس محرومی سے زیادہ سیاست دانوں سے
 احساس مایوسی میں گرفتار ہیں۔ ان کے اتحاد نے بھی اور ان کے نفاق نے بھی،
 ان کی صلح نے بھی، ان کی لڑائی نے بھی، ان کے تعاون نے بھی اور ان کی محرومی
 معاونت نے بھی بہر طور اور بہر حال سادہ لوح عوام کو مایوس کیا ہے۔ اب اتحاد
 یا وسیع تر اتحاد۔ محبت آزماؤ یا مخالفت، آبرو تانویا آستین چڑھاؤ،
 تکبیر کہو یا سلام پھیرو، عوام الناس کوئی امید تم سے وابستہ نہیں رکھیں گے
 کہ کوئی گنجائش پر کاری و ہنرمندی سیاست نے باقی نہیں چھوڑی۔ لوگوں کو
 احساس ہے کہ ان کے بنیادی حقوق انہیں حاصل نہیں ہیں۔ آلام و مصائب و
 عدم تحفظ کی جس چکی میں وہ پس رہے ہیں، اس کی آواز صبح و مساکلی گلی کوچے
 کوچے سنائی دیتی ہے۔ مگر سیاسی عمال نے ان کے اعتماد کو صرف مجروح ہی نہیں
 کیا بلکہ انہیں یہ بھی یقین ہے کہ سب کچھ کیا دھرا سیاسی بی جا لوہی کا ہے۔

لوگ جانتے ہیں کہ آئین کی بجالی اور انتخابات کا فوری انعقاد عوام کے
 مصائب کے پیش نظر نہیں، اپنے اقتدار میں آنے کے لئے مانگا جا رہا ہے۔
 عوام الناس کو آپس میں لڑانا، مسلک کے بھلاوے میں ان کے ذہن مفلوج
 کر کے ان کی جیبیں تراش لینا، کفر کے فتوے فروخت کرنا۔ ترجمہ و تفسیر
 قرآن امت مسلمہ کو تفریق و تقسیم اور اختلافات کا شکار کرنے کے لئے تحریر
 کرنا حسب موقع اپنے قطعی موقف تک کو تبدیل کر لینا، جنہیں کافر کہنا ان ہی کے
 دسترخوان پر گیلے ہاتھوں آویزاں ہو جانا۔ رنگے ہاتھوں مقتول کی فاتح کے لئے
 ہاتھ اٹھانا، جفا سے توبہ اور زود پشیمانی کے پشیمان ہونے کا یہ انداز صرف
 پاکستان کی سیاست کو ہی زیب دیتا ہے جو قیام پاکستان کے مخالفوں نے
 ورغلا کر اغوا کر رکھی ہے۔ دوستی کے پردے میں سازش نہ ہو سکی تو اب وسیع
 تر اتحاد کی سوجھی۔ وہ بھی دور کی نہ سوجھی قریب تر کی سوجھی۔ آنکھوں سے اندھوں
 کو تو دور کی سوجھ جایا کرتی ہے کہ آنکھ بند ہو تو فاصلے گرفت میں ہوتے ہیں مگر
 عقل کے اندھوں کو قریب کی بھی سوجھ جائے تو داد دینا چاہیے۔ یہ وسیع تر اتحاد
 اسی طرح کا ہو سکتا ہے کہ سردی سے کپکپانے لگیں تو کوٹ اور اور کوٹ کا اتحاد
 کر لیں یا ہاتھ بگلوں میں دے کر دست و بغل کو متحد کر دیں۔ کوئی فکری تحریک
 سیاست کی دسترس میں نہیں ہے جو عوام کو مطمئن کر دے اور غیر مطمئن متحد
 ہوتے فطرت نے آج تک نہیں دیکھے۔ جس سنگ دلی سے قومی اتحاد کو
 پارہ پارہ کیا گیا اور پھر صوبائی عصبیتوں کی سیاست برپا کی گئی، اس انداز سے
 تو کوئی نئے عشق کے لئے سابق بیوی کو بھی طلاق نہیں دیتا۔ اگر اب پشیمانی
 ہونے لگی ہے تو اتحاد کر لو۔ مگر حلالہ کر لو کہ طلاق قطعی کا اعلان عوام بارہا سن
 چکے ہیں۔ بغیر حلالہ کے اتحاد ہوا تو کہیں طعن بن کر نہ رہ جائے۔ اس کی کوکھ سے

پیدا ہونے والی سیاست محروم وراثت قرار نہ دی جائے۔ عروس اقتدار کے
 رقیب اغوائے اقتدار کے لئے مل بیٹھیں تو یہی تنازعہ نہ کھڑا ہو کہ سہرا کسے زیادہ
 سجے گا اور باجا کون بجائے گا۔ اتنے امیدوار تو حجلہ عروسی کی بھی چولیں ہلا
 دیں گے۔ عوام اتنے بے خبر بھی نہیں۔ آپ کو نہیں معلوم تو ہم مطلع کرنے کی
 گستاخی کر لیتے ہیں کہ گلیوں بازاروں میں یہ سرگوشیاں جاری ہیں کہ یارو!
 جو لوگ پہلے پاکستان کے مخالف تھے اب آئین اسلام کے مخالف ہو کر مغربی،
 جمہوری، سیاسی عبادت گاہوں میں صفیں سیدھی کرنے کے لئے مصروف مشاورت
 کیوں ہیں۔ لوگ جو سیاسی اتفاق کے سزا یافتہ ہیں، جن کے ذہنوں کا فکری
 انتشار روز و شب انہیں دردناک کرب میں مبتلا کئے ہوئے ہے، سوچتے ہیں،
 نظام مصطفیٰ کے داعی اگر دیرینہ آئینی تضادات کے محافظ بن جائیں تو پاکستان
 قلعہ اسلام ہوگا یا اسلام قلعہ بند کر دیا جائے گا۔ بدیں حالات وسیع تر اتحاد
 کرو، فضاؤں کو ہائے اس زود پشیاں کا پشیمان ہونا کے بین الاپنے دو۔ مگر اس
 وسیع تر اتحاد کے بعد سمندر کا رخ کرنا ہوگا یا دریا ہی کافی ہوگا، یہ فیصلہ ابھی
 سے کر لو کہ صحیح فیصلوں میں تاخیر ہی پہلے سیاست کو لے ڈوبی اور عوام کو بے
 دست و پا کر گئی۔ بروقت غلط فیصلے کرنا ہماری سیاست کا ہمیشہ خاصا رہا ہے۔
 وہ دستاویز جسے ہماری سیاست حھول اقتدار کے لئے آخری سہارا سمجھتی ہے۔
 ایک جتیا جاگتا، رواں دواں سول چیف مارشل لائیڈ منسٹر پیڑ ہے۔ صوبائی خود مختاری
 اور کنفیڈریشن کی گمراہ کن تبلیغ کے بعد اس کو یا اس کے ذریعہ سیاست کو رو بہ عمل
 لایا گیا تو یہ سول چیف مارشل لائیڈ منسٹر پیڑ کپڑے اتار دے گا اور لنگوٹ کس
 کر سیاست اور وطن کے ساتھ وہی عمل کرے گا جو قصاب بکرے کے ساتھ کرتا
 ہے۔ ہمارے ہاں تو عام قصاب مارشل لاء کے قابو نہیں آسکا۔ سیاسی قصاب

کو اس عمل سے کون روکے گا۔ اور پھر ایسے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی
فکری تخلیق کو کون لگام دے گا جس کی بالنسری میں بنگلہ دیش منظور اور پاکستان
نا منظور کے ترانے تڑپ رہے ہوں۔ جو قومی زبان بولنے سے انکار کر دیں،
دشمن ممالک سے امداد طلب ہوں، تخلیق پاکستان کو سازشِ افرنگ قرار
دیتے ہوں، جو دین کو وطنیت کے سڑاندھ دیتے ہوئے تالابوں میں غوطے
دینے کے مرتکب رہے ہوں، جو حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرح اللہ کے
دین کے حواری ہوں، ملکیت کے دیدہ ور ہوں، اُن سے استحکام پاکستان
اور احیائے اسلام کی توقع رکھی جائے۔ امام حسین علیہ السلام کے مشکیزوں
کو تاریکیِ شب میں کترتے ہوئے سیاسی چوہے کیا آئین اسلام کے نفاذ کے
مدد و معاون تسلیم کر لئے جائیں۔ ایسا کر لیا گیا تو عوام الناس نہ حامی بھریں گے،
نہ مطمئن ہوں گے۔ خوشا! کہ وطن عزیز سے یہ آوازہ بھی بلند ہوا کہ عمدہ طلب
نہیں کیا جائے گا اور اگر کیا جائے تو عمل سخت کی بھی ممانعت نہیں ہوگی۔ کیا
یہ بُرا ہوگا کہ تمام سیاستدان متمنیانِ انتخابِ فی الفور و درپردہ طالبانِ اقتدار و عہدہ
و مرتبت و وسائل و چندہ وغیرہم بھی متفقہ اعلان فرمادیں کہ آئندہ ہمیں
بھی امیدواری کی علت لاحق نہیں ہوگی۔ اور اگر ہو تو ہمارے بھی منہ پر تھوک
دیا جائے۔ جواب آں غزل نہ سہی، مصرعہ ثانی ہی لگ جائے کہ بجالی اعتماد کا
کچھ سامان تو ہو۔ کہیں ایسی سیاسی چال نہ چل بیٹھے گا کہ لوگوں کا تھوک بھی
خشک ہو جائے اور سیاست کا منہ بھی نہ رہے۔ یہ مشورہ اُس فقیر کا ہے جس نے
بروقت دعوتِ اتحاد دی، قبل از وقت آگاہ کیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا
نام لے کر اگر خبیث باطن کو راہ نما بنا کر کوئی پُر از فتنہ و فساد عمل وارد کیا گیا تو
منزل چھن جائے گی۔ فریقین نہیں ہوں گے، کوئی اور ہوگا۔ سیاسی تجربہ کاروں

نے اسے ناجذبہ کاری جانا اور نمرودِ فکر عقل و دانش کو بالائے بام بھیج
اُس آگ میں ہاتھ ڈال کر نعرہ زن ہو گیا جسے کوئی بردا، کہنے والا کوئی نہیں
تھا۔ اب بھی وقت ہے اتحاد کو وسیع کرو مگر یوں کہ ہر شہری اس کی وسعتوں
میں سمجھ جائے۔ متحد و متفق ہو کر مطالبہ کرو، کہ آؤ! صاحبانِ اقتدار، عہد کریں،
ہم میں سے کوئی عہدہ کا طلبگار نہیں ہوگا۔ آئین اسلام نافذ ہوگا۔ ہم سب
کے سب اور سارے کے سارے اسلام میں داخل ہوتے ہیں، رقیب بن کر نہیں،
دوست بن کر۔ حریف بن کر نہیں، حلیف بن کر۔ اسلام رہے اور مارشل لا
نہ رہے۔ تو کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا، ماسوا اُن لوگوں کے جو یہ چاہتے ہیں
کہ پاکستان نہ رہے۔ یوں متحد ہو جاؤ، ورنہ پاکستانیوں کی یہ عادت ہے
کہ تھوکتے بہت ہیں، چاہے پان کھا کر ہی تھوکنے پڑے۔ یوں اگر اتحاد قائم ہوا
تو میں اور پوری قوم سیاسی فراست کا منہ چوم لے گی ورنہ سیاسی فضا میں مزید
گریاں ہوں گی کہ جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے۔



حُتّی لے لے ستاریاں والی

اے معالجِ بجانِ شفاخانہ، امراضِ سیاست، اے حکیمانِ سرِ بجیب و دشنہ بکف،
 اے ماہرانِ عارضہ ہائے راشیاں و مرتشیاں، اے نقیض شناسانِ گراں فروشاں،
 اے قاریانِ نیورانِ قانونِ کُشاں، اے آگاہانِ کارِ ذخیرہ اندوزاں، اے زمام
 کارانِ سیاستِ پابہ گریباں۔ اے مصنفینِ احکامِ ارفع، اے مغیلانِ وادیِ فکرِ
 آزاد، اے زندہ ہائے مردہ بدست۔ اے! کہ تم جو تلاشِ یوسف میں برادرانِ یوسف
 سے مشورہ کناں ہو۔ حُسنِ یوسف کو زلیخا کی ہم حرص ہم جولیوں کی نگاہوں سے یہ کہہ
 کر پرکھتے ہو کہ دیدہ ہائے یعقوب تو نابینا ہو چکے۔ بتانِ آزر سے نیتِ نمرود دریافت
 کرتے ہو۔ عیالِ فرعون سے پرستشِ احوالِ آلِ موسیٰ میں مصروف ہو۔ یوسفِ نجات
 سے تفسیر و تاویل ”لم یحسب“ پوچھتے ہو۔ مریم طاہرہ سے ”خلقنا العیسیٰ کمثلِ آدم“
 کا محاسبہ کروا تے ہو۔ تاریخِ بولامب بفرمائشِ ابو جہل تحریر کروا تے ہو۔ تسلیم
 کروانا چاہتے ہو کہ ”ذبحِ عظیم“ کا اشاراتی تعلق مینڈھے سے ہے، اسمعیل سے
 نہیں۔ زلیخا سے ہرگز نہیں پوچھتے کہ تو عقب میں کیوں بھاگی، یوسف کے گرتے سے کہتے
 ہو، تو پھٹا کیوں! اور پھر قمیصِ خونِ آلود سے نہیں، دامنِ وحشتِ گرفتہ سے دیدہ
 یعقوب کی گریاں نابینائی کا علاج، اُسے روزنِ دیوارِ زنداں بنا کر کرداتے ہو جہاں

کسی حاجرہ کو مصروف سعی اور اسمعیل کو ایڑیاں رگڑتے پاؤ۔ آب زم زم پی پی کہ
 اسحاق و سارہ کو آواز دیتے ہو کہ حرمتِ امن خطرے میں ہے۔ اندیشے ظاہر کرتے
 ہو کہ تاحال ابراہیم بے خطر آتشِ مزد میں کود جانے سے گریز واجتناب کا قائل نہیں
 ہوا۔ جنگ بدر میں پیچھے رہ جانے والوں کی معصومانہ دوراندیشی پر دلیل لاتے ہو۔
 واقعہ کربلا پر تحقیق مقصود ہو تو خنکی آبِ فرات پر مقالے لکھتے ہو۔ حکمِ رجم اہلس ہو
 تو ہاتھ روٹی میں لپیٹ طواف کعبہ میں مصروف ہو جاتے ہو۔ تحقیق دانشِ عرفات مقصود
 ہو تو تم قربانی کے گوشت کے ضیاع کی نشاندہی سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ شوقِ وصولی
 ناقہِ حسین کے لئے قیام کو فدا اختیار کرتے ہو۔ لباسِ فکرِ زناں زیبِ ذہن کئے، کیو تر اٹھوں
 میں لئے منتظر ہو کہ شاید کوئی نور جہاں ادھر آنکھے۔ فہم و ذکا و دانش کی ہر ممتاز محل کو مشورہ
 دیتے ہو کہ تو داعیِ قضا کو لبیک کہہ دے تاکہ ہمارے اذہان دنیا کا آٹھواں عجوبہ
 تعمیر کر سکیں کہ سیرگاہِ سیاحانِ عام قرار پائے اور لوگ ہرے راما، ہرے کرشنا پکارتے
 اس کے تختوں میں پوست کے پودے لگاتے رہیں۔ ہر غزنوی کو سومات کے نیلام گھر
 میں لاکھڑا کرتے اور اُسے یقین دلاتے رہیں کہ بُتِ فروشی کا رِنا پسندیدہ سہی، بُتِ
 خریدنا تو فراستِ مومن ہے کہ بُتِ خرید لوگے، تو نہ بُتِ کافر کی تحویل میں رہے گا۔ نہ وہ
 اس کی پرستش کرے گا خواہ مخواہ الزامِ بُتِ شکنی اپنے سر کیوں لیتے ہو۔ سارے بُتِ
 اپنی تحویل میں لو۔ شاید کبھی تاویل پوجنے پڑیں۔ اے صالحینِ عقلِ عیار! مدینہٴ ہاجرہ و انصار
 کے کیا مسائل تم نے حل کئے کہ ہجرتِ تقدس گنوا بیٹھی۔ انصارِ نصر کو ڈھونڈ رہے ہیں
 اور جس الف کو دیکھو، ثانی ہونے کا وعدہ دروغ لئے کھڑا ہے۔ عالم و مشائخ تو کجا اشکیانِ
 زبانِ اردو تک اس قدر معتقدِ میکائیلے لکے کہ ہر محفلِ ادب میں لیڈی کرزن چھن چھنا چھن
 ناچ اٹھتی ہیں اور تہرؤ فکر کو لیڈی مونٹ بیٹن کے سکرٹ پر نقشِ پھول پتیوں سے
 بولتی ہوئی بہاریں سنائی دینے لگتی ہیں۔ تم نے جب بھی علاجِ شکستِ رشتہٴ تسبیحِ شیخ

تجویز کیا، پختہ زنا رہونا ہی تجویز کیا، تم وفاداروں اور اطاعت گزاروں کو چادر کی حفاظت کی تلقین کی گئی تو تم نے ہر گپڑی اچھال دی اور دوپٹے سر کالئے اور مزید تشریح فقہ یہ نکالی کہ بوقت تذلیم عصمت چادر اتار کر ایک طرف رکھ لینا ہی احترام قانون ہے۔ چار دیواری کو محفوظ رکھنے کی فرمائش ہوئی تو سارے شہتیر، تمام عماد گرا دیئے اور بعد از سلام فرشتی با ملاحظہ با ادب ہوشیار ہو، عرض داعی کہ حضور چار دیواری سالم و محفوظ برائے ملاحظہ خاص حاضر ہے۔ دوران اوقات دفاتر تمہاری نماز با جماعت کے لئے مہیا شدہ لوٹے تمہارے منتظر ہی رہے مگر تم نہ لوٹے اور تمہاری فکر و دانش کی طرف ساز "سوہنی"، کتاب لحم مہینوال کی لذتوں کے چٹخارے لیتی، کنار چناب آواز دیتی رہی کہ کوئی مچھلی پکڑی ہو تو آؤں۔ کہ اب کسی مٹکے کے کھر جانے کا کوئی اندیشہ اس لئے بھی باقی نہیں کہ جب ہمارے صفِ اول کے نامور ادیب کی پختگی، خشت پر تحقیق اس امر کی ضمانت ہے کہ اب کسی غالب خستہ جان کی بھی چھت نہیں ٹپکے گی تو کسی گھرے کے کچا رہنے کا خدشہ، اس کے کچا ہونے کے باوجود بھی کیونکر جائز ہے۔۔۔۔۔ تم سے آخر کیوں دریافت نہ کیا جائے۔ کیا تمہاری تربیت، تمہاری دانش، تمہارے تجربے، تمہارے پے سکیل، تمہارے اختیار سے بے اختیار کیوں نہ پوچھا جائے کہ تم جو "ہوائیخ" کمروں میں ایستادہ "آدم بو، آدم بو، پکارتے رہتے ہو، تمہارے اس ذہن نے جس کو قابلیت مہیا کرنے پر قومی خزانہ کی کثیر رقم خرچ ہوئی اور ہر مرتبہ اور بالخصوص یومین عیدین پر ذہن قصاب مملکت جمہوریہ اسلامیہ سے بھر پور شکست کیوں کھائی۔ اور ہوتے ہوتے لحم بزرچیس ۲۵ روپے فی کلو کیوں کر ہو گیا۔ دیسی گھی جو قبل از تقسیم برصغیر ایک روپے کا سوا سیر دستیاب تھا پینتیس روپے سیر کیوں کر ہوا۔ یہ صورت حال کیوں برپا ہوئی کہ بروئے نسخہ حکیم حاذق اگر مریض کو دن میں تین بار خالص دیسی گھی دور سے دکھانا ہو تو مریض مر جاتا ہے مگر یہ دستیاب

نہیں ہوتا۔ کولڈ سٹور تعمیر کرنے کی تجویز و اجازت مرحمت فرمانے والو! کرلیے،
 ٹنڈے، کدو، آلو، بھنڈی، ادراک، پودینہ بلکہ بینگن تک اپنے تھالی کے ہم عادتوں
 سے پوچھتے ہیں، اس سرسبز زراعتی ملک کی ہر سبزی تم سے سوال کرتی ہے کہ چوبیس
 روپے سیر کرلیے خریدنے کے بعد مزدور اپنی محبوب بیوی کو زد و کوب کر بیٹھے تو کن
 نیم چڑھوں سے دوبارہ پرسکون خانہ آبادی کی امید رکھے۔ لاہور میں مزدوری بجالانے
 والے کسی مزدور کی معمر والدہ اگر فیصل آباد میں بفضلِ بنا سبتی و ملاوٹِ اشیائے
 خوردنی لبِ مرگ پہنچ جائے تو تمہاری لمحہ بہ لمحہ سفرِ آخرت کا پتا دیتی ہوٹی ایکسپریس
 کا کرایہ وہ کہاں سے لائے۔ عام کپڑا بھی پچیس روپے گز بکوانے اور شلوار اور کمرتہ
 کی سلوائی پینتیس روپے دلوانے والو! غریبوں کے بچے کیا بروزِ عید مزید ننگے نہ ہو
 جائیں گے۔ کھانا کھاتے ہوئے گنا اگر قریب آکر دم ہلانے لگے مائلی اگر ”میں آؤں“ پکار
 کر اجازت طلب کرے اور گھر والی پکار اٹھے کہ بوٹی نہ پھینکنا، تین روپے کی بنتی ہے۔ تو
 کتے کو کیا جواب دیں، بلی کو کونسا آرڈی ننس پڑھکر سنائیں۔ بچے جسے پیار سے ماں راجہ
 کہہ کر پکارتی ہے، جو کسی بھی ماں کے تصور میں کبھی نا اہل، کم تعلیم یافتہ، کم مرتبہ نہیں رہا
 جسے فقروں نے بھی ہزاروں پر قلم چلانے کا مزدہ سنایا، کسی درسگاہ میں، جہاں درس لگے
 اور فیس روزانہ ہوتی ہے، داخل کروانا ہو تو تخمینہً اخراجات کس سے لگوائیں علیحدہ
 ٹیوشن کا انتظام کہاں سے کریں۔ کتابیں کتب فروش کے ہاں سے چرا بھی لائیں تو
 انہیں اٹھانے کی تاب و توانائی کے لئے اس پروردہ نیل، بنا سبتی خور کو جس سروسوں
 کے تیل کی مالش لازم ہے، اس کا بھاؤ سن کر ہی ہماری زبان فارسی بولنے اور ٹانگیں
 کانپنے لگتی ہیں۔ جمعہ بازار کون جائے گا۔ گندم نہ ملے تو چنے، نہیں توجو، نہیں تو
 جس غنیمت است قرار دینے والے بزرگ اگر زندہ ہوتے تو ان سے ہی پوچھتے کہ سبھی
 قوت خرید کی دسترس سے باہر ہو تو پھر کیا کھائیں۔ تم سے کون پوچھے کہ تمہاری

حد سے گزر جانا بھی "تو جلدوہ" کو دعوت دینا ہے۔ قوم کے خرچ پر گدے دار کرسیوں میں گھسے ہوئے لات دعویٰ کی کھوکھلی آنکھوں میں کس کے دیدے آویزاں کریں کہ انہیں یہ دکھائی دے سکے کہ ایک زراعتی ملک میں دروازوں اور کھڑکیوں کو کیا چارپائیوں کے لئے بھی لکڑی مہیا نہیں۔ چول، بھی ٹھکوانا ہو تو چار اٹھنیاں درکار ہوں گی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جس ملک میں معدنی لوہا نایاب ہے، وہاں چارپائیوں اور گھریلو فرنیچر پر لوہا صرف کیا جا رہا ہے۔ شاید سٹیل مل کامیابی سے چلانے کی تیاری ہے۔ کیلے کا بھاؤ سنتے ہی نسِ قولنج پھول جاتی ہے۔ انار اور سیب تو واقعی ہیر سیال کے اعضائے حسن ہو گئے ہیں کہ بارہ سال مولیتی نہ ہاں کو تو چھونے تک کی اجازت نہیں ہوتی۔ افطاریوں نے وہ گل کھلائے ہیں کہ اچھے اچھوں پر زکوٰۃ فرض نہیں رہی۔ اور جنہیں زکوٰۃ ملی، ان کی پرات تیسری سحری پر ہی توے کا مرنہ چڑانے لگی اور ٹیلیوژن کے پنڈو نصائح سے ہی افطاری ہوئی۔ اب سامانِ عید کون سے بینک کی بلا سود سرمایہ کاری کے ذمہ ہو گا۔ بھونکنے والے کتے پر بھی جوتا اٹھائیں تو ایک صد بیس کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے کہ سرکاری "لنٹر" تو پھر تھانوں میں ہی مہیا ہوتے ہیں۔ کوئی تو بتاؤ کہ کون سے کام بند ہوئے کہ وظیفہ خوار شاہ کو دعائیں دینے کی بجائے غالبِ خسرتہ کو بدعائیں دینے لگے کہ مونے کی طبع موزوں نے مار ڈالا۔ زندگی کی ہر قدر بے قافیہ اور وزن شکن بنا کر رکھ دی۔ وظیفہ ماہ بہ ماہ اور مرتشی رذر آتے رہے۔ کس سے پوچھیں کہ تاجبرانِ قوم نے یہ الجبر کس کی میز کے سامنے بیٹھ کر سیکھا کہ ہر کلیئر نس سیل پر، شادمان رکھنے کے لئے برگ گل سے ہرا بھرا بنگلہ جامِ جمشید اور کلاہ سلیمانی لئے ان کا منتظر کیوں رہتا ہے اور شہسوارِ اسپ حکومت کو انکم ٹیکس کے قوانین میں ترمیم کی باتوں میں، شہسوار کی دہشت دلا کر، کون لگائے رکھتا ہے۔ پرچون فروش کی دکان پر چھاپا "پار شاہی" کے کالوں میں اسٹاک ایکسیج کی حدائیں کیوں نہیں آتیں۔ کیوں نہیں جانتے کہ اذانِ ما

جمعہ میں بندش سٹہ بازی پنہاں ہے کہ وورد اسلام سے پہلے یوم جمعہ تا جبران عرب کی جہالت و حرص و آز کی وجہ سے سٹاک ایکسیج کی عشوہ طرازیوں کی نذر ہو جاتا تھا اور خلق خدا گرائی کی چٹکی میں پس جاتی تھی جس نے یہ تجارتی جو ائبند نہ کیا اس نے صرف جمعہ کو چھٹی کی۔ صرف یہی کہا، جاؤ! جمعہ کو چھٹی ہوئی۔ قومی تشخص کے اظہار کے لئے اچکن ضرور پہنیں مگر اچکن پہن کر اگر کوئی آزار بند کو لٹکنے سے منع نہیں کرے گا تو تمسخر سر بازار اڑے گا۔ یہ کیا سانحہ ہے کہ مقننہ جب بھی شلوار پہنتی ہے، عمال شلوار میں بٹن ٹنگوا لیتے اور لاسٹک ڈلو لیتے ہیں۔ انسان ننگے ہو رہے ہیں مگر دانش عیار پر یہ راز کیوں نہیں کھلتا کہ انسانی معاشرہ میں احساس عدم تحفظ ہی گرائی کا باعث ہوتا ہے۔ کیوں یہ نہیں جان پاتی کہ مایوس اور قنوطی انسان ہی جنسی جرائم کی طرف راغب ہوتا ہے، زنا بالجبر کا مرتکب وہی ہوتا ہے، جس کے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالات کے جواب میں کائنات گونگی ہو جائے۔ اعتقاد کمزور پڑ جائے، مجروح ہو جائے تو نفرت و انتقام کے لاوے پھوٹ اٹھتے ہیں۔ کسی معاشرہ میں اعتقادی احکامات کو یوں رو بہ عمل لانا کہ ان کے قابل عمل و تقلید ہونے پر شک ہونے لگے، انسانوں کے اعتقاد کے خلاف سب سے بڑی سازش، سب سے بڑا مذاق ہے۔ انسان کا مایوس ہو جانا ہی اس کا ابلیس ہو جانا ہے۔ وطن اگر انسانی وقار و عزت و توقیر کی حفاظت نہ کر سکے تو حسب وطن مفقود ہو جاتی ہے۔ گھروں میں چولہے نہ جلیں تو سڑکوں کی روشنیاں دیکھنے کوئی نہیں لگلا کرتا۔ بھوک کی مائیں چراغ خانہ سرشام ہی بچھا دیا کرتی ہیں۔ جب تک انسانی ہاتھوں سے خود اعتمادی سرک نہ جائے، کوئی سرقہ نہیں کرتا اور سرک جائے تو کر ڈرتی بھی سرقہ کو عادت ثانیہ بنا لیا کرتے ہیں۔ اور حکومت جو عام چور کو قطع ید کا حکم سنارہی ہوتی ہے، اپنے ہی چور کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہے۔ حکومت جن عمال کی تربیت پر کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے، ان سے کیوں نہیں پوچھتی کہ اے ہمارے چمکتے ہوئے متبرک ریالو،

رواں دواں مقدس دینارو! مسائل معاشرۃ انسان کے خالقو! لوگ ٹریفک کے معمولی معمولی قواعد تک کی پابندی سے بھی کیوں باز اور ممنوع رہتے ہیں۔ کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں، اور اگر ہے تو تم پر اٹھائے گئے خرچ کا زیادہ نہ سہی، ایک چوتھائی کیوں وصول نہ کیا جائے کہ تم تو یہی بتاتے رہے کہ حضور لوگ ”منجلی آواز“ نہیں سنتے۔ پیٹ جو بڑھا تو آواز بلند نصیب دشمنان ہو گئی۔ یہ لوگ صرف ”برک“ سنتے ہیں۔ لہذا باوجود احکام امتناع استعمال ہر چوک میں لاؤڈ سپیکر نصب کروا دیجئے۔ تاکہ ہم چست پوش اچانک چلا کر باعث حادثات و سانحات بنتے رہیں اور سامان روزی عیال ہوتا رہے کہ نمک خواروں کا آپ کے خزانہ پر مزید بوجھ ڈالنا ہم عزاداروں کی مردت کو زیب نہیں دیتا۔ جرائم بڑھ جائیں تو حضور سی۔ آئی۔ اے بنا دیجئے، کرائمز کی سپیشل برانچ لائن بچھو دیجئے۔ تشکیل ایف۔ آئی۔ اے سے طرح ”فالٹو انصاف آمد“ نکالئے۔ کارپوریشن۔ ایل۔ ڈی۔ اے، واسا قائم کیجئے۔ پھر دیکھئے، دور کی کوڑیاں کیوں کر کھنکتی ہیں۔۔۔۔۔ گناہ معصوم کی زندہ دیویو! تم نے صرف اسامیاں بڑھوائیں، علاج امراض معاشرہ تو کسی طور بھی نہ ہوا۔ اب حکومت کیا منتیں کرے کہ بکریو! اپنا گوشت سستا کرو۔ کہ باوجود امریکی امداد اسلحہ کے ہمارے اہل کاروں کے قابو میں دو چھریوں، ایک بگدے اور روزانہ چند قریب مرگ بکریوں کو کشمکش حیات سے نجات دلانے والا ناجی قصاب نہیں ہے۔ سبزیو! تمہیں اپنی طراوت و تازگی کا واسطہ ہمارے عمدہ داروں اور پالیسی سازوں کے پاس آرٹھیوں اور پرچوں فروشوں کی ریشہ دوانیوں کا کوئی علاج نہیں ہے کہ ہمارے افسروں نے کبھی سبزی فروخت نہیں کی۔ لہذا تم منڈیوں اور دکانوں میں گلی سٹری شکل بنا لیا کرو اور گاہکوں کی جھولیوں میں جاتے ہی ترو تازگی بکھیر دیا کرو۔ اے خوردنی تیل! تو انوکھی جھارا پرور ہو جا! کہ ویسی گھی اور تازہ دخالص دودھ بھینسوں اور گاؤں تے صرف

کسی مدعی، اقتدار سیاست دان کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ قیمتوں کی سطح کو موجودہ معیار پر لانے کے لئے کوئی ایک تجویز ہی پیش کرتا اور نہ ہی کسی کو یہ توفیق ہوئی کہ جن لوگوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ قیمتیں - ۱۹۷۰ کے معیار پر لائی جاسکتی ہیں، ان سے دریافت کرتا کہ یہ فقط نعرہ شاطرانہ تھا یا کچھ حقیقت بھی تھی۔ عوام کے مسلسل جان لیوا دکھوں کا کوئی مداوا نہ ہوا، بس کاروں کے ماڈل نئے ہو گئے، عمارتوں کو نئے ڈیزائن اور مزید آسائشیں میسر آگئیں، ساڑھیوں کے زردوز بارڈر مزید چوڑے ہو گئے۔ چوہاروں میں جوڑے اگر کلیوں کی بجائے گلاب کے پھولوں سے سجئے لگیں تو گلیوں کے بھوک سے بلبلا تے ہوئے ننگے بچے مسکرانے تو نہیں لگ جائیں گے۔ ماؤں کے دیدے بھوک سے پھٹنے لگے اور علاج صرف یہ باقی رہ گیا کہ نور چشم کو ویڈیو سیکھا کر بیرون ملک بھیج دو اور پھر ظہور دستگیری قدرت دیکھو کہ وہ پلاٹ جو چند سال پہلے چند صد روپے سے خریدا جاسکتا تھا، لاکھوں میں خریدنے کی استطاعت کیونکر در آتی ہے۔ رنگین ٹیلیوژن دیکھو۔ فرقتِ لختِ جگر میں رونا رجعت پسندی ہے، دقیانوسیت ہے۔ بیٹے کی تصویر دیکھو، ٹیپ شدہ آواز سنا، اسے بیرون ملک اپنے ہی ملک میں تشدد پھیلانے کی تربیت دی جا رہی ہے تو کیا ہوا، زرمبادلہ تو آ رہا ہے۔ اپنی سرحدوں پر لاکھ خطرے منڈلائیں، فرزند ان وطن کو تحفظ تاج و تخت و سرحدات دیگران کے لئے استعمال ہونے کے لئے نہ سہی، دیارِ غیر کی سر زمین کاشت کرنے کے لئے فارغ رکھو کہ دنیا سگڑ چکی اور ماسوائے ہلکے ہلکے ہر ملک، ملک، ما است کہ ملک یارانِ ما است، زمانے نے ثابت کر دیا کہ نہ کوئی نظامِ مصطفیٰ کے لئے مخلص تھا نہ ارزانی، آسائش ہائے زندگی کے لئے۔ حریصانِ اقتدار کی معاون حکومت کے باوجود نہ نظامِ اسلام نافذ ہوا، نہ کسی باورچی خانہ کی چیں بچیں مٹی۔ جو اقتدار سے علیحدہ رہے، وہ نظامِ اسلام کے ”الوکی“ ہونے کا دعویٰ اور مغربی جمہوریت کا تقاضا کرتے رہے اور عوام سے

کہتے رہے: ”جنتی لے دے ستاریاں والی جے توں میری ٹور ویکھنی“ یہی تھا ضارہ
کہ ہمیں اقتدار میں لانے کا بندوبست کرو۔ پھر دیکھو، ہر آنکھ میں سرمہ ڈلو، سنہری
عینک لگوا، ہر قمیص کو پاؤں تک پھیلتا ہوا جبہ بنا دیں گے۔ ہر جسم سے عروسی
عطروں کی خوشبودور دور تک یوں پھیلے گی کہ پوری دنیا چندہ لئے بھاگی پھرے گی
کہ حضور ہمارے ہاں بھی تھوڑی سی تبلیغ اسلام فرما دیجئے۔ کہ تھپڑ، ریگن، برزنیف
سوزو کی تو کیا متونی ماؤزے تنگ تک اللہ کے حضور سجدہ کناں ہے کہ ایک بار
ماڈرن شٹر سوار اذکار سیاست کے دامن تبلیغ کو چوم آنے دے کہ ایسا خادم اسلام
کہاں سے ملے گا جو یہ ضد کر سکے کہ صرف میں آؤں گا تو نظام اسلام لاؤں گا۔ اگر میں نہیں
آؤں گا تو نظام اسلام بھی نہیں آئے گا۔ جب تک میں نہ آؤں، اسے ہرگز نہ آنے
دینا اور اس کے بغیر اگر کوئی نظام اسلام لانے کی معمولی سی ملی جلی تحریک بھی
کرے تو مغربی پارلیمانی جمہوری آئین کا یہ دستخط کنندہ فتویٰ عالمگیری کے نفاذ اور
مغربی جمہوریت کی بحالی کا مدعی بن بیٹھے۔ دوسری طرف لاثانی اسلامی شاہ پرست،
جمہوریت نواز، خلافت و ملوکیت کی موٹنگائیوں کے باوجود نفاذ نظام مصطفیٰ کو مسئلہ
ثانوی قرار دیتے تخت مذاکرات سے اٹھ کر پائیہ تخت اقتدار افلاکی تھام لیں۔ فال نکلوانے
لیگیں کہ پروردہ افرنگ پر حدت نواز، بتا کہ عوام کے منہ لگے بغیر ہم خواص کا ساحلی اقتدار
۱۹۸۲ تک تو بموجب علم نجوم چلے گا ہی، مزید عرض کریں تو کتنا طول کھینچے گا۔ اسلام
کا نظام سیاست و حکومت برپا کرنا تو ان علمبرادران تفسیر و فقہ متنازعہ کا حق سہی،
کوئی تجلی راز ہائے سرلسٹہ پر اصرار کیوں کرے۔ لیکن یہ دریافت کرنے کی اجازت تو
ہونا چاہیے کہ باوجود بین الاقوامی گرانی کے اس شرح منافع کا جو تاجروں کے تین چار
طبقے ملکی پیداوار صرف تک پہنچنے سے پہلے وصول کر لیتے ہیں، کیا جواز ہے۔ اور
اوسطاً چھ گداگروں کا کیا کریں جو سر راہ ”سبیل“ پر پانی پینے کے لئے رکتے ہوئے

مسافر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کے وہ بچے کہاں سے تلاش کریں جہیں بیرون ملک بھیج کر ان کی غربت کا علاج کیا جاسکے۔ سوچو تو! ملک اگر اپنے افراد کو روزگار مہیا نہ کر سکے تو کہاں کہاں برطانیہ جیسے نسلی فسادات کی نوبت آئے گی۔ ہم خطبہ حجۃ الوداع کے نفاذ پر جابر اصرار کرتے رہیں گے۔ سرمندے عیسائی اور یہودی ہمارے گھر جلاتے رہیں گے اور مسٹر تھیچر کی نصف بہتر ربر کی گولیاں چلاتی ہمیں ”مائٹڈ یور لینگویج“ دکھاتی رہے گی۔ کیا سرکاری سرمایہ کاری، صنعتی اجارہ داری، بھاری کارخانہ سازی، نا جائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، استحصالِ آجر و ہنرمند، اسٹاک ایکسچینج، تجارتی سہ بازاری، ”نظامِ آرٹھت“ باعثِ گرانہ حاضر نہیں ہیں۔ ان بدعتوں کا مستقل اور موثر علاج جس عالم دین کو معلوم نہیں، وہ طالبِ علمِ قرآن نہیں۔ اور اگر معلوم ہوتے ہوئے اس نے علماء کا نفرنس میں بیان نہیں کیا اور شاید اسے اپنے قاضی یا رکن مجلس مشاورت نامزد ہونے تک اٹھا رکھا تو کیا روزِ حشر پندرہویں صدی کی اس عید الفطر پر اپنی خواہشوں اور تمناؤں پر پتھر رکھے ہوئے باعزت سفید پوش اور ان سے بھی پسماندہ افراد اور ان کے اہل و عیال روزِ حشر خالقِ قرآن کے دربار میں عرض نہیں کریں گے کہ بہشتِ شرابِ طہور و حور میں ان عطر آلودوں کو نہ بھیجنا کہ انہوں نے نہ صرف تیرے دین کو مخفی رکھا بلکہ آمدنِ چندہ پر بھی کبھی زکوٰۃ واجب قرار نہ دی۔ قسم ہے خالقِ قرآن و حدیث کی! اگر آج شرکتِ میانہ حق و باطل منسوخ کر دی جائے تو عید الضحیٰ سے پیشتر تمام اشیاء کی قیمتیں - ۱۹۷۰ کے معیار پر لائی جاسکتی ہیں۔ اگر نہ آئیں تو مجھے بددعا دیں کہ بذریعہ تشدد پسنداں ہائی جیک ہو جاؤں۔

مُشری ہوشیار باش

صاحبو! فقیر پر تقصیر، کہ نہ مدعی دانش ہے، نہ سزاوار سیاست۔ زندگی کے آخری ایام کا گرفتار، اگر ترقی ہوئی دیوار کا سایہ، نامعلوم کب اپنے ہی ملبہ تلے دب جائے، کیا خبر کون سی تحریر آخری قرار پائے، کون سی تقریر مہربان ثابت ہو۔ صبح و مسا اپنی ہی فاتحہ خوانی کا منظر پیش نظر ہے۔ کاروبار حیات سمٹ رہا ہے۔ رختِ سفر بندھنے کے آثار نمایاں ہیں۔ پاؤں رکاب میں پھنسے ہوئے ہیں لگام ہاتھ سے چھوٹی جا رہی ہے۔ کوئی ملنے آئے تو معلوم ہوتا ہے، عزادار افواہِ مرگ پر اعتبار کر کے بھاگا چلا آیا ہے۔ تنہائی ہو تو عالم نزع از خود طاری ہو جاتا ہے۔ دن میں کئی بار اپنے سے ہی دریافت کرنا پڑتا ہے۔ کہو! اچھے تو ہو، زندہ ہو۔ سامانِ سفر سوائے حذر کے کچھ اور بھی ہوتا تو شاید سمیٹنے میں دل لگا لیتے۔ جو کچھ جھولی میں ہے، نہ وصیت کیا جاسکتا ہے نہ مال وراثت قرار پاسکتا ہے۔ اللہ نے جو دیا، ناقابلِ تفریق و تقسیم ہی دیا۔ زندگی فرقت شناسائی اور قسمت ستائی میں ہی کٹ گئی۔ نہ دوستوں سے کوئی نگلہ ہے نہ زمانہ سے کوئی شکایت۔ زندگی خدا کو آوازیں دیتے تھک گئی، اب منتظر ہوں کہ کب خدا آواز دے۔ اس سہم کے سہم میں بھی عجیب کیفیت ہے۔ موت آنے میں دیر تو ہو گئی، اندھیر نہیں ہوگا۔ زندگی میں کسی غرض سے دوستی

کی ہو یا کسی کو دشمن تصور کیا ہو، یاد نہیں آتا۔ پھر بھی بغیر کوئی عذر کئے کوئی دلیل لائے، ہر لغزش ہر خطا، ہر سہو، ہر کوتاہی کے لئے غیر مشروط معافی کا طلبگار ہوں۔ جنہیں موت کے بعد معاف کرنا ہے زندگی میں ہی عفو فرمائیں۔ تو سے "جبیں پر عرق ہے وقتِ آخر آئینہ لاؤ۔ ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے" کا لمحہ سہل ہو جائے۔ زمین پر بوجھ نہ بن جانے کی کاوش کے باوجود، کیا معلوم کتنی صدیاں مٹی کے بوجھ تلے دبا رہنا ہوگا۔ انسان زندگی میں ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، مرقہ پر بھیرے بھی لیٹے رہیں تو خاموشی سے برداشت کر لیتا ہے۔ ہر چند کہ یوں تخیلاتی عالم نزع میں گرفتار ہیں مگر کیا کیجیے کہ نظر پھر بھی حالات و وارداتِ زمانہ کی سمت اٹھ جاتی ہے۔ آمدِ مرگ کا حُسن عالمگیر بہت دلکش ہے مگر حُجلہ عروسِ اقتدار میں سجائے ہوئے خود مستوں، ایوانِ اقتدار کے خواجہ سراؤں اور حرصِ اقتدار کے سگ پرستوں کے عمد آفریں غمزے بھی کوئی کم دل فریب نہیں اور پھر "نظر بندِ اقتدار" جو رقیبانِ اقتدار کو کبھی نظر بند رکھے تو کبھی "نذر بند" کبھی نازاٹھا مارے، تو کبھی نیاز چڑھا دے، مرتے مرتے بھی دیکھنے کی چیز ہوتا ہے کہ داورِ محشر بھی دورانِ عرصہٴ محشر اسے دیکھ دیکھ کر خلق کو دیکھے گا۔ پاکستان میں ذاتِ بے ہمتا کی سروری کو غصب رکھنے کے لئے ایسے بتانِ آزر نے جو سیاسی عشوہ و ناز و ادا روار کھے، اُن کی خود سری نے کتنے آئینے یوں شکستہ کئے کہ نگاہِ آئینہ ساز تک میں مکروہ قرار پا گئے، ایک ناگفتہ بہ داستانِ طویل ہے۔ بات کریں تو وہ افراد مزید مبہم ہو جائیں گے، جنہیں بفضلِ حق اپنے نام کے گرام اور صرف و نحو کے سہو سے آگاہی تو نہ ہوگی مگر ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ کے عوامل برپا کرنے میں ماہر ہو گئے۔ چھپنے والی شے تھے مگر شوئے قلم ہی جانئے کہ چھپنے لگے۔ جلو تلوں کے

مایوس، کاش خلوتوں کو اپنے خالی اذہان میں محفوظ رکھتے تو خود ساختہ نیرازی
 ان کا مقدر نہ ہوتی۔ قلوب پر جو مہریں سکوں کی چکا چوند نصب کیا کرتی ہے وہ
 ازل سے ہی اذہان کے تپش خانوں میں تپائی جاتی رہی ہیں۔ کائنات کی جملہ
 تخلیقات پر نگاہ ڈالیں تو سلمو اتسلیما کہ اس نظام میں انسان ہی ایک ایسی
 تخلیق ہے، جس میں غیر مسلم بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ انسان ہی ہے جو لمحات
 پیدائش و موت پر کوئی قدرت رکھے بغیر انتہائی خود سری سے اپنے لئے معروض
 نہی خود تجویز کرتا ہے اور ضوابط کائنات سے باغی ہو کر کبھی مادر آزاد بن
 جاتا ہے کبھی پدر برہنہ۔ اور اپنی ہی حاکمیت کے قیام کے لئے وہ سیاسی عمل
 برپا کرتا ہے، جیسے کوئی سربراہ خاندان مادر زاد برہنہ، خواب گاہ سے نکل،
 صحن میں آکھڑا ہو اور گھر کئے لگے، کہ بے شرمو! دیدوں کا پانی پی گئے ہو کیا؟
 نگاہ پست کرو اور خلعت لاؤ کہ دربار شاہی میں خالی تخت مابدولت کے
 انتظار میں ہے۔ میرے عقب میں چلو۔ اپنے احساسات و جذبات و عقائد کو
 میرے ہی اشاروں کے تابع کرو کہ تمہاری سالمیت و عافیت میرے ہی قدم
 بے دم سے ہے۔ میری حاکمیت کے نفاذ کے لئے مجھے زندہ باد کہتے بے نام
 راہوں پر مارے جاؤ تاکہ تمہاری مجروح نعشوں کے واسطے سے تحریک کو متحرک
 رکھا جاسکے۔ میں تمہارا خون آلود کفن دکھا کر کثیر رقوم برائے اجرائے سیاست
 خود جمع بھی کر لوں گا، انسانوں کے مسکن بھی جلو اوں گا۔ کرائے کے قاتلوں کے
 ہاتھوں فرزندان وطن کے لاشے ترپ جابئیں گے۔ میری حکمرانی کے قیام کے
 لئے بیٹے اپنی ہی ماں کی کوکھ میں خنجر نہ گھونپ دیں، باپ کی کمر توڑ کر نعرہ نہ
 لگائیں، کہ آبا! تم نے اپنی لاٹھی کا کمال دیکھا تو پھر، اے میرے سیاسی کارندو
 اور پیروکارو! تمہارے جلسہ کروانے اور میرے صدارتی خطبہ اُگلنے کا مصرف ہی

کیا ہوا۔ میں وہ بساط سجھاؤنگا کہ تمام صوبے میری صوابدید کے محتاج ہو جائیں گے۔ میں محرمیاں اجاگر کروں گا، مایوسیوں برپا رکھوں گا۔ گھر گھر پالتو سیاسی بلیاں بسا دوں گا۔ جو زبان کے تحفظ کے لئے ریتیاں چاٹنے کا فن سکھاتی رہیں گی۔ نسلی امتیاز کو یوں سیاست کا طرہ امتیاز بناؤں گا کہ خطبہ حجۃ الوداع (نعوذ باللہ) کبھی کبھار فقط بیان کرنے مگر کبھی بھی عمل میں نہ لائی جانے والی عبارت بن کر رہ جائے گا۔ سیاسی صوبائی توازن قائم رکھنے کے لئے وہ بازی گری دکھاؤں گا کہ اللہ کی رسی کو پکڑنے کی بجائے اس پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ سرپرلوں گھڑا رکھوں گا کہ لوگ جانیں اس میں میرا سیاسی دماغ ہے، یہ میری سیاسی دانش سے لبریز ہے۔ ہر تماشاگری کے بعد اپنے کمال فن سے منتخب لوگوں کے روبرو جھولی پھیلا دوں گا کہ مر بانو! جان کی بازی لگائی تھی، داد تو دی ہے امداد بھی تو ہو۔ جمہور کو بے حال کر کے جمہوریت کی بحالی راند کے سر پر سرخ دوپٹہ ڈالنے کا عمل ہی سہی، مگر بیوگی کو انا دِ طبع کا دل دادہ بنا دینے کے فن کی داد بھی تو دو۔ میں قائد اعظم رحمہ کا مخالف تھا مگر لڑکوں کے لگائے ہوئے نعرہ لا الہ الا اللہ کا تو مخالف نہیں تھا، زمین پر ناجائز قبضہ کر کے مسجد تعمیر کرنے کا مخالف تھا۔ مسجد تعمیر ہو گئی تو مجھ سے زیادہ امامت کا حق دار کون ہو سکتا ہے کہ مسجد ناجائز پر "ناجائز" قابض نہیں ہوں گے تو کما دیر کی دربانی کریں گے۔ اگرچہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھا، پاکستانیوں کے گناہوں میں شرکت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ شریک ہی نہیں رہا، راہ نما بھی رہا ہوں۔ ایسے گناہوں کی اکثریت چونکہ میرے نام درج ہو چکی لہذا حکمرانی میرا جمہوری حق ہے، جس سے انکار کیا گیا تو باقی ماندہ تمام تر پاکستان کو محرومیت کی دیوار گریباں بنا کر رکھ دوں گا۔ اگرچہ پاکستان کی ایک بھی جمہوری حکومت ایسی نہ ہوگی جس

کی میں نے مخالفت نہ کی ہو۔ اور ایک بھی مارشل لاء ایسا نہ ہوگا جس کی میں نے راہ ہموار نہ کی ہو، یا خوش آمدید نہ کہا ہو۔ مگر یہ تو محض ادیبانہ سہو تھا، سیاسی مبالغہ تھا، اخلاقی غلو تھا۔ دراصل لوگ لا الہ الا اللہ پکارتے ہی اس جوش و جذبہ سے ہیں کہ انسان بے سدھ ہو جاتا ہے۔ اب کے تو بہت دیر بعد یہ راز کھلا کہ مارشل کے ساتھ ”لا“ عربی نہیں انگریزی کا ہوتا ہے۔ بس ایک لغوی چوک ہو گئی تو مسلسل مار پھٹکار سے ہم بھی کچھ کم شل نہیں ہوئے۔

معاونت کی سزا بھگت چکے، تعاون کے مزے کسی اور کا حق کیوں ہوں عوامی لیگ کے بنگلہ بندھو سے بھائی بندی تھی تو کیا ہوا، سقوطِ مشرقی پاکستان کا تعین ہونے لگا تو کیا ہم نے تمام بندھن اس انداز سے نہ توڑ دیئے کہ طوطے انسان چشم ہونے کا طعنہ دینے لگے۔ اپنی حاکمیت کا شوکیں بنا سجا کر عوامی کے انگریزی ترجمہ پیپرز کے راستے میں دیواریں لگا اور دریچے کھسکا ہم یاچی، یا قیوم کے ورد میں مصروف تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ یچی تاک میں بیٹھا ہے اور انتخابات کے نتائج کو بالائے طاق رکھ کر وہ کچھ کر جائے گا جو اُس کے ہم پیالہ بعد اس کے ساتھ کر گئے کہ نوالا تر رہا اور پیالہ سوکھ گیا۔ آئین پیغمبر کے نفاذ کے مطالبہ کو جن جان جوکھوں سے ہم نے بندوں کی حاکمیت کی سجالی کے بلند بام و تیز کام نعروں میں ڈھالا، اگر کش کے عادی نہ ہوتے تو کشتہ سوختہ ہو گئے ہوتے۔ ہمارا اعتدال پسندی کو عنوان تاریخ بناؤ، کہ ہم نے پھرے ہوئے بیوں کے آہ و کرب کے دور میں وہ بین سجائی، کہ پاکستان کی وہ آستین جو بازو کٹ جانے کی وجہ سے فالتو ہو گئی تھی، سانپوں اور سپولیوں سے اٹ گئی۔ ہم نے اس ہوشیاری سے الزام تراشی کہ ہماری معاونت سے محروم دستِ بالا کو حاکم سلام کے الفاظ از سر نو ترتیب دینا پڑے۔ ہم نے زیر زمین عقائد دوزخ

کو افواہوں کے وہ مذموم سہارے دیئے کہ یوسوس فی صدور الناس کے خناس نے بھی ہاتھ کھڑے کر دیئے، کہ روز ازل اگرچہ سجدہ سے انکار کر دیا تھا، تجربہ و مشاہدہ کے زیر نظر ہزار سجدے بھی کہو تو بلا گریز و اکراہ تیار ہوں۔ یا حیٰ کا ورد اگرچہ ناکام رہا، مگر فقط قیوم ہی دونوں طرف اپنا کام دکھا گیا، مگر واٹے! کہ ہم پھر مات کھا گئے۔ سیاست فراست سے پٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہماری بساط ان کے ہاں بچھی تھی اور ہم شاطر کی بجائے مہرہ بن چکے تھے۔ اب کے جو چوٹ ہم پر پڑی ہے، اس سے تو ہمیں بھی احساس ہونے لگا ہے کہ ہم تو بے پایہ سیاست دان ہونے کی بجائے بلند آہنگ ڈنکا ہیں۔ دینی استخصال کی غرض سے ہم نئی تحریک کے لئے جو پٹ کھول رہے تھے، وہ تو الٹے ہم پر ہی کھل گئے اور ہماری سیاسی شرارت چوٹ پڑی نیم بے سدھ سوچ رہی ہے کہ اب کیا کروں۔ جنہیں جھوٹ سے متاثر کر لیا تھا، ان کو کیا منہ دکھاؤں، اور اپنے قد کو کس کی چادر میں چھپاؤں۔ اب سوائے بے نیت مفاہمت اور ریگ ریگ سے سیاست زنگ آلود کواز سر نو چمکانے کے اور کوئی چارہ کار بھی تو باقی نہیں رہا، کہ نظام مصطفیٰ کے سادہ میر روتے روتے سو گئے۔ جو فقط لغزہ کو مقبول عوام جان کر صفوں میں اکھڑے ہوئے تھے، تشقے دکھاتے پھر رہے ہیں کہ لو! ہم نے ترک اسلام کیا۔ کچھ یہ کہہ کر چلتے بنے کہ رات بہت تھکے جاگے، صبح ہو چکی چلتے ہیں، کسی فیڈل ہاؤس میں آرام کریں گے۔ کچھ در بدر ہو گئے اور کچھ دیس بدر۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ایک ہمیں نامور تو ہیں اور پیکار پر آگئے ہیں۔ پکارا جو جی میں آئے کرے۔ مگر پاکستان کے معصوم باسیو! یہ معاہدہ بیع بیعانہ طلب ہے۔ جو پیکار پر معاہدہ کروا رہا ہے، وہ ہوشیار سود خور قرضدار ہے، جو وہی کھاتہ پر قرض محبت کی قینچی ہے، تحریر رکھتا ہے۔ پابندیاں اٹھانے

اور پابندیاں لگانے کا حالیہ عمل اپنی تاریخ کے ان عنوانات کے ابواب کے
 لئے حقائق و نتائج تلاش کرے، مگر جن لوگوں نے تقدسِ ختمِ نبوت کو عملاً محفوظ
 کیا ان کا صلہ کیا ہے۔ اور جو آئین اسلام کے نفاذ کو موخر بنانے کے لئے ایک سیاسی
 حربہ کے طور پر اسے استعمال کرنے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے، ان کا مقدر کیا
 ہوگا۔ عجیب اتفاق ہے کہ جو سازش بیرون ملک اپنے ماخذ قائم کئے ہوئے
 تھی وہ بھی پکڑی گئی اور جو پرکاری اندرون ملک برپا کرنے کے ارادے تھے
 اُسے بھی ”ٹھہری“ لگا کر گرا بھی دیا اور گھومنے پھرنے کی اجازت بھی دے دی۔
 اگرچہ ”ٹھہری“ کافی نہیں تھی، پٹنخی درکار تھی کہ دوستانی ہوتے ہوئے بھی
 چاروں شانے چت گرتی۔ بہر حال پابند آزادی اور سیاست کا لعدم مبارک
 ہو۔ صرف اتنا بتا دیجئے، مجوزہ قومی حکومت میں قیام پاکستان کے
 مخالف سیاست کاروں کی تعداد کتنی ہوگی، اور آئندہ دستور پاکستان
 میں خودکشی کے کتنے نئے طریقے درج کئے جائیں گے۔ سازش ہماری عادت ہے،
 شرارت ہماری فطرت ہے، اور مارشل لا ہماری قسمت ہے کی بنا پر سیاست
 نو کی اجازت مرحمت ہو جائے تو کیا تمام سیاسی و غیر سیاسی وقتی تقاضے
 پورے نہیں ہو جائیں گے۔ کھیلنا مگر کھل کر نہ کھیلنا سیاسی زندگی کا
 طرہ امتیاز سہی، بندر اور ٹوپوں والے کی کہانی غیر سیاسی سہی
 بندر بانٹ تو سیاست کا جزو لاینفک رہی ہے۔ مذاکرات نہ سہی،
 موافقت کے دروازے تو کھلے ہیں۔ تخت یا تختہ امریت ساختہ
 کہاوت ہے۔ جنازہ ہی کی چارپائی سہی۔ بستر کھولئے۔ تکیہ لگائیئے۔
 اور ٹیک اور ہو یا نہ ہو ماٹیک لگائیئے اور اعلان فرما دیجئے کہ ہم
 تخت نشین ہو گئے، جمہوریت بحال ہو گئی لہذا بندوں کی درخواست پر

بندوں پر حکومت کرنا قبول فرماتے اور اعلان اول داغنے ہیں کہ مشتری
ہوشیار باش، ماکہ سیاست نہیں مادر وطن زیر فروخت ہے۔



کچھ ہم سے سنا ہوتا کچھ ہم سے کہا ہوتا

قلب و ذہن، فکر و احساس کے تضاد میں مثل پرندے پر، بال بال جھڑا ہوا، اساس دانش سے بے بہرہ و نابلد معاشرہ مادرِ وطن کے سینے پر مولود بے جان کا بوجھ بنتا جا رہا ہے۔ سیاست بے فراست بوجہ سیاست کاری اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتیں بھی اقتدار کے سہ بازار میں داؤ پر لگا چکی ہے اور خسارے تفریق کرتے کرتے نکتہ دان ہونے کی بجائے نقطہ ساں ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر قومی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی اور جزا کیا ہوتی، کہ نکتہ نابینی در بدر نقطہ دکھاتی پھر رہی ہے مگر کہیں سوئم فاتحہ خواں ہوتا ہے تو کہیں چالیسویں کی چادریں دراز ہو رہی ہوتی ہیں۔ غنچہ ناشگفتہ کو دور سے دکھاتے اور منہ سے کچھ نہ بتاتے ہوئے سیاسی اداکار کوچہ رقیب سے سر کے بل ہو آئے مگر ہر دروازے پر یہی تحریر پایا کہ مغلوبِ خستہ کے بغیر کوئی بھی کام تو بند نہیں۔ ہر سبزہ خط کے درو دیوار پر سبزہ اگ رہا ہے تو کیا ہوا۔ دشت کو دیکھ کر گھر کا یاد آنا کوئی بُری بات تو نہیں۔ چادرو چادریوں کی حفاظت حکومت کے ذمہ آگئی ہو، تو صحرا نوردی میں کیا خطا ہے۔ لوگ تو خطاوار نہ ہونے کی خطا پر بھی پٹ جاتے ہیں، ہم رنگے ہاتھوں پٹ گئے تو کیا ہوا۔ تعمیرِ فکر اس قدر بودی ہو چکی کہ سیاسی

بیانات پڑھو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی رنڈوا پڑوسن بیوہ کو خضاب لگانے کے نوا بجا طریقے بتا رہا ہو، جیسے کوئی داشتہ ضرورت رشتہ کا اشتہار شائع کرنے کے دام دریافت کر رہی ہو۔ میاں مٹھو چوری مانگ رہا ہو۔ جیسے کوئی بلبُل نوحہ کناں ہو کہ طاقِ قفس کھلا رہ گیا ہے، ہر شاخِ گلستان پر اونگھتے ہوئے پرہ دار، کوئی درندہ میرے قفس میں گھس آیا تو پنجرے کا کیا ہوگا۔ جیسے کوئی پاگل ہمتی کو لٹکار رہا ہو کہ تم نے اپنے حواس بجا نہ کئے تو مابدولت تالی بجائیں گے اور ہمارے خواجہ سرا "بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی" گنگناتے ہوئے آئیں گے اور طبل تک تمہارا ہاتھ پہنچنے سے پہلے اپنا طبلہ تمہارے گلے میں ڈال ہمیں تمہاری کرسی پر بٹھا دیں گے۔ قدم قدم جائے ماندن ہوگی اور پادر پارفتن کی گھنگھریاں بجننا شروع ہو جائیں گی۔ تو بے حال ہو کر آئینِ بجال کر دے گا، انتخاب ہوں گے اور آہاجی آہا! اس کے بعد مت ہماری ہوگی اور حکومت تمہاری ہوگی۔ سیاست کا جمعہ بازار لگے گا، دلوں کو پیغامِ فتور یاد آجائے گا۔ ہر پیالی رنگین بطن ہو جائے گی اور چمچے جل ترنگ بجائیں گے۔ اس لئے جان لے، اور آنکھ بند کر کے مان لے کہ وہی فقط ہم" سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں۔ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں، اور اگر تو نے حواس بجا رکھے تو اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔ ہم اسی تنخواہ پر کام کرنا شروع کر دیں گے، جو ہمیں قیامِ پاکستان سے پہلے نیشنلزم کے صنم کدوں سے ملا کرتی تھی۔ ہم لاکھ پاگل جانے جائیں، ہم نے آم کھائے ہیں، گٹھلیاں صنایع نہیں کیں۔ ہر دیوانہ بکار خود ہوشیار ہوتا ہے، سو ہم بھی ہیں۔ دریائے سندھ کا تو پڑاؤ وسیع تھا اور پانی گرا تھا۔ ہم نے مگر مچھ چھوڑے، ڈوب گئے۔ لاکھ آنسو بہائے مگر اس کی سطح بلند نہ ہوئی۔ اب ہم راوی و چناب کو آزمائیں گے۔ ہماری عجم ساز بوتلوں میں جتنے دیوبند ہیں، انہیں ہم بریلی کے بانسوں پر الٹے لٹکا کر در آنے والوں

کے لئے تحریف و تفریق کے وہ ماہرانہ کرتب دکھائیں گے کہ گلی گلی "عش عش" ہوگی اور گھر گھر عطش عطش پکاراٹھے گا۔ ہمیں متفقہ اسلام نہیں چاہیے ہم نے اسلام کا رشتہ مغربی جمہوریت اور سوشلزم سے یونہی نہیں جوڑا تھا۔ ہمیں ماورے تنگ کی طرح تضادات سے تغیر پیدا کرنا مقصود تھا۔ تو ان تضادات کو ختم کرے گا تو ہم اسلام کو اختلاف کی نذر کر دیں گے۔ نہ نظر ہوگی نہ نظریہ رہے گا۔ ہم اس سجدے کے روبرو ہزار کھمبے کھڑے کر دیں گے جو ہزار سجدوں سے نجات دلانے کا دعویٰ ہے اور ہر کھمبے کو وقت قیام آنے پر یوں سجدے میں گرا دیں گے کہ ہر محراب مسجد میں یا کوئی ہلاک جادوئے سامری جلوہ افروز ہو جائے گا یا قاتل شیوہ آزرمی آجسے گا۔ ہر کعبہ دل کے پاس بان کو ذہنی صنم خالوں کے محکمہ اوقاف کا ملازم قرار دے دیا جائے گا۔ ادھر تسبیح کے دانے بکھیر دیئے جائیں، ادھر زنا رپوشوں کو حیا، حیا کہا جائے گا، کہ دیکھو، اعتقادِ مسلمان اور نظریہ پاکستان کی کلیرنس سیل لگی ہے۔ جو شرابی، زانی، سمگلر، وطن دشمن کو اہل الرائے نہیں گردانتا، اُس پر یہودی امداد کے جو دروازے بند ہو جائیں گے، ہم میرے مولا مدینے بلا لو مجھے کی صدا میں لگاتے اُنہی کا رخ کریں گے اور یوں آہستہ کھل جا سم سم پکاریں گے کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوگی کہ ہم نے کیا کہا۔ ہر صہیونی سے سرگوشی میں کہیں گے، غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سنا تم نے۔ کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا۔ تو ہم بتا دیتے کہ لفاذا سلام سے یوں ہراساں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کس کی مجال ہے کہ تمہارے سرمائے اور نظام سرمایہ داری سے جان چھڑا سکے، جب تک تمہارا طریق انتخاب نافذ ہے۔ بس تم فقط یہ مطالبہ کرو کہ انتخاب کراؤ، باقی ہم سنبھال

لیں گے۔ اس کی بھی پروا نہ کرو کہ وہ جماعتی ہوتا ہے یا غیر جماعتی۔ جب تک تمہارے نظامِ سیاست کا لگا یا ہو یا پورا پورا پھل دیتا رہے گا، جو آم بھی ٹپکے گا، ہماری جھولی میں ہی ٹپکے گا۔ جو انتخاب سرمائے کے بل بوتے پر لڑا جائے گا، جو جماعت سازی دام و درم کی محتاج ہوگی، اس کی قلمرو میں فقط قارون کے اونٹ ہی کروٹیں بدلیں گے، فقط فرعون ہی کی خدائی ہوگی۔ ہر صالح لاکھ علیہ السلام ہو، اس کی اونٹنی ذبح نہیں بھی ہوگی تو کوئٹہ ضرور تڑوا بیٹھے گی۔ جب تک اصول عہدہ طلبی اور مرتبت کے لئے دم جوئی کا فرما رہے گی، ہماری اجارہ داری محفوظ ہے۔ بس یہ اہتمام رہے کہ اسلام کا اصول مشاورت و بیعت واضح نہ ہونے پائے۔ مشاورت کے لئے انتخاب ہوتے رہیں، انتخابی امیدواری کو بانجھ پن نہ آئے، پھر بھی کوئی خطرہ نہیں۔ اگر کہیں مشاورت کے ذریعہ انتخاب کا عمل جاری ہو گیا تو ہمارا ہر فرعون غرق ہو جائے گا۔ اگر مشاورت سے یک جہتی و یک سوئی کے ذریعہ اختلاف مٹا کر اصول بیعت رو بہ عمل آ گیا، تو جانو، کسی نے عصائے موسوی پھینک دیا۔ یوں ہوا تو ہمارا ہر سانپ رسی بن کر ہمارے ہی گلے کا پھندہ بنے گا۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب کے ہوتے ہوئے تحریف شدہ قرآن ارسال کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہم جو چلتی پھرتی جیتی جاگتی مسلسل و متواتر تحریف ہیں، پھلنا پھولنا الحاد ہیں۔ جو مال ہو ہم پر لگا، امداد بند نہ کروا۔ ہم سے پوچھ، اس امداد کا صراطِ مستقیم کیا ہے۔ ہم مسجد میں کھڑے ہو کر بھی وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ابولہب سے نہ ہو سکا، ابوجہل نہ کر سکا۔ ہمیں قاضی الحاجات ارسال فرما، ہم تیری فکر کے ایف سولہ ثابت نہ ہوں تو طعن دینا، کہ تم سے تو دلچ اولیں و چادر زھرا

نہ بک سکی۔ میری فکر کو کیا فروخت کرو گے۔ اپنے ہی یہودیوں سے
 سرمایہ داری کے خلاف کمیونسٹ انقلاب برپا کروایا جاسکتا ہے تو
 مسلمانوں سے اسلام کی نفی کیا کوئی مشکل کام ہے۔ مسلمان تو غدار بھی
 ہو تو بھی بڑا قابلِ اعتماد ہوتا ہے۔ تیری فکر تو پھر لگاؤ ہے، اسے عام
 کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ یار لوگوں نے تو بھرے بازار میں بارہا خدا
 کو بھی بیچ ڈالا ہے۔ اور یہ متوسط طبقہ، اس کے دامن میں سوائے توسط
 کے اور ہے ہی کیا۔ اسے تو پڑاؤ کا پل بن جانے کی کت ہے۔ یہ راہرو
 کو پہچاننے کا عادی نہیں، راہبر ماننے کا عادی ہے۔ بس ایک
 اسلامی اصول مشاورت و بیعت کا علاج درکار ہے۔ اسی طرز کا، جو
 تیرے یہودی مفکر نے لیس للانسان الاما سعی اور قتل العفو کا تلاش
 کیا تھا کہ اُخوت و مساوات و حریت کی تمام تعمیری راہوں کو اللہ، اخلاق،
 فرد اور خاندان کی نفی کر کے اُن خونیں انقلابات کی راہوں پر ڈال دیا کہ
 صرف انسانوں کے جسم اور اعضاء کی سعی باقی رہ گئی، انسانوں کی ذات
 ”میںوں لے چلے بابلانے چلے وے“، چلاتی نہ معلوم کن اتھاہ گہرا یوں
 میں گرا دی گئی کہ لاکھ تلاش کرو، ملتی ہی نہیں کہ مٹ جانے کے
 نشان بھی تو مٹاتی چلی گئی۔ مسلمانوں پر انتخاب بر بنائے مشاورت اور
 بعد از مشاورت عمل بیعت کے بنیادی اصول اگر کہیں واضح ہو گئے
 اور یوں اللہ تعالیٰ کے اہل کاروں نے احکامِ خداوندی کے نفاذ کے
 ذریعہ اللہ کی حاکمیت قائم کر کے زمانے کو اسلام کے فکری و قلبی انقلاب
 کی راہِ فکر و عمل سے آگاہ کر دیا۔ تو نہ صرف یہ کہ تیری بساطِ سیاست
 پر کوئی مہرہ باقی نہیں رہے گا، سمرقند و بخارا پر بھی تیری میری

دسترس باقی نہیں رہے گی۔ الحذر کہ کائنات میں صرف انسان ہی
مُنکِرِ الٰہی ہے۔ یہ معتقد ہو گیا، تو ہائے ہم پاکستان میں کہاں رہیں
گے۔۔۔۔!



فقیرانہ آئے صد کر چلے

آزادی انکار کہ ایجاد ابلیس ہے، ما سوا اللہ کے اس کی کوکھ سے کسی اور فکر نے آج تک جنم نہیں لیا۔ متضادم حالات پیدا کرنا اور تضادات سے تغیر برپا کرنا اس کا خاصہ رہا ہے۔ لاتعداد خونیں انقلاب اور فکری زلزلے، تاریخ انسانیت کو اسی قحطی کی جھانجھری کی چھنک نے عطا کئے۔ اس نے جب رقص کیا، تلواریں لہرائیں۔ اس تشنہ لب نے جب پیا، انسانوں ہی کا خون پیا۔ تھرکی تو انسانی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے، لرزی تو انسانوں نے اپنے ہی گوشت میں اپنے دانت پیوست کر لئے۔ اس نے قلم اٹھایا تو ہر ذہن میں رقصِ ابلیس کے لئے چاندنی بچھ گئی، بولی تو انسانی خیالات نے ”کالی تلوار“ پہن لی، تصور اپنا ننگ چھپانے کے لئے ”لحاف“ میں ڈبک گیا۔ غزل میں آئی تو معاشرہ کی ہر ماں بہن، بیٹی نے اپنی تولید و ولایت سے بیزار ہو کر خود کشی کر لی۔ ادب نے ذوقِ رو مانیت میں اس سے یارانہ گانٹھا تو ہر بے حیا و بے غیرت ہیروئن بن بیٹھی، معاشرتی اقدار کا ہر دشمن ”ہیرو“ قرار پایا۔ جس کسی نے احتجاج کی جسارت کی۔ اُس کی پیشانی پر شہوتِ انسانی میں تپاٹے ہوئے قلموں نے ”ویلن“ تحریر کر دیا، یوں کہ منہ چھپاٹے تو چھپاٹے نہ بنے۔ سماج دشمنی دستورِ عاشقاں ٹھہری

اور جن سرچھروں نے معاشرتی، اخلاقی اقدار سے ٹکری، نگاہِ دانش ادب میں وہ عزیز و سرخرو ٹھہرے۔ اطوارِ تخلیقات ادب نے ہر یوسفِ پرطنز کی کہ جو کڑتے تو نے دیدہٴ یعقوب کی بینائی لوٹانے کے لئے اتارا وہ زلیخا کے لئے کیوں نہ اتارا۔ ادب و دانش کا ہر شیر افکن نور جہاں کا ہاتھ دیکھ کر جہانگیر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ شہزادوں نے دھوپوں اور کھارنوں کے در پر بستر بچھا دیئے تو ادب کا زعمِ تخلیق گنگنا اٹھا۔ لغاتِ شبِ وصال اور ظلمتِ شبِ ہجر کے نوے تحریر کرنا اور پھر جوانِ اولاد کا باپ بھی ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جن خیالات کے اظہار کے بعد انسان کا آئینہ رو ہونا دو بھر ہو جانا چاہیئے، نہ معلوم لوگ کیوں کر بہنوں بیٹیوں کے رو برو آجاتے ہیں۔ اگر بیٹا گنگنا نے لگے ”جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں“ بیٹی ”عشق پہ زور نہیں“ کی قائل ہو جائے، والد محترم ”میری جان زار اب چلی بھی آ“ کا مصرع اولیٰ تلاش کر رہے ہوں۔ والدہ محترمہ ”وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سر چھوڑنا ٹھہرا، تو پھر اے سنگِ دل تیرا ہی سنگِ آستان کیوں ہو،“ کے کلیہ کو متاعِ حیات قرار دے رہی ہوں، تو کیا گھر کے صدر دروازہ پر فاؤنٹین ہاؤس تحریر کرنا حکومت کی آئینی ذمہ داری ہوگی یا اس کا رخیر کے لئے مغبوط الحواس کا تب تلاش کرنا ہوں گے۔ جو گالی سر بازار نہیں دی جاسکتی وہ غزل اور عشقیہ نظموں میں قافیہ بند کر دی جاتی ہے۔ اس مد میں دانشوروں نے نظم و نثر میں جتنی دانش تراشی ہے، وہ کسی بھی معاشرہ کسی بھی شریف خاندان کے لئے ناقابلِ قبول بھی ہے، ناقابلِ عمل اور ناقابلِ برداشت بھی۔ جس بات پر تلواریں سونت لینی چاہئیں، ادبی محفلوں میں ان پر سردھنے جاتے ہیں ”ذکر شبِ وصال کیا ہوقصہٴ مختصر“ کی محفیات پر

داد نچھا ور کرنے والے اجدد دہقان نہیں دانشور ہی ہوتے ہیں۔ مذہبی و
 مسلکی تفرقات فاطر العقل لوگوں کی ایجاد نہیں ہیں۔ سیاسی عیاری، مکر و فریب،
 جھوٹ، دروغ گوئی، تشدد، قتل و غارت، فکری و جسمانی استحصال کی روایتیں
 معصوم اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتیوں نے رواج نہیں دیں۔ دینِ الہی کے موجد
 دربار اکبری کے دانشور نہیں تھے تو اور کون تھا۔ میکاوی سادہ لوح بڑھی
 نہیں تھا، دانشور تھا۔ چانکیہ بکریاں نہیں چرایا کرتا تھا اور نہ مارکس نے
 بھینسیں پال رکھی تھیں۔ یہ سب انسانی دانش گاہوں کی پیداوار تھے۔ اگر
 دانش لادین اور عقلِ مصلحت بین ہی برپا رہتی اور اطاعتِ الہی اور عشقِ
 رسولؐ کا فرمانہ ہوتا تو مسلمہ کذاب کے خلاف جہادِ خلافِ شرعِ حقوق
 انسان قرار پا گیا ہوتا اور نظریہ جہادِ نبوی سبیل اللہ کو کالعدم قرار دینے کے
 لئے مسلمانوں نے ہی سیکورٹی کونسل کا اجلاس طلب کر لیا ہوتا۔ اس لئے اگر ہم
 دانشوروں نے آئینی تقاضے پورے کرتے ہوئے کسی قانون کے نفاذ کی تعریف و
 ثنا سے انکار کر دیا ہے تو یہ کوئی اتنی بڑی لغزش نہیں ہے کہ بے دلی کا باعث
 ہو۔ ہم مصلحت بینوں نے ایسا تحریفِ حبِ رسولؐ کے لئے نہیں کیا محض اظہار
 بغض کا دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ آج کے دانشمند تو دین و سیاست
 کے اختلاط و متزاج سے فکر کو ترویج دے رہے ہیں۔ ہم دانشوروں نے
 تو پاکستان میں بنیادی حقوق کے تعطل اور آئین در آئین کی منسوخی پر بھی
 بارہا ماشاء اللہ، سبحان اللہ اور لبیک کہا ہے۔ ہماری موجودہ خطا پر نہ
 حیرت بجا ہے، نہ تاسف۔ ہم دانشور ہیں، عشاق نہیں۔ عقل اگر مصلحت
 اندیش نہ ہو تو اس کا مقام مفکرِ پاکستان کی نظر میں نا پختہ ہوتا ہے اور عشق
 اگر مصلحت میں ہو تو خام قرار پاتا ہے۔ بہتر ہے کہ پختگی عشق اور نا پختگی عقل

میں الجھنے اور اظہارِ ناپسندیدگی و ناراضی کئے بغیر فیصلہ تاریخ کے سپرد کر دیا جائے اور ہم دانشوروں کی تحریر و تقریر پر سرد ڈھنٹے میں کمی نہ کی جائے ورنہ دانش و ادب زنگ آلود ہو جائیں گے۔ دانش کو زنگ آلودگی سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے جنس آلود و مصلحت آمیز رکھنا ضروری ہی ہوگا، اسی لئے تو زمانہ قدیم و جدید میں اسی اسلوب کو روا رکھا گیا اور پھر اگر کوئی ”میکڈے کے موڑ پر رکتی ہوئی“ مدتوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا“ کہہ کر معذرت کر لے تو قبول کر لینا چاہیے کہ ابن الوقتی جنگ کرنے کی نہیں خریدنے کی چیز ہوتی ہے۔ وہ معاشرہ جس کی عبادت گاہوں تک میں دانش فروخت ہو رہی ہو جس طرف نگاہ اٹھائیں دانش کا جمعہ بازار جما ہو، وہاں کے سیاسی سلیزمین اگر دانش کی کلیرنس سیل شروع کر دیں تو کوئی بین الاقوامی گالی دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی فریب سرزد ہو جائے گا تو گاہک خود ہی نیٹ لیں گے۔ اگر شرعِ قرآن پر رسہ کشی کی جاسکتی ہے، وحدتِ ملتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے والے برداشت کئے جاسکتے ہیں۔ شرح آیات کی دکانیں کھولی جاسکتی ہیں، سرکاری زکوٰۃ سے فرقہ بندی کی پرورش کی جاسکتی ہے تو مصلحت بینی کا مول کیوں نہیں لگایا جاتا۔ خبر بک سکتی ہے تو علم کیوں خریدنا نہ جائے۔ دانش ذہنِ انسان کا ضمیر نہیں ہوتا۔ یہ کوئی سر بستہ راز نہیں ہے کہ بستوں میں ضمیر نہیں ہوتا اور نہ آج تک کسی نے ضمیر کو بستوں میں رکھا ہے۔ پیغمبروں کے مخاطب اگر انسانی ذہن ہوتے، قلوب نہ ہوتے تو مفکرِ پاکستان ”میرے مولا مجھے صاحب جنوں کر“ نہ پکارا ٹھٹھے۔ کاذب اور حقیقی پیغمبروں کی پہچان اگر انسانی اذہان کے سپرد کر دی جاتی تو ابوجہل، ابولہب کو یوں دانشور تسلیم کر لیا جاتا کہ تاریخِ حشر تک کراہتی اور بلبلائی رہتی۔ دوزخ

کا جغرافیہ کرہ ارض تک وسیع ہو گیا ہوتا اور ہر سربراہ حکومت نے دعویٰ
 نبوت بھی کر لیا ہوتا۔ کوئی باعث تو ہو گا کہ جب کبھی انسان ساختہ دانش کا
 واسطہ پیغمبروں سے آپڑے تو دانش انسان بدنام ہو جاتی ہے۔ باطل
 ہوتی ہوگی! کوئی بات تو ہے کہ جس زمانہ نے پیغمبروں کی تعلیم سے انحراف کیا
 زمانہ جہالت کہلوایا۔ فقیر کو اصرار ہے کہ اس کی ناخواندہ ماں کی تربیت کے
 فیض سے اُس کا ذہن منافقت، تعصب، کدورت اور خصومت آلودگی
 سے پاک رہا۔ جناب صدر مملکت سے مجھے اختلاف بھی ہے، گلہ بھی،
 اور شکوہ بھی۔ مگر مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ تقدس رسول^{۱۲}
 اکرم^{۱۳} کی غرض سے حالیہ قانون نافذ کر کے انہوں نے ایک صالح عمل کیا
 اور ایک عظیم سازش کو جو برپا ہو اسی چاہتی تھی۔ عمل سرکوبی سے آگاہ
 بھی کیا۔ دراصل تحریک کی حرکت پکڑی گئی اس لئے کچھ افراد پر نشان ہیں
 کہ اب کسی کو قادیانی قرار دے کر عوام کو کس طرح گمراہ کریں گے۔ شکوہ فقیر
 کو یہ ہے کہ اب تک ایٹنی تضادات ختم کیوں نہیں کئے گئے۔ مغربی جمہوریت
 کی نفی کے اعلان کے باوجود اسلام کے نظام مشاورت کے اصولوں پر انتخابی
 قوانین کیوں نافذ نہیں ہو رہے۔ ان قوانین کے نفاذ کے بغیر انتخابی منشور
 پر عمل کیوں کر ممکن ہوگا۔ اگر مروجہ انتخابی قوانین کا عدم قرار نہ دیئے گئے
 اور مشاورتی انتخاب نہ ہوا تو عقل آتشِ نمرود بھڑکا دے گی اور عشق
 لبِ بامِ محو تماشا ہی رہے گا۔ ملک سیکولرزم، سرمایہ دارانہ پیشہ و سیاست
 اور خاندانی اجارہ داریوں کا باڑہ بازار بن کر رہ جائے گا۔ گرم پانی کی لہریں
 سر اٹھا اٹھا کر دیکھیں گی اور حیران ہوں گی کہ خدا کے ہوتے ہوئے ہمارے
 سینے پر یہ نئے نا خدا کیوں کر مسلط ہو گئے کہ خدا سے بھی مطالبہ کرتے ہیں

کہ تسلیم کیجئے ” خدا نہیں ہے“ اگر مغربی جمہوری نظام کے تحت انتخاب کروا کے سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کا تماشا ہی مقصود ہے، اگر روشن چہرے کو اس کے چنگیز سے تاریک تر اندرون سے قطع نظر ”غنیہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں“ ارشاد فرماتا ہے تو پھر اسلام کا اتنا ذکر نہ فرمایا جائے کہ لوگوں کو اس سے آشنائی ہو جائے اور شرع پیغمبر آشکارا ہونے لگے۔ اس لئے کہ یوں قلب و ذہن کا تضاد اور بڑھے گا اور سیاست غزل آلود ہو جائے گی۔ سیاست غزل گو ہو جائے تو فراست کو لوگ یوں دفن کرتے ہیں جیسے زمانہ جہالت میں بنام غیرت زندہ بیٹیوں کو زمین میں گاڑ دیتے تھے اور ”گر نہیں وصل تو وحشت ہی سہی“ دستورِ زمانہ ہو جایا کرتا ہے۔ مائیں نہ مائیں خوشی آپ کی، ہم تو فقیرانہ آئے صدا کر چلے۔



رُکوا کہ یہ چال قیمت کی چال ہے

پاکستان کی سیاست و قیادت اتنی پرپیچ ہو چکی ہے کہ سورۃ ”والناس“ کی پناہ گاہوں میں چھپ جانے کے چارہ سازوں کو بھی کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ہم مزید تضادات خود ساختہ میں الجھ گئے ہیں۔ عکسری اہلیت کہ فوری صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت اس کی بنیاد ہوتی ہے، سُرخ فیتوں میں لپٹ گئی ہے اور سیاست کہ بالغ نظر طویل غور و فکر اس کا اثاثہ ہوتا ہے، ہنگامہ پسند اور احتجاج نواز ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ چھ سال کی متواتر احتیاط، مسلسل غور و فکر اور مشاورت کے بعد ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کا سورج نہ صرف بے گمن طلوع نہ ہونکا بلکہ بادل چھٹ جانے کی بجائے اور گرے ہو گئے۔ اعادہ حقوق جمہوریت کے عوامی تقاضا کا جواب یہ ملا، کہ باوجود ہزار احتیاط ضابطہ تولید اور کاہینہ، مجلس شوریٰ، اسلامی مشاورتی کونسل، دستور کمیشن اور سپریم کونسل کی ماہرانہ نگرانی کے، محترمہ امید سے پائی گئی ہے۔ سفر واپسی خالی از خطر نہیں لہذا ۱۹۸۵ء تک صعوبت، ہجر حقوق سے سوکھا ہوا لیلیٰ جمہوریت کا ہر مخبوں اپنا ڈھانچہ دیکھتا رہے۔ اور پیش کردہ ڈھانچے کے خدو خال پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ کسی ڈھانچے کے خدو خال نہیں ہوتے، غور کرتا رہے۔ اگر کوئی اُسے چھونے، پھیرنے یا اس کی عفت میں خلل ڈالنے کی کوشش کرے گا تو نتائج کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ عکسری سیاست

کی قوت فیصلہ کی یہ سُسست کاری افسوس ناک بھی ہے اور تشویش ناک بھی ۔
 اگرچہ اسے سمجھ سے بالاتر نہیں کیا جاسکتا ۔ یہ عمل اصلاً عسکری ہے ہی نہیں ۔ یہ عرض
 اقتدار کو غلط پیمانے سے طول کی طرف سے ناپے اور گنتی میں عمداً غلطی کرنے کی
 کاوش ہے ۔ تاکہ قیمت خرید سے بھی کم جو قیمت فروخت خریدار کو بتا بیٹھے اس کا
 ازالہ خریدار کو یہ کہہ کر کیا جائے کہ ہمارے پاس جس طول و عرض کی دستار میسر ہے وہ آپ
 کے ناپ کے لئے بہت کم ہے ۔ دستار اقتدار تو مثل جام جم ہوتی ہے ۔ کوئی جام
 سفال تو نہیں کہ اور لے آئے بازار سے جو ٹوٹ گیا ۔ لہذا نیا مال آنے تک
 ”انتظار فرمائیے“ اگرچہ اذان مغرب ہو چکی ، آپ روزے سے بھی ہیں ، افطاری
 بھی فرما چکے مگر نماز تراویح بھی تو لازم ہے اور پھر رات کے اندھیرے میں
 انتقال اقتدار کبھی صالح عمل نہیں رہا ۔ اس میں تو انتقال کا خطرہ ہوتا ہے ۔ لہذا
 عاشقی صبر طلب ہے ، متمنا بے تاب ہی سہی مگر زلف کے سر پہونے کا انتظار
 فرمائیے ۔ غالب نے تو شراب کے نشے میں یہ کہہ دیا ہوگا کہ اس وقت تک
 کون جئے گا ”خون جگر ہونے تک دل کا کیا حال کروں“ ، بھی کوئی مشورہ طلب
 بات ہے ۔ وہی کیجئے جو جگر کے ساتھ ہوا ۔ آپ خواہ مخواہ چیں بچیں ہوئے ۔
 ۱۹۷۳ کے آئین کو کس کا فرنے پھیرا ہے ۔ بالکل وہی ہے ۔ ضعضو تعطل ،
 آپریشن برائے ترمیم اور چھٹے ضمن کی خرابی ہاضمہ کی وجہ سے ڈھانچہ سا رہ گیا
 ہے تو غم نہ کیجئے ۔ صدر کے اختیارات بڑھا کر اور سپر دستوری کونسل بنا کر
 لاغری کا علاج بھی کر دیا گیا ہے ۔ یہ جو کچھ ہوا تھا ۔ چودھری فضل الہی کی بددعا
 کا نتیجہ تھا ۔ اب ہماری نیک نیتی لاریب ہے ۔ قرارداد مقاصد اور خواتین
 کو رو بہ اسلام کرنے کے عمل کو موثر کر کے سیاسی لادینی منافقت کی مہم ناکہ
 کا فازہ اتار دیا گیا ہے ۔ ڈھانچہ مکمل ہے ، صرف امر ربی نفع نہیں ہو سکا

کہ یہ کارِ خداوندی ہے، بندوں کے بس کا روگ نہیں۔ پھر اس میں امرِ ربی داخل ہو گیا تو ہم آپ کہاں جائیں گے۔ ڈھانچہ دیکھتے ہی یہ آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں کہ یہ خون بہائے گا، فساد پھیلانے گا۔ ان کی پروا نہ کرو۔ یہ پرانے لغزے لگانے والے نادانستگی کا شکار ہیں۔ ہمارے فرشتے ہمارے حکم سے اس کے روبرو سجدہ سجالاتیں گے اور یوں ۱۹۸۵ء میں خلافتِ ارضی کا قیام عمل میں آجائے گا۔ پھر اگر کوئی دسوسہ کا شکار ہو گا تو یوں ارض سے آسمان پر پہنچا دیا جائے گا جیسے آدم و حوا آسمان سے زمین پر اتارے گئے تھے۔ بحالیِ جمہوریت کے لئے ہمیں مجبور کرنے والے یہ تو سوچیں کہ مجبور ہو کر تو یہی کچھ کیا جاسکتا ہے۔ بہ رضا و رغبت کوئی بات ہوتی تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ اگرچہ بہ رضا و رغبت یہاں جمہوریت کو خود بھی بحال ہونے کی عادت نہیں۔ جمہوریت کی جمہور کشی نہ ہوتی تو بھی شاید صورت حال مختلف ہوتی۔ دعویٰ دائر کر کے صلح کرنے اور باہمی اتمام و تفہیم سے معاملات طے کرنے میں کچھ فرق تو ہونا ہی ہے، یہ صورت حال سمجھ سے بالاتر اس لئے نہیں کہ اختیارِ سنگین اگر سوچے گا تو دانش کا لاشہ ضرور ترپے گا۔ ”دارمی شود“ کا عمل اگر نہ دہرایا جائے تو حقیقت تو یہی ہے کہ حاصلِ گردشِ شب و روز یہی رہا کہ پہلے سات سال محنت کش خراب کئے گئے، مابعد سرمایہ دار بحال ہو گئے۔ عزیزان مہر نے خواب تو دیکھے، کسی یوسف نے تعبیر نہ بتائی، عوام ذہنی سکون اور قلبی اطمینان سے محروم ہی رہے۔ حکومت کے ذمہ مشینوں کی ہی نہیں انسانوں کی نگہداشت بھی ہوتی ہے۔ آج کا انسان بالخصوص دانشور متوسط طبقہ جس چکی میں پس رہا ہے، اس کے پاٹ نہ اتارے گئے تو لوگ اپنے نکاح نامے پھاڑ ڈالیں گے اور پیدائش کی پرچیاں ثبوتِ ولادت نہیں رہیں گی۔ تاسف تو یہ ہے کہ بے قصور عوام کے زخم بھرنے تک چارہ سازوں کے ناخن بڑھ جاتے ہیں۔ اور جوان مارشل لا کی دھمکیاں ملنا

شروع ہو جاتی ہیں۔

سیاست ہے کہ شروع سوا س کی طرح یوں عمل میں لائی جا رہی ہے کہ کچھ لوگ وہ کتبے اٹھائے ہوئے ہیں جو صرف قوموں کی سالمیت و احترام کی قبروں پر نصب کئے جا سکتے ہیں۔ رجسٹرڈ، ان رجسٹرڈ، دائیں بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں، مذہبی، مسلکی، بے مسلک، روس نواز، امریکہ پرست جماعتیں، بے ضابطہ رابطہ جماعتیں، بیرونی جماعتیں، ہیروئین جماعتیں، مزاحیہ سربراہیاں۔ اس تمام صورتحال کو ایک ہی ڈرامہ میں سمودینے کا کام اگر انڈین ٹیکسیٹر آغا حشر مرحوم کے سپرد بھی ہوتا تو ان کا بھی حشر ہو گیا ہوتا۔ ان کے لئے بھی فضائیں پکار اٹھتیں، تم کیا سمجھے کہ یوم الدین کس کو کہتے ہیں۔ نشہ، قوت خطرناک ہوتا ہے مگر حرص اقتدار جو آج کی سیاست کا پیدائشی نام ہے، اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ ”آخر اقتدار کس کے سپرد کیا جائے“ سیاسی سوچ نہیں۔ جلال الدین اکبر اعظم متفکر تھے کہ ولی عہد کس کو مقرر کروں۔ اس قسم کا ذوق عالمگیری شاہ جہانی دیدے پھوڑ دیا کرتا ہے۔ وقت کے دھاروں کو روکنے یا ان دھاروں میں بہہ نکلنے کو نہیں، اپنی ذات کی نفی کر کے ان دھاروں کو پڑھ لینے کی صلاحیت کو سیاست کہتے ہیں۔ چوکیدار کا گھر کے صدر دروازے کے سامنے خندق کھودنا تاکہ گھر والے باہر نہ نکل سکیں، اتنا ہی خطرناک غیر سیاسی عمل ہے، جتنا کسی خزانہ پر پرہ دینے والے کی نیت کا خراب ہو جانا۔ راہ زن نہیں راہ تما کی سوچ سیاست کی بنیادی اساس ہو تو کارواں منزل آشنا ہوا کرتے ہیں۔ چالباز سیاست کے لیبل صرف وہ لوگ لگایا کرتے جو شاہراہوں پر گداگروں کا روپ دھارے ”واللہ کے نام پر کچھ دے جاؤ بابا!“ کی صدا صرف اس لئے لگاتے ہیں کہ مغلوب الجذبات مسافر جیب میں ہاتھ ڈالے تو اس کے پاس اثاثہ کا اندازہ ہو سکے۔ سیاست دانوں کا سپیروں کے انداز

اپنا لینا کہ جب پٹاری کھولیں، سانپ ہی نکلے، کسی خاص مجمع کے لئے دلچسپ ہو
 سکتا ہے، مطلق خدا کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔ کیا خبر پٹاری کھلی رہ جائے اور سانپ
 بھاگ نکلے۔ کامیاب اور لاجواب بیرونی سیاسی دورے ہر محب وطن کے لئے قابل
 فخر ہوتے ہیں۔ مگر رعب اختیار سے اگر رعایا کو ہذیان اور مرگی کے دورے پڑنے
 لگیں اور بے اختیار اس کا علاج یہ تجویز کرنے لگیں کہ اس سے نعرہ لگواؤ اور گرفتار
 کروا کر اندر بھیجو تو یہ طعنہ تو ملے گا ہی کہ زیر حراست سیاسی وکلاء کو پندرہ سو روپیہ
 اور موکلین کو پانچ صد ماہانہ معاوضہ دیا جا رہا ہے۔ کرائے کے سپاہی تو سُننے ہی
 تھے اور ان کے کارنامے بھی دیکھے تھے، یہ کرائے کے قیدی دیکھنا بھی ہمارے
 ہی مقدر میں تھا۔ جملہ معترضہ ہی سہی مگر بلا خوف تردید و بلا ضرورت تائید عرض
 ہے کہ قیدیوں کے خاندانوں کی کفالت اسلامی حکومت کے فرائض کا اہم حصہ ہے۔
 اور شاید تحریک مخالف کو بے جان کرنے کا یہ سیاسی طریقہ بھی ہو۔ گستاخی معافی
 کی مستحق ہے کہ زمانہ فرائض کا احساس دلانے کا نہ ہوتے ہوئے بھی یہ بات قلم کی
 گرفت میں آگئی۔ اس لئے نہیں کہ گرفتاریوں کا اثر ہے، اس لئے کہ ہم نے سیاست
 کے دیوبلی کیمپ دیکھے ہیں اور ”تاریوں“ کے دلالی کیمپ بھی، سیاست کی دیوالی
 بھی دیکھی ہے اور حرصِ اقتدار کا دسہرہ بھی۔ انتظارِ عید میں روزے بھی رکھے ہیں اور
 رضائے الہی میں قربانیاں بھی دی ہیں۔ زلفِ سیاست کے خم و پیچ سنوارے بھی
 ہیں اور بال بکھرائے سیاسی سیاپے بھی دیکھے ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں
 کو سیاسی جماعتوں کا صدر بنتے بھی دیکھا ہے اور ایئر مارشلوں کے پیراشوٹ
 سیاسی میدانوں میں بھی اترتے دیکھے ہیں۔ غیر سیاسی سنگلاخ زمینوں سے بھوٹے
 ہوئے سیاست دانوں کو سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹریٹے ہوئے دیکھتے رہنے کے
 بھی ہم ہی گنہ گار ہیں۔ اختیار کُلی سے بے اختیار تعاون کرتے ہوئے قلی بھی

دیکھے ہیں اور اول احتساب کی سرخیاں بھی پڑھی ہیں۔ تحریک پاکستان کو سازش
 قرار دینے والوں کی بیمار آنکھوں کا علاج ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری
 سے نظام مصطفیٰ کے متلاشی سیاسی فوجیوں سے بھی تعارف ہے۔ ہم نے احمقوں
 کی جنت بھی دیکھی ہے اور دانشوروں کا دوزخ بھی۔ طالب علموں کو مسلح کرنے
 والے بھی دیکھے ہیں اور آوارہ کرنے والے بھی۔ یہ زمانہ بھی ہمارے مقدر نے
 ہی دیکھنا تھا کہ جراثیم پیشہ طالب علموں سے دریافت کریں، اچھی ٹین گن کو لنسے
 یونیورسٹی ہوسٹل میں ملے گی۔ آئندہ نسل کے معاملات میں انتظامیہ کی بے بسی
 اور سیاست دانوں کی یہ سیاست بھی ہمارا ہی مقدر تھی کہ ہرنوزاٹیدہ کے کان
 میں اذان دینے کی بجائے ”معصوم جانیں مردہ باد“ اور ”گرگان کہن زندہ باد“
 کے نعرے لگائے جائیں ”ظالمو جواب دو، خون کا حساب دو“ گنگنا کر پالنے
 ہلائے جائیں۔۔۔ خبر آتی ہے کہ مٹھی بھر شرپسند عناصر تشدد آمیزیاں کر رہے ہیں
 مگر ہم مٹھی نہیں کھولیں گے۔ ان کی سرکوبی ہوگی، پھر ان سے بات ہوگی۔ نہ،
 نہ، نہ، صاحبِ صدر نہ، سرکارِ خم بڑا برا ہوتا ہے۔ سرکوب ہو گئے تو کیا
 ڈھانچوں سے گفتگو فرمائیے گا۔ ہو سکتا ہے، صرف ڈھانچوں ہی سے بات کرنا
 دانش سیاست ہو، ہم نے نو سیاسی آسیبوں سے باتیں ہوتی بھی دیکھی ہیں۔
 آپ اپنی چھڑی روک لیں۔ جو کل سیاست دانوں نے روارکھا تھا، وہ آج آپ روار
 نہ رکھیں۔ اگرچہ پردہ سیاست میں غارت گری و آدم کشی صدیوں سے روار ہی
 ہے اور رہے گی بھی۔ کیونکہ انسان جب تک انسانوں پر حاکم ہے، یہ حاکمیت
 انسانی کے مسلمہ اجزائے لاینفک ہیں، الٹ انگ ہیں مگر چہ حاکمیت انسانی کا
 درس یہی ہے کہ عروس سیاست لاکھ کے کہ میرا الٹ انگ ٹوٹ رہا ہے، اسے
 ادائے محبوب ہی گردانا جائے اور مزید شدت کا اختیار کی جائے۔ پاکستان

کے لئے بہترین سیاسی منصوبہ بندی یہی ہے کہ اسے بانجھ کر دیا جائے۔ اقتدار کی منتقلی کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ یوں تو اقتدار کا انتقال ہو جائے گا۔ لوگوں کے اصل مسائل کیا ہیں، ان کا ذکر نہ کیا جائے۔ قومی مسائل پر چادر ڈال کر جنازہ گاہ کی چاردیواری میں رکھ دیا جائے اور عوام کو ڈھانچے پر غور کرنے کا مشورہ دیا جائے۔ غور کیا تو معلوم ہوا کہ نہ یہ ڈھانچہ ہے نہ فریم ورک، فقط ایک خطوط وحدانی ہے جس میں ”بہ نوک فارمی رقصم“ کی عبارت پر اپنے کسی غیر ماہر صادقین سے ”سیاست مردہ باد“ یوں لکھا لیا گیا ہے کہ بین الحروف کے تمام فاصلے غیر متواتر ہیں۔ اس تضادِ فکر و سیاست کا آخر حل کیا ہے فلسفہ ہائے پیچ پیچ یا عوامی مسائل کی نشاندہی، قومی مسائل کا ادراک یا صرف قومی کی ادکاری، تشدد یا مخلصانہ غور و فکر۔ سپر طاقتوں کے مفادات کا تحفظ یا اپنے اندر کے سپرین کی پاسداری۔ سیاست و اقتدار کا ٹکراؤ یا بے لوث افہام و تفہیم۔ محمد علی کی مکہ بازی یا محمد علی جناح کی سیاسی دانش، تضادات میں مزید اضافہ یا یک سوئی۔ یہ ملت بیضا جو آج تک غرباء کے دم سے زندہ رہی، سرمایہ داروں کی یہ جادوگری کب تک دیکھتی رہے گی۔ کیا ۱۹۸۵ء میں زرعی زمین پر کاشتکار کا اسلامی حق تسلیم کر لیا جائے گا۔ کارخانے کے مزدوروں کو صنعت کار تسلیم کر کے نفع و نقصان میں انہیں برابر کا شریک مان لیا جائے گا۔ کیا آئین میں یہ ضمنی درج ہو جائے گا کہ ہر شہری پیدائشی طور پر ایک سا مکرم ہے۔ عزت نفس کی حفاظت اور کفالت حکومت کا فرض قرار پائے گی، سیاست پر سرمایہ دار کی اجارہ داری ختم کر دی جائے گی۔ سیاسی خاندانی گٹھ جوڑ کی جس بندر بانٹ کی وجہ سے انسان صرف ایک کی طرف دیکھتی بلتیاں بن گئے ہیں، باقی نہ رہے گا۔ ناجائز ذرائع سے کمایا ہوا اور بیرون ملک جمع شدہ سرمایہ قومی خزانہ کی ملک قرار پائے گا۔

مراعاتی زمینیں، پلاٹ، بنکے، کاریں، سفارشی قرضے واپس لئے جائیں گے۔
 جہاد و مجاہد کی صحیح توضیحات و ترجیحات واضح ہو جائیں گی، شہریوں اور سرحدی
 محافظوں کے محبت و عزت و توقیر کے رشتے بحال و استوار ہو جائیں گے۔ صلاحتوں
 کو بروئے کار لانے کی راہ میں ناکارہ افراد کی سفارشی سدا راہ نہیں بنیں گی۔
 انسانوں کو فقط ان کی اہلیت کے مطابق معاشرہ میں مقام مل جائے گا۔ حکم
 صادر ہو جائے گا کہ لوگ حکومت کے غیر اسلامی احکامات کی اطاعت سے آزاد
 ہیں۔ حکومت خالق کے احکامات کی سب سے زیادہ پابند ہے۔ حاکم کے اعمال
 کا حساب مانگو تو دیا جائے گا۔ خالق کی عہدیت کے علاوہ تمام سرچشمتے بند کر دیئے
 جائیں گے۔ صوبائی، لسانی، نسلی رقابتیں ختم ہو جائیں گی۔ یا ۱۹۸۵ء میں صرف موجودہ
 اقتدار کے لئے بے خطر ایک سیاسی انتخاب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو پھر موت کا منتظر
 رہنا کہیں بہتر ہے کہ خرابی دنیا کے باوجود عاقبت تو سنور جائے گی۔ ۱۹۸۵ء
 میں کیا ہر انسان کے وسائل اتنے ہو جائیں گے کہ وہ پھلوں کی دکان کے
 سامنے سے ترستا ہوا نہ گزر جائے۔ باپ عیدین پر معصوم بچوں کو اپنے
 تصور کے جوڑوں میں سجاد بیکھ سکیں گے۔ غریب کی بچی بھی گڑیا سے کھیل سکے
 گی۔ افرادی قوت بنام ترقی بطرز غلامی فروخت نہیں ہوگی۔ مفلسوں کی
 عزت کے دام بہ اندازہ ذوق سرمایہ داری تو نہیں لگیں گے۔ یا ہم یہی سنتے
 رہیں گے کہ خود اختیار جلا وطنی بغرض گرفتاری حاضر آگئی ہے۔ کیا خبر کہ لائی گئی
 ہے۔ ۱۹۸۵ء میں انتقال اقتدار ہوگا یا انتقال فساد یا انتقال ملت کیا واقعی زندگی
 جو گھٹ کر جوئے کم آب رہ گئی ہے، بحر بکیراں بن جائے گی۔

صاحبان اقتدار اور سیاستدانوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ آج گدھوں
 تک کو پیٹ بھر کر خوراک میسر نہیں۔ اس لئے سیاست دان ازراہ کرم اپنے

اپنے سیاسی منشور کو پڑھیں۔ یہ سب ترمیم طلب ہیں، ضمیر طلب بھی ہیں۔ حکومت مجوزہ ڈھانچہ پر خود غور کرے اس کے خدو خال مندرجہ بالا معروضات کی روشنی میں قائم کرے۔ صرف اپنے زاویہ قائمہ پر ہی نگاہ نہ رکھے۔۔۔۔۔

سیاست دانوں کو فکری حفاظت میں لے کر حفاظتی حراست صحیح عمل نہیں تھا۔ نہ کوئی تخت نشین رہے، نہ کوئی پایہ تخت کھینچے۔ پھر اکٹھے مل بیٹھیں۔ لیکن گول میز کانفرنس کے لئے نہیں کہ ایسی تجویزیں صرف چٹ پٹے چٹخارے ہی دے سکتے ہیں۔ اپنے ساتھ ملک کے واقعی دانشور اصحاب کو بھی بٹھائیں۔ فریقین کھل کر اپنا ما فی الضمیر بیان کریں، دانشور غور و فکر کریں۔ سیاسی منزل متعین ہو مگر معروضات بالاک کی روشنی میں۔ اس منزل کے لئے لائحہ عمل مرتب ہو۔ فریقین اپنا اپنا کام سنبھالیں۔ فوج بھی، سیاست دان بھی، دانشور بھی اور افراد قوم بھی۔ خلوص نیت کار فرما رہے تو صرف ہفتہ دو ہفتہ کی کاوش درکار ہے۔

ورنہ رُو کو! کہ روزِ ازل نہ آئے گا پھر کبھی۔ رُو کو! کہ یہ چال

قیامت کی چال ہے۔



شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

اگرچہ نیا سیاسی ڈھانچہ، جو بعد مشکل اب کہیں کہیں نیا خاکہ کھلوانے لگا ہے، عطا ہو چکا۔ بلدیاتی انتخابات کے لئے تازہ کبوتر چھوڑے جا چکے۔ باوجودیکہ نئے سیاسی اتحاد میں فکری و عملی تضادات موجود ہیں۔ باوجود الزام علیہان کی اذانِ استغاثہ کے، باوجود رئیس سیاست دانوں کی فرداً فرداً عدالتِ قلب و چشم و دیگر اعضائے رئیسہ و غیر رئیسہ اور ان اعضا کے جو انسانوں کے ہوتے ہی نہیں، و مثلاً ایک بذلہ سنج سیاست دان کہہ رہے تھے، میں دم کے معائنہ کے لئے بیرون ملک جا رہا ہوں، باوجودیکہ سیاست گیسٹ روم میں زیرِ گلوکز ہے۔ اخبار نویس سرہانے کھڑے ہیں کہ مرلیضانِ اقتدار کچھ بڑ بڑائیں تو شفقِ سیاست پر اپنی سرخی جمادیں۔ دانشور و کلاں گائے پیٹھے ہیں کہ شاید کوئی وصیت ہو جائے۔۔۔۔ ڈاکٹر کوئی موجود نہیں، کہ ان کے علم و دانش کے مطابق جسے اقتدار نے دبا لیا ہو، اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔۔۔۔ اسے صرف قومی گناہوں کی معافی مانگنا چاہئے۔۔۔۔ دریکے کے روزنوں سے سرکاری ملازم جھانک رہے ہیں کہ طبیعت سنبھلے تو سیاسی ”وگین ٹیکس“ کا مطالبہ کریں، فکرِ سیاست کی زکوٰۃ وضع کریں۔ کارکنوں کی تعداد کا حساب لگا کر عشرت طلب کریں، جو اگرچہ

تشکیل مجلس شوریٰ کے وقت وصول کر لیا گیا تھا۔ مگر پھر واجب الوصول ہو گیا ہے۔ اگرچہ سیاسی گھروں اور سرکاری استراحت گاہوں کو ایمر جنسی وارد قرار دے دیا گیا ہے اور ہر نوکی ملاقات پر پابندی لگا دی گئی ہے ”سرکاری کارندوں کا انہیں سب جیل قرار دینا سرکاری دشمنی ہے۔ کیونکہ اس سے سرکاری عزت کا پہلو نکلتا ہے لہذا ترمیم فرمائی جائے“ دو تین سیاسی جماعتوں اور کئی ایک خودروسماجی جماعتوں نیز احتیاطی تخم ریزی سے نشوونما پائی ہوئی تحریکوں کو جیلے بہانے شعبہ حادثات میں داخل کر کے مشوروں اور ہدایتوں کی معمولی مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے۔ جو ہر الا اللہ کو اللہ کہہ دینے کی عالمی سازش کا شکار ہو کر لارنس آف پاکستان کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہاتھوں میں کنگھی صاف کرنے کا نوایجاد آلہ لئے کھڑے ہیں کہ شاہی دیندار کی گھن دار و رنگ دار سیاست کا کوئی موٹے متبار کہ اٹک کر رہ گیا ہو تو معاف کر دیں کہ اب یہ کنگھی شاڈ گنجے سروں پر استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ تاہم منتقلی اقتدار کے لئے ہنگامہ اور مہم جوئی شروع ہو چکی۔ داویلا چونکہ ابھی دھیمی سروں میں ہے، کہیں ڈھول نہیں بجا، ڈھمکے سے ہی کام لیا جا رہا ہے اس لئے بگل بجانے میں فی الحال احتیاطی تاخیر ہی مناسب قرار دی گئی ہے۔ سیاست جو کبھی حفاظتی حراست میں تھی، اب حراستی حفاظت میں ہے۔ قابل فروخت سیاست کی شاہراہ کے ایک کنارے ”ہمیں نہیں رہنا ہے، مگر ہم جانے والے نہیں ہیں“ اور دوسری طرف ”ہمیں نہیں آنے ہے، مگر ہم چل پڑے ہیں“ کے نوٹس بورڈ ایٹا دہ ہیں۔ ایک طرف ”۱۹۷۳ کا بلا ترمیم آئین“ لکھا ہے دوسری طرف ”صدر آن است کہ ہر جانشینہ صدر است“ کی ضرب المثال تحریر ہے۔ ادھر سے آواز آتی ہے ”ترمیم لازم ہے“ دوسری طرف سے شور اٹھتا ہے ”ترمیم غیر ضروری ہے“ ادھر تقاضا تھا ”توج

کا کردار چہ معنی دارد، جواب آیا ”سپر کانسٹیٹیوشنل جانتے ہو کیا ہوتا ہے“
 کہ یہ اصطلاح تو تمہارے ۱۹۷۷ء کے بین الیاسی مذاکرہ کی دریافت ہے جو
 اس لئے اپنا نا ضروری ہے کہ ماہرین نفسیات سیاست کی رائے میں سابقہ
 جنون کا پھر عود کر آنا بعید از امکان نہیں ہے۔۔۔۔۔ اگر سیاسی متحارب
 نمائندے آئین میں کسی سپر ادارہ کو داخل کرنے پر رضامند ہو سکتے ہیں تو پھر
 اقتدار بے اختلاف آئین میں ترمیم کیوں نہ کرے۔۔۔۔۔ یہ مطالبہ فوج کا نہیں
 تھا کہ انتخابات فوج کی نگرانی میں ہوں۔۔۔۔۔ یہ کسی فوجی نے نہیں کہا تھا،
 کہ آئین سے بھی فوق تر کوئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے، الیکشن کمیشن نا کارہ و
 بے معنی ہو چکا ہے۔ معاملات لاکھ آئینی ہیں مگر سپر آئینی طریقوں سے طے
 ہوں گے۔۔۔۔۔ یہ سیاست دانوں کا اعتراف شکست تھا کہ آئینی ذرائع
 ہماری عادتوں کا، ہماری مغربی جمہوریت کا، ہماری حرص اقتدار کا، ہماری سیاسی
 اخلاقی لپستیوں کا، ہماری کارستانیوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں
 سے پہلے آئین کے انتخابات سے متعلق ضمانت کو نا کارہ کیا۔ پھر مغربی جمہوری
 تقاضے تسلیم کروانے کے لئے فسطائی اور سوشلزم و کمیونزم کے انقلابی طریقے
 اختیار کئے۔ ہم نے از خود نظام مصطفیٰ کو ثانوی قرار دے کر سیاست اسلام
 کے اصولوں کی نفی کی۔ ہم نے تشدد، بد کرداری، ظلم، بے راہ روی و فحاشی
 کے خلاف نظام اسلام کے نام پر ہم چلا کر ماؤں کی آنکھوں سے وہ دیدے
 نکال لئے جن میں نوجوان، خوبرو، شریف، خدا پرست، عاشقانِ رسولؐ
 کے مسکراتے چہرے بسے رہتے تھے۔ ہم ان بھائیوں کو قتل گا ہوں میں لے
 آئے جن کی غیرت پر ان کی بہنوں کی حیا ناز کرتی تھی۔ حبِ رسولؐ میں گریبان
 چاک، سنگینوں کے سامنے سینہ تاننے والے، بے نام راہوں پر خاک و خون میں

لت ہو گئے۔ خون کے آنسو روتی ہوئی ان ماؤں، سینہ کو بی کرتی ہوئی ان برہنہ سر بہنوں نے جنہوں نے اپنے دوپٹے پھاڑ کر بھائیوں کے زخموں پر باندھ رکھے تھے۔ باپ جن کی ریڑھ کی ہڈیاں سیٹیوں کے غم میں آنا فنا دوسری ہو گئی تھیں، بھائی جو بے بازو ہو کر رہ گئے تھے، بچے جو جوان ابو کے کھلونے لے کر آنے کا انتظار کرتے کرتے روتے ہوئے سو گئے تھے، سہاگنیں جو آخر شب تک مدھم دینے جلائے چوکھٹوں سے لگی بیٹھی تھیں، یہ جان کر کہ جہاد فی سبیل اللہ کے مترادف نفاذ نظام مصطفیٰ کی تحریک کو نہایت ہوشیاری سے فقط بحالی مغربی جمہوریت کی تحریک میں تبدیل کر دیا گیا ہے، اس میں کمیونزم کے مارو، جلاؤ، فنا کر دو کے طور طریقے استعمال ہونا شروع ہو گئے ہیں، چولہوں میں پانی ڈال کر بھسکی ہوئی راکھ نکل لی، کہ صرف اپنے اقتدار کے بھوکو! اب نہ چولے میں آگ جلے گی نہ سینے سے کوئی لٹو اٹھے گی۔ نفاذ نظام مصطفیٰ کی پیش کش کو رد کر کے جہاد فی سبیل اللہ کے سیاسی علمبردار مغربی جمہوریت کی لگائی ہوئی ان سبیلوں پر اپنی پیاس بجھانے میں لگ گئے ہیں جن کے گلاس زنجیروں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ اتنا اعتبار بھی باقی نہ رہ گیا تھا کہ یہ گلاس نہیں چرائیں گے۔ مثال قائم ہو چکی تھی کہ یہ تو اور بھی بہت کچھ چرا لیتے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے بھی مغربی جمہوریت کا فکری منتظم سرمایہ دار پانی پلا دیتا ہے، گلاس کا اعتبار نہیں کرتا۔۔۔۔۔ سیاسی نقاہت اور اقبالی مجرم صنمیری نے چھ سال نکال دیئے۔۔۔۔۔ مجوزہ اور موعودہ انتخابات کے التوا کے الزام کا کوئی معتبر جواب آج تک میسر نہ آسکا۔۔۔۔۔ تاریخ یوں ہے کہ ۱۹۴۷ء میں نظام لا الہ الا اللہ کے لئے پاکستان آنے والی ہر شاہراہ کو اپنے عزیزوں کی لاشوں سے اٹا دینے والی قوم کو ۸ ۱/۲ سال تک بے آئین رکھ کر ۱۹۵۶ء کا پور و کرپٹ دستوری عمل

وارد کیا گیا، جس نے محمد علی جناحؒ اور چودھری محمد علی میں، یعنی سیاست و
 بیوروکریسی میں فرق واضح کر دیا۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ سیاست دان گورنر جنرل
 ہو کر بھی کتنا بے لوث عظیم ہو سکتا ہے اور بیوروکریٹ صدر ہو کر بھی کتنا حریص
 ہونا رہتا ہے۔۔۔۔۔ ۱۹۵۸ء آیا تو سائنٹیفک اسلام، کنفیڈریشن، جوائنٹ
 ڈیفنس کے فلسفوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں اور آواز اٹھوا دی گئی کہ
 اصل سیاست تو یہ جانتا ہے کہ لفظ پاکستان کے چھ لفظے ہوتے ہیں۔ لہذا
 چھ لکات ہی ذریعہ نجات ہیں۔ پوری سیاست ہی نکتہ دان ہونے کی بجائے
 نقطہ بین ہو گئی اور ملک اندھے سیاست دانوں کی درس گاہ بن کر رہ گیا۔
 ۱۹۶۲ء کا صدارتی نظام جمہوریت کی بنیادوں میں ان لوگوں سے پانی ڈلوانے
 لگا جن کے مشکیزے اخلاقی قدروں نے خون ناحق سے بھرے ہوئے تھے۔
 اس نظام نے بائیس خاندانوں کی ہر اس کھیتی کی آب یاری کی جس کی روزی
 وہ عوام کے لئے حرام قرار دیتے تھے۔ ہر خرافت نے احتجاج شروع کر دیا
 کہ کتاب سیاست صرف مجھ پر ہی لادنے کی چیز ہے۔۔۔۔۔ آج کے کتنے سیاستدان
 اس نظام کے محافظ اور مددگار اور کارندے تھے، اس کی نشاندہی کی ضرورت
 نہیں۔ یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ سب سیاسی عیوب جیت گئے اور مادرِ ملت
 نہیں۔ قائد اعظمؒ کی بہن، تمہیں! فاطمہ ہار گئیں۔ جو لوگ کمینگی کی حد تک اس
 بے لوث ماں کی تذلیل کا باعث بنے، وہ سرفراز بھی ہوئے، وزیر بھی بنے اور
 وزیر اعظم بھی، ہیں بھی، اور شاید ہوں گے بھی۔ پھر ۱۹۷۳ء کا سول چیف
 مارشل لائی صدارتی عبوری نظام آیا۔۔۔۔۔ اور تب کہیں ۱۹۷۳ء کا وہ آئین
 نافذ ہوا جس کے حقوق اللہ سے غیر متعلق مجسم سیکولر عوامی بنیادی حقوق
 سے متعلق تمام ضمانت بھی تالیخ رضائے انتظامی سربراہ حکومتِ وقت

رکھے گئے۔۔۔۔۔ اگر کوئی تردید کر سکتا ہو تو کرے۔ اس آئین کی عملداری میں کروائے گئے انتخابات میں جو دھاندلی و لاقانونیت روا رکھی گئی، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت کے مقتدر پارلیمنٹ میں اتنی اکثریت حاصل کرنا چاہتے تھے کہ آئین میں ترمیم کروا کر اسے صدارتی نظام کا آئین بنا دیا جائے۔۔۔۔۔ اس کی بھی اگر کوئی تردید کر سکتا ہے تو کرے اور اس کی وجہ بھی بتائے کہ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں مختلف جماعتوں کے صرف سربراہ ہی کیوں کامیاب ہوئے۔ ماسوا محدودے چند کے باقی امیدوار کیوں ناکام رہے۔ حالانکہ اصل دھاندلی تو ان سربراہوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں ہونا چاہیے تھی۔ جبکہ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کا کوئی ایک حلقہ انتخاب بھی نہ تھا۔ دھاندلی ہوئی اور بے مثال ہوئی، مگر غیر سربراہی حلقوں میں۔ اس لئے نہیں کہ اصل مخالفین کو اس وقت کے مقتدر اسمبلیوں میں نہ پا کر اُداس ہو جاتے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ سودا بازی بھی ۱۹۷۳ء کے آئین کو صدارتی آئین بنانے کے لئے تھی کہ صدارتی آئین میں حزب اختلاف کو موج میلہ کرنے کے جو مواقع ہوتے ہیں، وہ پارلیمانی و حدانی یا وفاقی نظام میں میسر نہیں ہوتے۔ واضح رہے کہ بے آئینی نظام میں کانوں کے ٹھیکے اور سرمایہ دارانہ اجارہ داریاں حاصل کرنے کو موج میلہ نہیں کہتے۔ سیاسی موج میلے بڑے پُر فضا ہوتے ہیں۔ ناچتی گھومتی کرسیاں اور مترنم میزیں بڑی دلکش ہوتی ہیں۔ انسان کے گھنٹی بجانے پر اسی وضع قطع کا دوسرا انسان فرشتی سلام کرتا سامنے آکھڑا ہو تو انسانی جسم میں جو خدا نمودار ہوتا ہے وہ اسے متذکرہ قسم کی سودا بازی و خیال آرائی پر لگا دیتا ہے۔ عوام الناس نے اسلام کے دلدادہ ہونے کا مظاہرہ کیا، سیاست دانوں نے مغربی جمہوری

صدارتی نظام کے لئے سودا بازی کی ۔۔۔۔۔ اب جو اعلان ہوا کہ ہر دو حاضر کرتے ہیں تو ہم جوٹی و محاذ آرائی آسن باندھے آہستہ آہستہ پاؤں تھرکا رہی ہے۔ تاکہ سیاست دانی کا ثبوت مہیا ہوتا رہے۔۔۔۔۔ ایک شیر جنگلی تالاب کے کنارے پانی پینے لگا۔ بیری کے ایک درخت پر گلہری دیکھ رہی تھی۔ اس نے بیری پانی میں پھینکا۔ پانی میں جنبش پیدا ہو کر لہریں پھیلیں تو شیر نے اوپر دیکھا اور پھر پانی پینے لگا۔ گلہری نے پھر وہی حرکت کی۔ شیر نے پھر دیکھا۔ گلہری اپنا عمل دہراتی رہی۔ شیر ان وقفوں کے باوجود سیر ہو کر چل دیا۔ ایک دوسری گلہری نے جو شیر کو جنگل کا بادشاہ تسلیم کرتی تھی۔ پوچھا! اس شرارت سے تمہیں کیا حاصل ہوا۔ شیر کا کیا بگڑا۔ گلہری بولی ”ڈیک لگا کر تو نہیں پی سکا!“ تم کیا جانو اسے ہی سیاست کہتے ہیں۔ آج کا سیاسی ارتعاش اگرچہ بظاہر ایسا ہی عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن دراصل نوے دن میں وعدہ پورا کرنے کے اعلان میں ۲۱۳۹ دن کی تاخیر، اسلام کے نظام کو بتدریج نافذ کرنے کا بے اثر و بے نتیجہ عمل، اسلام کو صرف سزاؤں کے قوانین تک محدود رکھنا اور قانونی حق و باطل کی آمیزش، عادی سیاست دانوں کی نشہ سیاست سے طویل محرومی اور سیاسی گداگری، ناروا پابندیاں، اسلام کے متعین کردہ بنیادی اصولوں سے قطعی انحراف، اسلامی اقتصادی، معیشتی اور معاشرتی نظام کی زمانہ ملوکیت کی توضیحات و تشریحات کو اپنانا، ”جنریشن گیپ“ کو کم کرنے کی بجائے مرد و زن تک میں تفادتِ فکری کا پیدا کیا جانا، عوام کے اصل مسائل سے آنکھیں بند کر کے باوسیلہ لوگوں کے مفادات کو یہودی عینک سے دیکھنا، ہر دفعہ بغیر شیشہ کی دور بین استعمال کرنا، اس کی بنیادی وجوہات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے اور ایسا بے مثل نظام تخلیق قائم کیا ہے کہ ہر ماں کے تصور کا بچہ اشرف المخلوقات

ہی ہوتا ہے۔ کوئی ماں گھٹیا یا چھوٹا آدمی جننے کا کبھی تصور بھی نہیں کرتی، وہ ہمیشہ مثالی بچہ جنتی ہے۔ ہم اُسے وہ بناتے ہیں جو ما بعد بن جاتا ہے۔ ہر باپ اپنے بیٹے کو اپنے سے بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہے، ہم اُسے مایوس کرتے ہیں۔ فطرت ہر انسان میں اپنی تجدیدی قدرت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہر انسان میں ایک نیا موجد خلق ہوتا ہے۔ ہم اُسے مثبت تجدید کی طرف راغب نہیں کریں گے تو وہ منفی تجدید کرے گا۔ جو خرابیاں ہم اپنے معاشرہ کے انسانوں میں پاتے ہیں، وہ دراصل اس نظام کی خرابیاں ہیں جو ہم برپا کرتے ہیں۔ ہم سزائی محکم ہیں، اصلاحی حاکم نہیں۔ اور تاریخ اقتدار کے عرصے ناپ کر فیصلے کرتی تو عمر بن عبدالعزیز کا نام اتنے احترام کے ساتھ تاریخ اسلام میں درج نہ ہوتا، محمد بن قاسم کو عمر کے لحاظ سے ووٹ دینے کا نا اہل قرار دے کر تاریخ نے اس کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے ہوتے۔ شیر شاہ سوری طویل منلیہ دور کے باوجود بھی منفرد حیثیت کا مالک نہ ہوتا۔ قائد اعظم کی اتنی مختصر حکومتی سربراہی کو لوگ آج تک یاد نہ کرتے ہوتے اور عشرہ منانے والے گمنامی کی غاروں میں دھکیلے نہ جا چکے ہوتے۔ اگر ہر ماں کو اس کے تصور کا اشرف المخلوقات بچہ میسر نہ آیا، ہر باپ کے سامنے اس سے بہتر بیٹا سچ دھج کر کھڑا نہ ہو، تو تحریکیں چلیں گی، چلتی رہیں گی۔ کوئی مثبت تحریک کبھی مکمل طور پر ناکام نہیں ہوا کرتی۔ جو کام ۱۸۵۷ء میں نہ ہو سکے، وہ ۱۹۴۷ء میں ہو جایا کرتا ہے۔ آرنلڈ، گوٹے، لٹلے ہار جایا کرتے ہیں اور اقبال جیت جایا کرتا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید کیا جاسکتا ہے مگر محمد علی جناح کو قید ہونے بغیر نئی اسلامی مملکت کو وجود میں لانے سے نہیں روکا جاسکتا، چاہے لیڈی مونٹ بیٹن ڈیانا سے بھی زیادہ حسین ہو اور نہرو کتنا ہی حُسن پرست حسین کیوں نہ ہو۔ اس لئے تحریک چلانے والے اور تحریک

چلوانے والے اصل مسائل کو سمجھیں اور ان کے حل کی طرف متوجہ ہوں۔ منفی
 رویہ اختیار نہ کریں، اثبات کو اپنائیں ورنہ ہر دو طرف اشخاص ہی بدلیں گے،
 حالات نہیں بدلیں گے۔ کیا حکومت و سیاست کے کوئی باہمی فرائض نہیں ہوتے؟
 مفکر پاکستان اگر آج زندہ ہوتے تو دریافت کرتے کہ سیاست سے دین جدا
 ہو جائے تو تسلیم کہ چنگیزی رہ جاتی ہے، لیکن سیاست سے حکومت کو جدا کر
 دیا جائے تو کیا باقی رہے گا۔ اور سیاست و حکومت میں ٹھن جائے تو ایوان
 عام پر آپ کا کون سا شعر لکھا جائے اور دیوان خاص میں در آنے والے کے
 رو برو خودی بلند کرنے کی پاداش میں سزا کھاتے وقت مرد مومن کو کراہنا چاہیے
 یا نہیں۔ حکومت بے سیاست اور سیاست بے حکومت کی مشترکہ ذمہ داری
 ہے کہ انسان کی تکریم بحال کریں۔ بے وسیلہ افراد کو اول درجے کا شہری تسلیم
 کریں۔ محنت و سرمایہ میں فطری رشتے قائم کریں۔ ہر انسان کا مقام اس کی
 اہلیتوں کی بنا پر متعین کریں۔ انسان کو انسان کے تسلط سے آزاد کریں۔ جانیں
 کہ متوسط طبقہ معاشرہ کا ذہن ہی نہیں، شہ رگ بھی ہوتا ہے۔ معاشرہ کو اس
 کی سیاست نہیں، معصومیت لوٹا دیں۔ چالاک یا شرارت کو دانش نہیں کہا
 جاتا۔ اہتمام کریں کہ اپنے خالق کے سوا انسان کسی اور کا دست نگر نہ رہے۔
 پھیلے ہوئے انسانی ہاتھ اللہ کی رزاقیت کے لئے طعن ہیں۔ دین کو ملوکیت،
 آمریت اور سلطانی کی عطا کردہ منافقت و جہالت و تحریف سے آزاد کروائیں
 عوام کو اگر ملاوٹ، منگائی، رشوت، چور بازاری، عدم تحفظ، بے انصافی،
 تشدد اور سزاؤں کے مگر مچھوں کے کھلے دہانوں میں دھکیل دیا جائے تو ان
 کے مردہ جسموں پر جھپٹنے کے لئے جنگلوں سے درندے اور فضاؤں سے گرگس
 اتر آیا کرتے ہیں۔ فرصت کے لمحات میں گرگسوں کو بلند مینار اور اونچے

کلس بہت پسند ہوتے ہیں۔ جو معاشرہ اپنے شاہینوں کو بے پردے پر کر دے وہ
 کرگسوں کی من مانیوں کا شکار تو ہو گا ہی۔ اگر فریقین اقتدار عمیق گہرائیوں
 میں نہ بھی جھانکیں، پس پردہ حسینوں کو بے پردہ نہ بھی کریں اور فقط یہ حساب
 لگائیں کہ صرف پولیس کے اہل کاروں کی زبان زدِ عام بددیانتی، قانون شکنی
 اور فرعونیت کی وجہ سے کتنے معصوم گھرانوں کی عزت لٹی، مستقبل تباہ ہوا۔
 کتنی چادریں داغ دار ہوئیں، کتنی سفید پگڑیاں ان کے پاؤں تلے روندی گئیں اور
 جب کبھی پولیس آفسر "ماخوذ" ہوئے تو مدعیان و گواہان و وارثان کے آنسوؤں
 دھلے ضمیر بالآخر کیوں کر تل گئے، تو پاکستان کا ہر سابق حکمران آج تاریخ کے
 سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جائے گا کہ میرا نام "وجہ حقوق محفوظ ہیں" والی سطر
 میں بھی نہ لکھنا۔ جس معاشرہ میں بے سود کتابوں کے جملہ حقوق تو محفوظ ہوں
 مگر انسانوں کا ایک بھی حق محفوظ نہ ہو، اس معاشرے میں دنیا بھر کے راج الوقت
 آئین بھی نافذ کر دیئے جائیں تو زندہ نہیں رہے گا۔ خدا خود گواہی دیتا ہے
 کہ ایسے معاشرے زندہ نہیں رکھے جاسکتے۔ مثبت روی اور خالق کائنات
 کی نیابت کے سوا انسانیت کے ان زخموں کا درماں کسی اور انسانی نظام
 حکومت میں موجود نہیں۔ خواجگی مسکرات ڈھالتی رہتی ہے۔ جہانگیروں
 کے ہاتھ میں جام سچا رہتا ہے۔ نور جہانوں کا دید بیضا پیٹھ تھپکتا رہتا ہے اور
 انصاف ہوتا رہتا ہے۔ اللہ اور رسول کی نیابت و خلافت کے اصول
 دیباچوں میں نہیں، دل و نگاہ و دماغ میں سجانے سے بات بنتی ہے۔۔۔۔۔
 حاکم اور رعایا سب اسی دھرتی کے وسائل کے مرہون احسان ہیں۔ ہر دو
 کی پیدائش و مرگ ایک ہی ہستی کے اختیار میں ہے۔۔۔۔۔ دونوں کے
 مفادات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کو اٹھا کر

بحیرہ عرب میں نہیں پھینک سکتا۔ کوئی معاشرہ دوامی اختلافات و محاذ آرائی و
 حرصِ اقتدار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ”ندا و لُھا“ کائنات کا بنیادی اصول ہے،
 یہی کائناتی تحریک ہے۔ اجسام پر حکومت حاصل نہ بھی ہو تو دلوں پر حکومت
 کی جاسکتی ہے۔ اس مملکت خدا داد میں یہ کیا کیا نظام نافذ کرتے آئے ہو، کہ
 ہر سچے جو ”بادشاہ“ ہوتا ہے، بالغ ہونے تک مجرم و بے حکم بن کر رہ جاتا ہے۔
 گزشتہ ۳۶ برسوں میں ان گنت اہلیتوں کے خزانے لئے ہوئے لوگوں
 کو اس ملک کے سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے بے نام و گم نام مرتے دیکھا
 ہے۔ متوسط طبقہ کے افلاک پر کتنے آفتاب سرمایہ داروں کے پھیلائے ہوئے
 اندھیروں نے نظر نہ آنے دیئے۔ کتنے محبانِ وطن سرمایہ دار سیاست کے
 گٹھ جوڑ کی مکروہ سازشوں کا شکار ہو گئے۔ انسانی توقیر، تکریم، اخلاص
 حب الوطنی اور بالغ نظری پر کن کن کمیں گاہوں سے تیر چلے.....
 پیشتر اس کے کہ خدا اپنے انتظام سے ان حقائق کو واضح کر دے اور آج
 کی منور نثرارتوں کی وجہ سے معاشرہ کسی مثالی عتاب کا شکار ہو جائے،
 دانشورو! فریقین کو باور کراؤ کہ جن راہوں پر تم چل نکلے ہو یہ کسی آبادی
 کی طرف نہیں جاتیں، اندازِ فکر و عمل بدلو اور اس وقت سے ڈرو جب
 لوگ چلا اٹھیں ”ہمیں فریقین میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں“



جناب صدرا شرج صد درکار ہے

انقلاب انتخابات کے وعدہ کو دو مرتبہ طلاق کے بعد تیسرے وعدہ کی قطعی تاریخ وفا مقرر کئے بغیر یہ اقرار بار بار دہرایا جا رہا ہے کہ مارچ ۱۹۸۵ تک جملہ انتخابی مراحل طے کر لئے جائیں گے۔ ایک ذیلی وعدہ یہ بھی ہے کہ ہو سکتا ہے ایک بڑا انتخاب اسی سال میں وارد ہو جائے۔ اس وعدہ کی ساخت میں دھمکی زیادہ ہے اور وعدہ کم۔ یہ بھی نشر ہو چکا کہ طرز انتخاب اسلامی ہو گا۔ مگر ان اعلانات کے مافی الضمیر میں اس قسم کی لغزش کی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ اقتدار بھی منتقل ہو جائے گا۔ لہذا جملہ حریصان اقتدار، وطن باقیماندہ کے سیاسی بسیار کار، منفعت ملت کے متفی نویس، امریکی سیکٹے، فرنگی مہرے، روسی بساٹیے، سرمایہ مجتمع کرنے، غنڈے اکٹھا کرنے، اسلحہ کا انتظام کرنے، جعلی ووٹ بنوانے، نئی دھاندلیاں ایجاد کرنے اور سادہ لوح عوام کو احمقوں کی نئی جنت میں بسانے کی تدابیر سوچنے سے پہلے جان لیں کہ حالات و رفتار کے پیش نظر موجودہ مدت میں ان کی ذہنی ریاستوں پر شاید ایسا انتخابی حملہ تو ہو جائے جس میں انتخابات شکست کھا جائیں۔ لیکن انکے تصور کے انتخابات اولاً تو ہزار نیک نیتی، کاوش و کشمکش کے باوجود ہوں گے ہی نہیں۔ اس لئے کہ اگرچہ بروا بھی ہونا ہے، پات بھی چکنے ہیں مگر حالات کی نیت مثبت نہیں۔ بین الاقوامی سیاست کا اندر پوف ”جہان آں“ میں ہے اور ”جہان این“ میں ریگن ریگن رہا ہے۔ نہ معلوم سرخ

سویرے کے سفید ہاتھی کب چنگھاڑنے لگیں، سفید رچھ بلوچستان کی طرف پیٹھ کئے
اٹے پاؤں چلنے لگے کہ لو واپس جا رہا ہوں۔ انتخابات اگر سرزد ہو بھی گئے تو اقتدار
منتقل نہیں ہوگا۔ انتخابات ایٹاٹے زکوٰۃ اقتدار کے لئے کروائے جائیں گے، عطائے
اقتدار کے لئے نہیں۔ انتخابات کا جو خواب سیاسی اذہان کے خلا میں ڈیرے ڈالے
ہوئے ہے، نہ صرف یہ کہ شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا، تعبیر پر شرمندہ بھی ہوگا۔ ہو سکتا
ہے کسی خاص قسم کے انتخابات سے نئی پرانی آسامیاں پر کمر لی جائیں۔ ایوان اقتدار
کی بند و بالا دیواروں کے سائے تلے سیاسی استراحت میسر آجائے۔ مور پنکھ ہلانے
پر مامور کر لیا جائے۔ قطاروں میں کھڑے ہو کر دید آمد و رخت بالانشین کے نظارے
کو وادیے جائیں، تدبیر کو سر بہرا اور فکر کو مفلوج کر کے قلمدان وزارت کو دیکھتے
رہنے کی اجازت مل جائے۔ لیکن اگر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ تمنا کہیں گوشہ
نشین ہے کہ وہ اقتدار نشین تو کجا، قدر نشین بھی ہو سکتا ہے تو چراغ گل کر
لے اور چٹخنی چڑھا لے کہ عاقبت اسی میں ہے۔ ورنہ ہر سیاسی جواری اپنے
خانہ کار کو کسی نہ کسی شبنجون کی زد میں پائے گا۔ آج کے سیاست دان کوئی یوسفان
وقت نہیں کہ آج قید خانے میں ہیں تو کل خزانوں پر مامور کر دیئے جائیں گے۔
یوسف^۳ یعقوب^۴ جلائے تھے، یہ عقب سائے ہیں، وقت عصر کے مسافر ہیں۔
مخملوں کے متمنی ہوں گے مگر وقت مغرب آئے گا اور سراؤں میں قیام پر مجبور ہو
جائیں گے۔ جو یہ بھی نہ جان سکے کہ بندوں کی فطرت میں اقتدار لینا ہوتا ہے، اقتدار
دینا نہیں ہوتا، بندے اقتدار بانٹا نہیں کرتے گنوا دیا کرتے ہیں، میدان سیاست
کا نہیں صحرائے قباحت کا پیا سا شہہ سوار ہوتا ہے۔ ہر شہہ سوار کی عقل اتنا دھوکہ
تو بہر حال کھا ہی جاتی ہے کہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ شاہ پر
سوار ہوں۔ جو بندوں سے خدائی صفات کے طلبگار ہوتے ہیں، بندوں کو خدا مان

لینے پر مجبور ہو جایا کرتے ہیں۔ سیاسی فکر اگر فقر سے عاری ہو جائے تو انسان فقط وہ عمر و عیار بن کر رہ جاتا ہے جس کی زینیل گم ہو گئی ہو۔ لہذا موجودہ انتخابات کی ساحری آج کی سیاست کو موخر و کالعدم قرار دے دینے کا موجب ہوگی جس کو دکان بڑھانا ہو بروقت بڑھالے۔ یہ دعویٰ کہ انتخابات اسلامی ہوں گے اور آئندہ حکومت کی تشکیل اسلامی بنیادوں پر ہوگی، اگر انتہائی نیک نیتی پر بھی مبنی ہے تو جان کی اماں مانگے بغیر گزارش ہے کہ مسلمان ہونا اتنا آسان بھی نہیں۔ بالخصوص جب کہ چاروں طرف تاریک پر پھیلائے ہوئے فرزند ان عجم اپنے فکری پیشواؤں کو یقین دلائے ہوئے ہیں کہ ہم اسلام کا نظام حکومت، آئین قرآن و شرع پیغمبر^ص واضح ہی نہیں ہونے دیں گے۔ جب تک ہم ہیں اسلام کو مغربی مکتب فکر کی چٹائیوں پر دوڑا نو بٹھائے رکھیں گے۔ تفصیل کی باریکیوں کی نشان دہی کئے بغیر بھی اگر عرض کیا جائے کہ از روئے نظم اسلام سربراہ انتظام مملکت کا بلا واسطہ منتخب ہونا لازم ہے تو کیا انکار ممکن ہوگا۔ اور پھر یہ کہ اسلام میں سب سے پہلا انتخاب تو سربراہ کا ہوتا ہے۔ جس کی اولین شرط یہ ہے کہ جو عہدہ کا طالب ہو، اُسے عہدہ نہ دیا جائے۔ عہدہ کے حریصوں اور طلبکاروں کو صدائے عام دینا، نامزدگیاں طلب کرنا، اس کے لئے ہم جوئی کروانا، انتخابی مہم کے لئے وقت دینا، وسائل و مواقع مہیا کرنا، ماسوا سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کے ہر کسی پر تمام دروازے عملاً بند کر دینا۔ اے فقہانِ شرع نو اور مشیرانِ سیاست تازہ، ہمیں بھی تو بتاؤ کون سی آیت قرآن اور حدیث رسول مقبول^ص میں درج ہے۔ یہ راز عمیق کون سی فقہ کی دریافت ہے، تاریخِ سیاستِ اسلام کے کون سے باب میں اس کا تذکرہ ہے۔ دانشِ افرنگ کے یہ متحرک اسلامی غلاف پوش جو نہایت پرکاری سے ہر ذہنی خلوص کی قوتِ ایمان کے روبرو شمعِ عجم روشن کئے تخلیقاتِ یہود و نصاریٰ

کے منظوم عربی ترجمہ کو لغت حجاز قرار دے کر طبلہ یہود کی تال پر تانیں اٹھانے میں ماہر ہیں، نہ معلوم کیوں آدھکتے ہیں اور کس کے اشارے پر ان کی کوکھ سے برآمد شدہ نت نئی الحادی تاویلات اجتہاد کے جھولنے میں چلانے کے لئے لٹادی جاتی ہیں، کہ مادر وطن تلاش درماں میں حکما کی مشاورت سے ہی فارغ نہیں ہو پاتی۔ ہر چند کہ خدا ان کو خوب سمجھ رہا ہے اور بالآخر ان سے بھی سمجھنے والا ہے، پھر بھی نہ معلوم انہیں کیوں خوف نہیں آتا اور کیوں واضح نہیں کر دیتے کہ اسلام میں سربراہ کا انتخاب ہی امر اول ہے جسے باہمی مشاورت سے طے کرنا ہوتا ہے اور مشاورت تبادلاً خیالات، مافی الضمیر کے دیانت دارانہ اظہار، بے رشک و بے حسد بے رقابت رائے دہی اور پابندی احکام قرآن، نیز بالآخر متفق و یک رائے ہو جانے کے عہد کے بغیر نہ تمیری ہوتی ہے نہ اپنے مقاصد حاصل کر سکتی ہے۔ تسلیم کہ اسلام میں حق رائے دہی یونیورسل ہے۔ ہر انسان پیدا الٹھی طور پر مکرم، باشعور اور اہل رائے پیدا کیا گیا ہے لیکن اولاً تو یہ واضح فرمائیے کہ از روئے اسلام شعور اور رائے کا سرچشمہ انسانی دماغ ہے یا قلب۔ اور دوم یہ کہ جو شخص اعمال بد سے اپنے شعور کو اپنے ہاتھوں قتل کر چکا ہو، کیا اسے بھی اہل رائے کہیں گے۔ جو خود اپنی حفاظت نہ کر سکا، کیا معاشرہ کا محافظ منتخب کرنے کا حق اُسے تفویض کیا جاسکتا ہے۔ شادی کا اہل ہو جانا اور اہل رائے ہو جانا کیا ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ جسے اتنا بھی شعور نہیں کہ جنسی تسکین کے لئے معاشرتی اجازت لازم ہے، کیا وہ بھی اہل رائے ہی ہے۔ جو اپنی عقل کے بوجھ تلے اتنا دب گیا کہ شعور سے فرار حاصل کرنے کے لئے شراب پینے لگا، ذہن کو خمار زدہ رکھنے کا عادی ہو گیا، کیا اُسے بھی اہل رائے ہی قرار دیں گے۔ جو اللہ کے رازق ہونے سے مایوس ہو کر چور ہونے کی حد تک قنوطی ہو گیا، وہ بھی بالغ الرائے

ہے۔ جو ارتداد کا مرتکب ہوا، اُسے بھی اہل رائے ہی کہیں گے۔ اچھائی کا دشمن اور برائی کا ساتھی ہے، کما وہ بھی اہل رائے ہے۔ جو معروف کانکر اور منکر کا معتقد ہے، کیا اس کے شعور کو بھی زندہ تسلیم کر لیا جائے۔ جو یہ بھول گیا کہ اس زیاں خانے میں حالیہ زندگی آخروی زندگی کے انعامات کے لئے اس کا امتحان ہے، جو نزول قرآن کے باوجود اقرار رسالت محمد مصطفیٰ اور اس کی تصدیق بالقلب سے گریزاں رہا کیا وہ بھی اہل رائے ہے۔ اس سے بھی دریافت کرنا ضروری ہے کہ سربراہ نظام مملکت اسلام کون ہونا چاہیے۔ اس کی رائے بھی اہل ہوگی۔ نہیں! کیا اسلام کسی روسو، کسی لینن، کسی کارل مارکس کو اہل رائے تسلیم کرتا ہے۔ کیا یہ سبھی پرکار یہودی مفکروں کے کارندے نہیں تھے۔ کیا انہوں نے انسانوں کو انسانوں کی حاکمیت ہی نہیں، ملکیت کی زد میں نہیں دیا۔ ہو سکتا ہے ہمارے علم میں نہ ہو، کچھ راز ہائے سرلبتہ صرف مفتیان دربار کو ہی معلوم ہوں۔ بتاؤ نا! ان کا بھی اہل رائے ہونا کہاں تحریر ہے۔ جو ہم نہ پڑھ سکے، چلو یہ ہمارا سہو ہی سہی لیکن اگر یہ قانون رائج ہو جائے کہ ہر انسان کو اہل رائے تسلیم کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ جس کے اعمال اللہ کی حدود پھلانگ جائیں اس کا حق رائے دہی معطل کر دیا جائے گا۔ جرم ثابت ہو جائے تو منسوخ کر دیا جائے گا۔ کسی مسلمہ زانی، شرابی، چور، راہزن، عصمت فروش، عفت زن مرتد کو رائے دہندگی کا حق نہیں ہوگا۔ تو خدا کی نہیں۔ اے سادہ لوحوں کے مشیرو! ”جو اصلاً رقیبوں کے نامہ بر ہو“ اپنے ہی نفسِ امارہ کی قسم کھا کر کہو، کیا یہ عمل و دستور ناجائز ہوگا۔ غور کرو، تم شرفاء کے محافظ ہو یا بدکرداروں کے راہ نما ہو۔ کیوں یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ سب سے بڑا انتخاب ہو ہونے والا ہے سربراہ مملکت کا ہونا چاہیے اور اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ تم میں سب سے بڑا وہ ہے جو سب سے زیادہ نیک اور دانشور ہے اور سب سے زیادہ نیک

اور دانشور وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے خائف ہے۔ سیاستِ دورِ حاضر جس کی دریافت و ایجاد ہے، اس کا نام تو مفکرِ پاکستان سے پوچھ لینا۔ ملتِ اسلامیہ کے مفاد میں اتنا ہی کر لو کہ گزشتہ ۳۶ سالوں میں جس کے نام شراب کا پر مٹ جاری ہوا ہو سیاست میں حصہ لینے کے اہل نہ رہے۔ کیا یہ زیب دیتا ہے کہ سیاسی راہ نما چرس و افیون و شراب و کوکین، جوئے، سسٹہ اور گھوڑ دوڑوں میں شرطیں لگانے کے رسیا بھی ہوں۔ کیا سیاست کا اخلاقی قدوں کا دشمن ہونا بھی روا ہے۔ اگر اسلام دخل در معقولات ہونے کی اجازت دیتا ہے تو ہمیں بھی آگاہ کرو کہ ان نیکو کاروں کی مخالفت کر کے ہم سے سہواً کوئی گناہ سرزد نہ ہو گیا ہو۔ ہمیں توبہ کرنے کا موقع دے دو ہم شکر گزار ہوں گے۔ ہمیں توبہ بھی نہ کرنے دو، سزا دے دو مگر جان رکھو جو اپنے نفسِ امارہ سے شکست کھا چکے ہیں، مارشل لا ان سے شکست نہیں کھائے گا۔ جو اتنی بڑی بڑی سیاسی شرارتیں سوچ سکتے ہیں ایسے قوانین کیوں تجویز نہیں کر سکتے جس سے مغربی طرزِ انتخاب مشاورت امور کے واضح اصولوں میں ڈھل جائے جن کے تحت واقعی اہل کارِ خدا و رسول کا انتخاب ہو سکے۔ راہِ گم گشتہ کارندو۔ اللہ کے اہل کار تلاش کرنے کے لئے شرابیوں، زانیوں اور دیگر بدکاروں سے رائے طلب کرنے کے عمل پر حق رائے بالغ دہی کا گرگٹی رنگ پردہ ڈال کر کس برتنے اور کس جرأت سے اسے اسلامی کہتے ہو۔ نہ کہو، ڈوب جاؤ گے، غرق ہو جاؤ گے، بے نام و نشان ہو جاؤ گے۔ یہ زمانے کو اسلام کے مطابق نہیں، اسلام کو زمانے کے مطابق کرنے کا عمل ہے۔ اسلام کے نافذ کرنے کا نہیں، اسے محتاج کرنے کا عمل ہے۔ اس سے باز آؤ۔ یہ بھی گزارش ہے کہ مجالسِ شوریٰ کے ذریعہ امیر کا انتخاب نہ کبھی وقت کا تقاضا تھا نہ آج ہے۔ قرونِ اولیٰ کے سیاسی ارتقا کو بھینگی آنکھ سے

نہ دیکھو۔ مجلس شوریٰ کا امیر نہیں ہوتا، امیر کی مجلس شوریٰ ہوتی ہے۔ امیر تو
 مومنین کا ہوتا ہے۔ امیر کے انتخاب کے بعد مجلس شوریٰ کا انتخاب صحیح طرز عمل و
 طریق کار تشکیل حکومت ہے۔ امیر کے لئے لازم ہے کہ امور مملکت کا تعین کرے،
 مسائل قوم و ملک کو یکجا کر کے پھر مجلس مشاورت قائم کرے۔ مختلف امور
 سے متعلق تجربہ کار، اہل رائے، نیک اور متقی دانشور منتخب کرنے کے لئے
 قوم سے امداد طلب کرے۔ اور قوم خلوص نیت سے بے لوث ہو کر تمام
 مخالفتوں، رقابتوں، رنجشوں اور گروہی تفریق و تقسیم سے بالاتر ہو کر اللہ اور
 رسولؐ کی پسند و معیار کے نمائندے مشاورت کے لئے ہمیا کرے۔ کیا یہ
 صالح عمل نہیں ہوگا کہ مزید اطمینان کے لئے تمام ارکان مجلس مشاورت، عہدہ دار
 اور اہل کار ایک ہی روز ایک ساتھ حلف اٹھائیں کہ وہ شراب کو رجزِ شیطان
 جان کر اس سے اجتناب کریں گے، ماہر معروف پر کاربند رہیں گے اور منکر کی
 نہی کریں گے۔ ان کے سپرد کی گئی امانت میں خیانت نہیں کریں گے۔ آخر کیوں
 ان سے حاکمیت الہی اور تقدس رسولؐ کی قسم نہ لی جائے۔ ایسا کرنے سے پوری
 قوم کا کھویا ہوا اعتماد بحال نہ ہو جائے گا۔ اصل مرض یہ نہیں کہ معاشرہ نیک
 نہیں، اصل مرض یہ ہے کہ چند لوگ معاشرہ کو نیک نہیں کرنا چاہتے۔ علم دستور
 آئین امر مشکل سہی، علم قانون کو ہی جانا ہوتا۔ زکوٰۃ کے نظام نشوونما ہونے
 کی بات تو شاید محض فلسفہ کہہ کر رد کر دی جائے لیکن اگر یہی قول صادق پیش
 نظر ہوتا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے
 یا بہ الفاظ دیگر عدم ادائیگی پر حفاظت اس کی ذمہ داری نہیں۔ تو قانون یوں
 رائج ہوتا کہ جس نے زکوٰۃ ادا نہ کی، حکومت اس کے مال کی ذمہ دار نہ ہوگی،
 لٹ گیا تو مقدمہ درج نہ ہوگا، تو آئندہ ہی روز گھروں کے باہر تختیاں نہ لٹک

جائیں کہ اس گھر سے زکوٰۃ ادا ہو چکی ہے۔ پھر سال بھر میں دو ہفتوں کا خرچ عطا کر دینے سے اسلام کا نظام زکوٰۃ نافذ نہیں ہو جاتا۔ جمع شدہ رقم سے ہر بستی میں ایک صنعتی ادارہ قائم کر کے یہ شرط عائد کر دینا کہ اس میں صرف محتاج مسکین ہی کام کریں گے، تمام تر آمدن ان ہی کا حق ہوگی، کیا تعمیری فلاحی اقدام نہ ہوتا۔ تھانوں میں بدکاروں کے بستہ ہائے ”الف“ و ”ب“ کھولے جاسکتے ہیں تو ناداروں کی فہرست کیوں نہیں بن پاتی۔ سڑک پر بائیں ہاتھ نہ چلنا اگر لائق تعزیر ہے تو ہمسایوں اور اقربا کی شادی و غم میں شرکت نہ کرنا، ان کے بھوکا سو جانے، بے علاج و تیمارداری رہنے پر تعزیر لگانا کیا ناممکن العمل ہے۔ صرف اتنا ہی اسلام نافذ کر دو کہ عدالتوں میں مقدمات کی پکار کرنے والے اللہ تعالیٰ بنام۔۔۔۔۔ کی آواز لگائیں۔ پھر اثر دیکھو۔ کتنے خوابیدہ ضمیر جاگ اٹھتے ہیں۔ اگر رسول اللہ بنام۔۔۔۔۔ پکار ہو تو آج بھی کسی مردہ ضمیر کے لئے ممکن نہیں کہ وہ زندہ نہ ہو جائے۔ لوگ عدالتوں کے برآمدوں میں ہی توبہ کے لئے سر بسجود ہو جائیں گے۔ احساس تو دلاؤ کہ وہ اللہ اور رسول کے مجرم بن گئے ہیں۔ تسلیم کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں۔ ان سے ذرا رسول اللہ کی قسم اٹھواؤ، پھر دیکھو، رقت قلب کیا رنگ لاتی ہے۔ عادل نہ سہی، منصف ہی سہی، سماعت سے پیشتر فریقین کو رسول اللہ کی ضمانت دے کہ وہ انصاف کرے گا۔ خلافت رسول محض زبان سے ہی قائم نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ مداخلت فی الدین ہے تو شرائط ملازمت میں یہ شرط بھی شامل کر دو کہ جس منصف کے سال بھر کے فیصلوں میں تین فیصلے اس کی اعلیٰ عدالتوں نے کالعدم قرار دے دیئے، اسے اختیار انصاف سے محروم کر دیا جائے گا۔ جس پولیس آفسر کے چالان کئے گئے ملزم کو عدالت نے بے گناہ اور بلا وجہ ملوث کیا گیا، قرا

دے دیا، اُسے اس بے گناہ کو ہر جانہ اپنی جیب سے ادا کرنا ہوگا۔ یہی کردو کہ
تعداد سے زیادہ سواریاں ہوں گی تو کوچوان اور ڈرائیور کے علاوہ ان سواریوں
کا بھی چالان ہوگا۔ یہ تو معمولی قوانین کی باتیں ہیں۔ یہی کر دیجئے اور جنوری ۱۹۸۵ء
تک کر دیجئے۔ پھر انتخابات کروائیے اور مان جائیے کہ سب سے بڑا انتخاب
سربراہ انتظام مملکت کا انتخاب ہے، اسے اولیت دیجئے۔ مسلمانوں کو بلا واسطہ
اپنے امیر کے انتخاب کا حق ہے۔ امیر اگر مجلس شوریٰ کے ووٹوں کا محتاج بن گیا
تو جناب صدر مغربی جمہوریت کی تمام تر خرابیاں اسلام میں سمودینے کا عمل
جاری ہو جائے گا اور تمام راہیں تاریک ہو جائیں گی جن پر یہ پرکار مشیر اپنی
مرضی کی شمعیں روشن کرنے کی فکر میں ہیں۔ ہم فقیروں کو تو عہدہ صدر نہیں، شرح
صدر درکار ہے۔ ہم فقط بدو ہیں اور چادر کا طول و عرض دریافت کرنے کا حق
مانگتے ہیں۔ فقیر اتنے کمین نہیں ہوتے کہ عہدے طلب کریں۔ اور جو عہدہ طلب
ہوں، امانت مشاورت کے اہل نہیں ہوتے۔ حصول مرتبت کے لئے خوشامد
کرتے ہیں، حاصل ہو جائے تو سازش۔



وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

انتخاب کے تمام مراحل مکمل ہو کر آئین کی مکمل بحالی کے منتظر ہیں۔ مغربی جمہوریت کے چولے کو نظام اسلام کا غلاف بنانے کے لئے آئینی ترامیم اور اسلامی انتخابی منشور کی قطع و برید بھی ہو چکی۔ جو کچھ منظر عام پر لایا گیا، مستقبل تحقیق کرتا رہے گا کہ اسلام اور جمہوریت کے امتزاج سے جو سیاسی نور فضاؤں میں پھیلانے کی نوید سنائی گئی ہے وہ میدان سیاست کے افق پر پھیلے گا، یا شفق پر۔ حق و باطل کی آمیزش سے منع کرنا مفکر پاکستان کی کوتاہ نظری تھی یا عبرت ہماری تلاش میں ہے، قوم حکمرانوں کی ساحری کی زد میں آگئی ہے یا سروری اسی ذاتِ بے ہمتا کو زیبا قرار دی جاتی ہے۔ جمہوری قبا میں پائے کو ب دیوا استبداد رقص گناں ہوتا ہے یا آزادی کی نسیم پری کے حضور عامۃ الناس عرض گزار ہوتے ہیں کہ ساتھی گری کا لحاظ کرو۔ ۳۷ سال ہوئے انسانوں کی حاکمیت کی زکوٰۃ پر گزارا ہو رہا ہے۔ روشن روشن چہرہ ہی بے سدھ کئے رکھتا ہے یا اندرون چنگیز کی تاریکیوں کا بھی کوئی مداوا تلاش ہو پاتا ہے۔ رند و فقیر و میر و پیر خلق خدا کو اپنی گھات میں لے آتے ہیں یا بندگانِ کوچہ گرد کو بھی بند بامی نصیب ہوتی ہے۔ بندہ مومن کا دین سرمایہ داروں کی زرگری کی جمہوری جنگ میں سفید جھنڈا لہراتا ہے یا طبلِ جنگ کی

کار فرمایا اپنے ذمہ لیتا ہے۔ ترامیم کی ترامیم ہوتی ہیں۔ یا الم تا والناس کے جملہ رشتہ و پیوند شکست و ریختگی سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ سرمائے، مسلح و زرہ پوش بیوروکریسی اور بائیکاٹی سیاست نے انتخابات کے مثبت نتائج کی جھولی سے ایک ہی جھپٹ میں، ایک ہی انداز میں اتنا کچھ چھین لیا کہ میدان سیاست میں کرگس و شاہیں ہم خود ہم سایہ نظر آنے لگے اور نہ صرف امیدیں بیٹھ گئیں اعتماد بھی اٹھنے لگا۔ اسلامی انتخابی منشور جسے مغربی جمہوری طریق انتخاب کے صدر دروازے پر تحریر کیا گیا تھا، کس حد تک پیش رفت آزما ہوا اور کس کس سمت اس نے محفوظ پائی اختیار کی۔ ہر "انسان" شہری کو اپنی ہی آنکھ سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ اقتدار یا حرص اقتدار کی آنکھ ان معاملات میں عنبر جانبدار ہی نہیں، مانا بننا بھی ہوتی ہے۔ کہیں ساون کے اندھوں کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے تو کہیں بیساکھ کے اندھوں کو گندم کی ہوئی ہی نظر آتی ہے۔ اور جو پوس کی رات دیدے نکلو بیٹھے، یہی پکاریں گے، روشنی نہ تھی، نہ ہے، نہ ہوگی۔ یہ تمازت جو محسوس ہوتی ہے آفتاب کی نہیں چولہے کی آگ کی ہے۔ مفکر پاکستان نے بجا فرمایا تھا کہ زمانے میں زندہ قوموں کا نشان ہوتا ہے کہ ان کی تقدیریں صبح و شام بدلتی ہیں۔ کاش وہ یہ بھی فرما جاتے کہ صبح و شام اگر تقدیریں بدل جائیں تو قوموں کے نشان کس طرح ڈھونڈھے جائیں۔ نظریہ پاکستان کی حفاظت ضرورت کے نظریات کی زرہ پہن کر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے اس پر تیر آزمائی بیرون سے محض نمائشی ہے۔ حقیقی نشانہ باز تیرا فگن تو اندرون جسم مورچہ بند ہیں۔ عوام نے خلوص نیت سے نظام اسلام کے نفاذ کے حق میں فیصلہ دیا۔ دستاویز اختیار جن ہاتھوں میں تھمائی گئی، وہ ناخن تدبیر سے آراستہ بھی ہیں اور گتھیاں

سلجھانے کے اہل بھی۔ مگر مدت کے پھیروں کا انداز نگاہ بھی بدلایا نہیں
 طریق شاہبازی ان پر فاش ہوا یا صدابصحا ہو کر رہ گیا، ابھی دیکھنا
 باقی ہے۔ اور نیک نیتی کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ عملاً مشاہدہ کے بغیر کسی
 کی نیت پر گمان نہ کیا جائے۔ قوم اسلام کے نفاذ کی منتظر ہے اور دین اسلام صرف
 سجدہ کی اجازت کا ہی نہیں، انسانی اہلیتوں اور ان کے ارتقا کے نظام کا علمبردار
 ہے، تسخیر انسان نہیں شرف انسان و تسخیر باطل کا دعویٰ دار ہے۔ وسائل ارضی کی
 متوازن و مساوی تقسیم، محرومیت کشی اور قلب و ذہن کے تضادات کو مٹا کر
 انسانوں کو یک سو و مطمئن کرنے کا ضابطہ کار ہے۔ جو دنیا کو انسانوں کے لئے
 جنت اور ہر شہری کو جنت کا حق دار بنادے، وہ مکمل نظام اسلام نہیں۔
 مملکت کاشہری اور شہری کی مملکت ہونے میں سب سے پہلے اسلام نے ہی
 خط امتیاز کھینچا۔ سیاست اسلام میں نمائندے آئندہ غائی کے لئے
 ہوتے ہیں، سروری اور حکمرانی کے لئے نہیں۔ ورنہ اہل الرائے کی قدغن نہ ہوتی۔
 لوگوں نے اپنی آئندہ نسلیں جن افسراد کی دانش کے سپرد کر دی ہیں، وہ
 اگر اپنی نیندیں بھی اپنے فرائض سے غافل رہے تو لکھا ہے، ایک ہستی ایسی بھی
 ہے جسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ، اور اُس کی کرسی ارض و سموات کا احاطہ
 کئے ہوئے ہے۔ کاشش لوگ کرسی کے مفہوم سے آگاہ ہوتے۔ تو کرسیوں
 کے لئے محاذ آرائی اور گروہ بندی کے وسیلہ کو نہ اپناتے۔ شکوہ صرف
 یہی نہیں ہے کہ معروف کے امر اور منکر کی نہی کا نظام برپا نہیں، یہ بھی ہے
 کہ لوگ جس قدر مغربی جمہوریت آگاہ ہیں، اتنے قرآن آشنا نہیں۔ صرف
 یہی نہیں کہ لوگ رزق حلال پر اکتفا نہیں کرتے، یہ بھی ہے کہ مروجہ نظام
 معیشت میں رزق حلال ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ یہی نہیں کہ شرف انسانی پر

حرف آ رہا ہے، یہ بھی ہے کہ کسی حرف میں شرف انسانی پنہاں نہیں ہے۔ یہی
 نہیں کہ قانون کو گویائی نصیب نہیں، یہ بھی ہے کہ قانون از خود قانونگو ہے۔
 اور یہی انسانی غلامی کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس سے نجات کا واحد ذریعہ
 اللہ کی حاکمیت کا نفاذ ہے۔ کاش کون پارلیمان اقتدارِ اعلیٰ کی بجائے
 اعلیٰ اقتدار کی پاسبانی کا مطالبہ کرتی، قدرت کی بجائے قدر کی متمنی ہوتی،
 عہدہ طلب کی بجائے عہدہ برآمد ہوتی۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا پارلیمان
 کا دائرہ کار نہیں۔ اختلافِ رائے کو اللہ اور رسول کے متعین کردہ
 اصولوں کی روشنی میں ختم کر کے یک رائے ہو جانا اس کا دستور نہیں۔
 تو ابھی نظامِ اسلام کے نفاذ کی راہ میں سنگِ میل مغربی جمہوری میکانیکی
 فکر کے نصب کردہ ہیں۔ اگر آلامِ مسیحی پر انسانی اجارہ داری کا تسلط موجود ہے،
 العفو سے قانون گریز کر رہا ہے۔ اتفاقاً پیدا ہے۔ اللہ اور روزِ آخرت پر یقین
 کامل نہیں، تعلیماتِ قرآن میں انسانی فکری ریب دخل انداز ہے۔ پیغمبر خدا کا
 دانائے سب، مولائے کل، ختم الرسل ہونا عملاً و فکرًا آئینی و قانونی طور
 پر تسلیم نہیں تو بندہ نواز و مسلمان کی رگِ جان ابھی پختہ یہود میں ہے۔ وہ مارکس
 ہو، ہیگل ہو، روسیو ہو کہ شیلے۔ جس کی آمد پر، جس پر ایمان لے آنے پر دیگر
 تمام پیغمبروں کی شرعی اطاعت ختم نہ کر دی جائے اُسے ختم الرسل کا حقیقی درجہ
 دینے میں انسانی عقل کوتاہی کی سزا وار ہو رہی ہوتی ہے۔ آج کے امیر مملکت
 اور اراکین مجلسِ شوریٰ کے بھی وہی فرائض ہیں جو خلفائے راشدین کے تھے۔
 دین میں شخصیتیں بدل جانے سے فرائض نہیں بدل جاتے۔ فرائض انسانوں کے
 نہیں اللہ کے مقرر کردہ ہیں۔ جس کے روبرو جواب دیتے وقت انتخابی
 عمل میں رائے عامہ کے استحصال اور مہم جوئی کے تمام حربے بے پینڈے

گلاس کی طرح ناکارہ و لاعاصل ہوں گے۔ دین سے سیاست کو
 جدا نہیں کیا جاسکتا تو دین کو دنیوی زندگی سے بھی جدا نہیں رکھا جاسکتا
 دنیوی زندگی میں آج کا انسان کن مصائب اور پریشانیوں کا شکار ہے
 اس کی نشان دہی اگر کسی اور کو ہی کرنا ہے تو پھر کیا نمائندگان اپنے فرائض
 منصبی سے آگاہ تسلیم کر لے جائیں۔ متوسط طبقہ کا انسان روزمرہ کتنی دفع
 مرتا ہے، کیونکر زندہ درگور ہے۔ نوشتہ دیوار ہے۔ اس کی کیفیت انہی
 دیواروں پر تحریر ہے جن پر انتخابی اشتہار تحریر کئے گئے اور اُس عزیز
 فن کار نے یہ تحریریں ضرور پڑھی ہوں گی جس نے یہ اشتہار راتوں کی سیاہی
 میں دنوں کے اجالے کے لئے تحریر کئے۔ نمائندگان وہ چہرے ہی
 پڑھ لیتے تو تمام عبارتیں واضح ہو گئی ہوتیں۔ رازِ سلطانی سے آگاہ
 ہونا ہی کافی نہیں ہوتا، فرائض و مقدرہ سلطانی بھی زیر نظر رہنے چاہئیں
 اپنے زخموں کو چھپاتے مگر درد سے کراہتے ہوئے انسانوں کو اپنا مخالف
 سمجھ لینا انسانی حکومتوں کی کوتاہی رہا ہے۔ انسان اگر اللہ کے احکام کے
 مطابق نظام حکومت قائم نہ کریں تو نشہ قوت کے لئے سامانِ انداد
 منشیات فطرت کے پاس کبھی کم یاب نہیں ہوا۔ جو التجا نہیں سنا
 کرتے، ان کے لئے کبھی کسی نے دعا نہیں کی۔ خوف کی اطاعت کا نظام
 اطاعت مندوں سے خوف کا پیش خمیہ ہوتا ہے اور جسے اطاعت مندوں
 سے خوف آنے لگے وہ شاہ و قیصر تو ہو سکتا ہے۔ راتوں کی
 خواب گاہیں، دنوں کی نشست گاہیں اور قصر و ایوان کے درمیان
 راہیں بدلتا ہوا، کھجور کے سائے تلے دوپہر کو سستا ہوا عمر فاروق رضی
 تاریخ نے نہ اُسے کبھی پایا، نہ تسلیم کیا۔ اور آخر میں اسے زمامِ برادران

کارِ نوا! اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی وفاداری بشرطِ
استواری اصل ایمان ہے۔ اور اگر سر بھوڑنا ہی راستے دہندگان کا
مقدّم ٹھہرا دیا گیا تو پھر تمہارا ہی سنگِ آستان کیوں ہو۔



چلے بھی جاؤ، کہ گلشن کا کار و بار چلے

چار روزہ عمر عزیز جس کے دو دن آرزو میں کٹ جانے اور دو انتظار میں بیت جانے کی مثل مشہور ہے، انسان مانگ کر لاتا اور قرض چکائے بغیر چلا جاتا ہے، اگر منفی سیاست کی نذر ہو جائیں تو دانش مٹی کے سازش و شرارت گزیدہ ہونے، تیغ و سناں سے ہارنے اور طویل شب غم گزارنے کے کنائے لرزنے لگتے ہیں۔ دانش و دانست پر منفی سیاست کا وہی عمل ہوتا ہے جو اذہان پر منشیات کا۔ جس فرد یا قوم کو اس کی لت پڑ جائے، کھجور سے کودنا اور ببول میں اٹک جانا اُس کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ بھٹیڑوں کی خفگی سے گھبرا کر قیام امن کے لئے شیروں کو دعوت عمل تو وہی چر داپے دے سکتے ہیں جو بھنگ کے کھیتوں میں چرنے والی بھٹیڑوں کا تازہ دودھ پئے ہوئے ہوں۔ منفی سیاست نا اہلوں کی حرصِ اقتدار کی عطا ہوتی ہے۔ اس قسم کے اندھے بھکاریوں سے ہوشیار لوگ جعلی نوٹ بھنوا ہی لیا کرتے ہیں۔ ان ہتھکنڈوں سے اقتدار پر ہاتھ جا بھی پڑے تو فقط اندھوں کے دیوالی منانے کے مناظر برپا ہوتے ہیں۔ نا اہلوں کی حرصِ اقتدار اتنی سوجھ بوجھ بھی باقی نہیں رہنے دیتی کہ انتقالِ اقتدار تاج منتقل کرنے کا عمل ہے، پا جائے تبدیل کرنے کا نہیں۔ حرصِ اقتدار کے طفیل دنیا بھر میں وہ دن گئے کہ سیاست آگاہ ہونے کے لئے لوگ دانشِ ارسطو

و افلاطون و سقراط و بقراط سے استفادہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ دن بھی نہ
 رہے جب فطرت آشنا ہونے کے لئے نظام کائنات پر غور کیا جاتا تھا۔ فکر و تدبیر
 کے سلیقے سکھنے کے لئے خالق کائنات کے حضور دست بستہ قیام، رموز دانش
 سے آگاہ ہو کر سبحان ربی العظیم کے کیف میں رکوع پذیر ہو کر ربنا لک الحمد
 کا اقرار کرتے، سبحان ربی الاعلیٰ پکارتے، جنینوں کو سجدہ آشنا کر کے، حضور پیغمبرؐ
 دوزانو بیٹھ کر تکمیل فکر کو "تم سب پر سلامتی ہو" پر منتج کیا کرتے تھے۔ وہ دن
 یوں نہ رہے کہ خلافت نے ملوکیت کی فرغل پہن لی۔ انسانوں نے رکوع و سجود
 سے کنارہ کر لیا۔ اعمال و افکار کی بجائے تجویریاں تلنے لگیں۔ سیاسی سہارے
 بدل گئے۔ گردنیں اس لئے اکر گئیں کہ جھکے تو تاج شاہی نہ لڑھک جائے۔ خصائل
 کی بجائے وسائل سیاسی اثاثہ قرار پائے۔ دانشوروں نے دستارِ فضیلت کے
 تہ بند سلوا لئے۔ طرہ بقدر علم کی بجائے حبیب بقدر جہتہ کا رواج چل نکلا۔ سیاست
 پر فارغ العقل قارون اجارہ داریاں قائم کرنے لگے۔ عقل نے عیاری کو بطور پیشہ
 اپنا لیا۔ بے فکروں کے غول مراتب حکومت کے نیلام گھروں میں بولیاں بڑھانے
 لگے۔ یہ حقیقت فراموش کر دی گئی کہ جو کان کی لوٹوں کو چھو کر اللہ اکبر نہ
 کہیں، ان کے ہاتھوں میں تلوار کا آجانا ایسے ہی ہے جیسے کوئی ابن زیاد میدانِ کربلا
 میں در آیا ہو۔ بندوں کی حاکمیت کا قیام حسینؑ پر نزید کو کھلا چھوڑ دینے کا عمل
 ہے۔ بندوں کی حاکمیت کے سائے میں فقط وہی سیاست بنتی ہے جو اہل کوفہ
 نے روا رکھی تھی۔ اللہ کی حاکمیت میں اگر سنگلاخ زمین سے زم زم پھوٹتا ہے
 تو بندوں کی حاکمیت میں اللہ کے بندوں پر تشنگی، کربلا وارد ہو جاتی ہے، شرفِ
 تخلیق کے سینے میں نوکِ سناں، خلافتِ ارضی کے ہاتھ میں کاسے گدائی،
 استبداد و استحصال کی دستار بندی کا رواج کونسی بزعم خود آزاد مملکت

میں ساری نہیں۔ ترقی یافتہ و ترقی پذیر ممالک میں ان اشیاء کی فقط چمک دمک اور نقش و نگار مختلف ہیں، ان کے عوامل و نتائج میں کوئی فرق نہیں۔ درمیانہ کی بیانی پر ہذا من فضل ربی تحریر کر دینے سے یا مراحیموں کی گردنوں میں تسبیحوں لٹکانے سے نہ سرورے میں کمی آجاتی ہے، نہ میخوار عارف بن جاتے ہیں۔ صرف سادہ لوح دھوکا کھا جاتے ہیں، صرف پیر میخانہ کا فریب چل جاتا ہے۔ تاریخ انسان تو ہی بتا، اپنے ہی سینہ پر ہاتھ رکھ کر بول! اللہ کی ملک یہ کرہ ارض ملکوں ملکوں نوبہ نوریاستوں اور راجدھانیوں میں کیوں تقسیم ہوا۔ سلطنتیں کیوں تاراج ہوئیں، خلق خدا کو ہاتھوں اور گھوڑوں کے پاؤں تلے کیوں تھماڑا کیا۔ انسان ساختہ ٹینکوں، توپوں، بموں، میزائلوں نے انسانوں کے خون کی ہولی کیوں رچائی۔ خاندانی منصوبہ بندی ہو، دختہ کشی ہو کہ محاذ آرائی موت کے گھاٹ کون اتارا جاتا ہے، کون اتارتا ہے۔ انسان اپنی حاکمیت کے لئے اپنے ہی ہم نسلوں، اپنے ہی ہم جدیدوں کو نابود کرنے پر کیوں تیار رہتا ہے۔ قوم، رنگ، نسل، سلطنت، تہذیب بلکہ انسانی معاشرہ کا سبھی کچھ غارتگری و آدم کشی کو وطیرہ حیات کیوں بناٹے ہوئے ہے۔ انسان نوع انسان کا شکاری کیوں ہے۔ ملک و سربراہی کی مدہوش دھن میں یہ انسان جس گھر کے صحن میں کھیلتا، پلتا اور پرورش پاتا ہے، اسی گھر کو تقسیم کرنے کے لئے اپنے ہی ماں بھائیوں کا دشمن بن کر جان پر کھیل جانے اور جانوں سے کھیل جانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ جس خاندان کے تعلق سے جانا اور پہچانا جاتا ہے، اسی کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے۔ اے ذوق حاکمیت کیا تیری کوکھ سے صرف سانپ ہی جنم لیتے ہیں کہ کاٹیں تو تریاق نہیں اور نہ کاٹیں تو معاشرہ کا نشہ ٹوٹنے لگتا ہے۔ سرور اول و شراب آخر کا دستور میخانہ حاکمیت انسان کیا کیا گئی کے ناچ نچو گیا کہ پائل کی بجائے پاؤں بجنے لگے۔ بدھ دیکھو تقویم اسن اپنے ہاتھوں اسفل ہونے میں

مصروف ہے۔ اور سنتے ہیں، انسان ترقی کر رہا ہے۔ نوبت بہ این جا رسید کہ جو انسان تقسیم زمین پر وہ سخی ہو یا ملکی، تیغ زن تھا، اب خود ساختہ مفروضات کو لازم کا نام دے کر اس کی بالاتری کے لئے اپنے خالق سے یا منکر یا لاتعلق ہو کر اس قدر سیکولر ہو گیا ہے جیسے آج کا انسان اللہ سے بہتر دانشمند ہو چکا ہے۔ اسے یہ یقین ہی نہیں رہا کہ اللہ بھی بندوں کو موت آشنا کر سکتا ہے۔ لہذا نوبہ نو طریقہ ہائے ہلاکت انسان ایجاد کر رہا ہے۔ جسے از خود مرجانا ہے، اسے ہلاک کرنے کے لئے خزانے خالی کر رہا ہے۔ زمین کو برباد کرنے کے لئے خلائی جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ جو جتنا زیادہ مہلک ہے، اتنا ہی سپر تسلیم ہے۔ ظلم ایجاد کر کے حاکمیت ارض حاصل کرنا دستور زمانہ بن گیا ہے۔ کہیں کوئی ریچھ گرم پانیوں میں کھل کھیلنے کے لئے دم ہلاتا، پینچے جھاڑتا، پھنکار رہا ہے۔ تو کہیں کوئی سفید ہاتھی اپنے استعماری اعضا کی ماتش کے لئے تیل کے چشموں پر اپنی سوئڈ جمائے بیٹھا ہے۔ جرمن نازیوں نے حرص حاکمیت میں دنیوی ملکی تقسیم کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔ عبرت انگیز ہلاکت کے خوف نے اقوام متحدہ کی بنا تو ڈالی مگر اس کی تمام ذہنی و فکری جہلتیں یہود ساختہ اور لادین پر داختہ ہیں۔ اللہ نہیں ہے اور اللہ ہیں کے انسان ساختہ مکتبہ ہائے فکر نے اس کے حفاظتی ادارے تشکیل دے رکھے ہیں۔ لا الہ الا اللہ پر یقین رکھنے والوں کے لئے جنگ ہائے عظیم کی نصابی مجبوریوں کی وجہ سے جو ممالک وجود میں آئے، وہاں خاص انصرام سے اللہ متعین کر دیئے تاکہ ان جنگوں میں صرف شدہ سرمایہ پر یہودیوں کو عند الطلب سود ادا کرنے کا فرض ان کے وسائل کے ذمہ لگایا جاسکے اور انسانی حاکمیت کے براہنج آفس من مانے انتظام کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتے رہیں۔ برطانوی جمہوریت نے "ڈیوائن رائٹ آف کنگز کی تولید یعنی" کنگ از دی

ہیڈ آف چارج اینڈ می سٹیٹ“ کے اجزائے خصیم سے جنم لیا۔ اور لالہ
 الالہ اس کی فکری بنیاد ہے جسے پارلیمانی سپریسی اور ”کنگ کین ڈونورنگ“
 یعنی بادشاہ خطا سے مبرا ہے کے مشترکہ جھولنے میں لیٹ کر ”شاہ فوت شد
 شاہ زندہ باد“ کی لوریاں سننے اور اونگھتے رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس
 نظام میں دارالامرا اور دارالعوام کے مشترکہ جمناسٹک کے دوران جو جو ہر دکھائے
 گئے، وہ تاریخ کی پیٹھ پر نقش ہیں۔ تاریخ کا یہ اشتہاری ملزم جس نے انسان کو
 خود شناس و خود نگر ہوتا دیکھ کر راہ نمائی سنبھال لی تھی پکڑا جا چکا۔ نوک خنجر بھی
 اور آستین کا لہو بھی پکار پکار کر کہہ رہا ہے، یہی وہ دیواستباد ہے جس نے
 اپنی حاکمیت کے لئے انسانی اقدار کے خون کے دریا بہا دیئے۔ یہی وہ سراب
 رنگ و بو ہے جس نے اخلاق و دیانت کو تشنہ لب رکھا۔ اس نظام کی کارکردگیوں
 سے تنگ آ کر اشتراکیت و مزدکیت اس پر لپکی تو سہی مگر انسانی ذہنی استعمار
 نے لالہ کی بجائے لالہ کا نعرہ بلند کر دیا۔ ہر کعبہ دل میں الہ ”واحد“ کی بجائے
 لات و منات ایستادہ ہو گئے اور یہ راز افشا ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اگر
 خالق کائنات کے الہ واحد ہونے سے ہی نہیں، اس کے وجود سے بھی انکار کر دیا
 جائے اور گروہی خدائی کا تصور برپا کر کے، کائنات کے از خود رو ہونے کا اعلان
 کے، زمین اور اس کے وسائل پر ہی نہیں انسانی اہلینوں پر بھی اجارہ داری قائم کر
 دی جائے تو جانو! نظریہ کمیونزم عمل میں لایا جا رہا ہے۔ مغربی جمہوریت کی سربراہی
 برطانوی مہاجروں کے ہاتھ جا لگی اور کمیونزم کے پنجے پاکستان کی سرحدوں تک
 پھیل چکے۔ ان نظریات کی جنگ کے دائرے کو اب اس حد تک پھیلا دیا ہے
 کہ امریکی صدارتی انتخابات میں دخل انداز ہونے کے لئے روس پاکستانی سرحدوں
 پر افغانستان سے بم باری کروا رہا ہے۔ یہ بمباری پاکستانی سرحدوں کے علاوہ

امریکہ میں کسی کی انتخابی مہم پر بھی ہے۔ غیر ملکی انتخابات میں دخل اندازی کا یہ نرالا ڈھنگ تو اس بھیرٹیٹے کو بھی نہ سبھائی دے رہا تھا جو پانی کے گدلا ہونے پر معترف تھا۔ سبھائی بھی کیونکر دیتا کہ بھیرٹیٹے اور انسانی بھیرٹیٹے کی سمجھ میں اتنا فرق ہوگا ہی۔ جو کچھ بھی ہوا واضح ہے کہ انسانی حاکمیت کی دو سپر طاقتیں سپر آزما ہیں۔ نہ بمباری حسین مذاق ہے، نہ کسی کا لاؤڈ سپیکر ٹیسٹ کرتے وقت اعلان جنگ کرنا محض تمسخر تھا۔ ہر دو کے پس پردہ عمیق مقاصد پنہاں ہیں۔ حاکمیت انسان کیلئے ہلاکتِ انسانیت کے، وطن عزیز کے واسطے علاوہ متذکرہ داویچ آزما کے یہ امر بھی غور طلب اور اندیشہ آمیز ہے کہ پاکستانی روس نواز، وہ حب علی میں ہوں یا بغض دیگران کی وجہ سے، افغانستان اور دیگر روس پروردہ ممالک کے علاوہ برطانیہ میں کیوں کر پناہ گزین و جاگزیں ہیں۔ روسی ٹینکوں پر بیٹھ کر پاکستان آنے اور بلوچستان کے راستے گرم پانیوں تک روس کو لے آنے کی تخیلاتی گھاٹیاں ہموار کرنے کے لئے برطانیہ کی سر زمین کیوں استعمال ہو رہی ہے۔ یہ لوگ دیارِ غیر میں کس کی مالی امداد سے زندگی، بسیار بسر کر رہے ہیں، کھل کھیل رہے ہیں، عشرت کی گود میں بیٹھے عیش کو گلے لگائے ہوئے ہیں۔ یہی نہیں، اندرون ملک سیاسی ڈوریں کیوں کٹ رہی ہیں۔ سیاسی کمین گاہوں سے قیام پاکستان کے مخالف سیاست دان حالات کے رخ پر گھات لگائے کیوں اور کس کے ایما پر بیٹھے ہیں۔ جو امریکی انتخابات پر اثر انداز ہونے کے لئے پاکستانی سرحدوں پر بمباری کروا رہے کیا پاکستان کے انتخابات میں جانبدار رہے گا اور اگر اس کی جانب داری پر نگاہ نہ رکھی گئی تو کیا آئندہ انتخابات کسی کے روسی ٹینکوں پر سوار ہو کر آنے کے لئے نہ سہی، روسی نظریات کے گھوڑوں پر سوار ہو کر آنے کی راہ ہموار نہ ہو جائے گی۔ پاکستان کے ایک طبقہ کا بظاہر مغربی جمہوریت نواز اور

اور بیاطن پروردہ اشتراکیت ہونا پاکستان کے سیاسی جسم پر ایک ایسا ناسور ہے جس کا رسنا اگر بند نہ ہو تو سیاسی فضاؤں کا بُو دے اٹھنا لازم ہے۔ یہ طبقہ ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۳ میں دو کامیاب چالیں چل چکا۔ اب تیسری چال چلی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی آفاقیت و افادیت کو مغربی جمہوری اور اشتراکی نظریات سے پینٹ کر کے یوں مخفی کر دیا جائے کہ اسلام کا ہر کلیہ تجریدی آرٹ کی شکل اختیار کرے۔ یہ میکا ولی و مارکسی انداز یہودیوں سے ادھار لیا گیا ہے۔ اس صورت حال سے نبرد آزما ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ شاہیں کا جگر اور چیتے کا تھبّس درکار ہوگا۔ بارہ اگست کا اعلان کہ انتقال اقتدار کی نفی اور انعقاد انتخاب کا اثبات ہے، ایک دم مسترد کر دینے کے باوجود اب اگر مطالبہ بن گیا ہے۔ پہلے احتساب اور بعدہ انتخاب کے نعرہ زن، صوبائی محرومیوں، لسانی و نسلی محرومیوں کے علمبردار بن کر علیحدگی پسندی کو ناکام ہوا دینے کے بعد اب جو جلد از جلد انتخابات کا تقاضا کر رہے ہیں تو اس لئے نہیں کہ انہیں اپنی کامیابی یا اپنے حق میں انتقال اقتدار کا یقین ہے۔ صرف اس لئے کہ یوں روس کے انتخابات پر اثر انداز ہونے کے مواقع فراہم ہوں گے۔ جغرافیہ ہی روس کے حق میں نہیں ہے، پاکستان کے تاریخ ساز معدوم ہو جانے کے بعد پاکستان کے سیاسی جغرافیہ کار، پاکستان کے اتنے ہی خواہ ہیں جتنے حضرت عیسیٰؑ کے حواری تھے یا اہل کوفہ شہید کربلا کے ساتھی تھے۔ صرف ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کی محفلیں جمالینا ہی اس مخدوش صورت حال کا مکمل علاج نہیں۔ ہمارا ایک مختصر سا سیاسی طبقہ افرنگ زدہ بھی ہے اور افرنگ گزیدہ بھی۔ زنا زعفران میں جکڑا ہوا تلواریں میان سے لکانے کے لئے بے تاب ہے، نبرد آزما ہونے کے لئے نہیں کے لئے نہیں، غنیم کے قدموں میں رکھنے کے لئے۔ الارض اللہ، المحکم اللہ الملک اللہ سے منحرف ہو کر مغربی جمہوری انداز میں انسانی بنیادی حقوق اور آزادی

کا ذکر کرنا، پنجرے میں بیٹھ کر صیاد کے ایما پر آزاد پرندوں کو جال میں پھنسانے کے لئے ترانے گانے اور تانیں اٹھانے کا عمل ہے۔ یس للانسان الاماسعی اور العفو کا عمل اگر فی سبیل اللہ کے عنوان کے تحت قائم و جاری نہ کیا جائے تو اس کا نتیجہ قارون کی چابیاں لادنے کے لئے مزید اونٹ خریدنے کے عمل کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ اللہ کی حاکمیت میں درخت اپنے سائے انسانوں کے مقام کو دیکھ کر پھیلاتے اور سکیرتے نہیں۔ سورج کا رخ ان کا تعین کرتا ہے۔ سورج جو اپنی کرنیں بکھیرتے وقت محلوں اور جھونپروں میں امتیاز نہیں کرتا۔ یہ ہوائیں، یہ بارش، یہ موسم نہ اپنی نہ انسانی خواہشات کے محتاج ہیں۔ ایک مستقل وغیر تبدیل نظام ان کو اپنی تنظیم میں سموئے ہوئے ہے جو ان کا استعمال فی سبیل اللہ کروا رہا ہے۔ تمام کائنات کے لین دین میں اصول فی سبیل اللہ کار فرما ہے۔ اسے حاکم و محکوم انسانوں ایک وقت اللہ اور بندوں کی حاکمیت کے علمبردارو! سورج، چاند، ستاروں کی روشنی کے بل کیا تم ادا کرتے ہو۔ پانی و ہوا کی فراہمی کے لئے فطرت نے کیا کوئی اجرت یا ٹیکس عائد کر رکھے ہیں۔ چاند، سونا، ہیرے، جواہرات کیا قدرت تمہیں مفت مہیا نہیں کرتی۔ یہ دریا، یہ نالے جو زمین کو زر خیزی دے جاتے اور اس کی مردا ہٹ کو بہا کر لے جاتے ہیں کیا انہیں مہیا کرنے کے لئے فطرت تمہارے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہے جو دا پڑا اور واسا کا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اگر حکومتوں کو برف جمانا ہوتی، سمندروں سے بادل بنوانے اور اٹھوانے ہوتے، میدانوں میں ہوا اگر انسانی ذرائع نے رواں رکھنا ہوتی تو دنیا بھر کے کسی بھی مطلق العنان بادشاہ کی حکومت پہلے دن ہی دیوالیہ ہو گئی ہوتی۔ یہ سبھی بھاؤ بندوں کی حاکمیت کے لگائے اور بڑھائے ہوئے ہیں۔ آزادی تحریر کا مطالبہ کرنے والو! اس حاکم کی بھی سنی ہوتی، جو علم بالقلم کا دعویٰ دار ہے۔

آزادی تقریر پر مہر ہونے سے پیشتر اس کی طرف بھی دھیان دیا ہوتا۔ جس
 نے تمہارے سامعین کو کان عطا کر رکھے ہیں۔ جو علم البیان کا دعویٰ ہے۔ یہ بھی
 سوچو۔ اس نے زبان تمہیں دل کی ترجمانی کے لئے دی ہے، روس، امریکہ یا
 حکومت ہائے وقت کی باجرت ترجمانی کے لئے نہیں۔ اور اس لئے بھی نہیں
 کہ دل کی بات زبان پر نہ آنے پائے اور جو دل میں ہے، زبان پر نہ ہو۔ لم تقولون
 مالا تفعلون کی رمز پچانو۔ قلم بدست دوست مایسترون پر بھی نظر رکھیں۔ ادیب
 وہ نہیں جو اپنی ناقص عقل کے غیر مکمل تجربات و مشاہدات تحریر کر کے عوام الناس
 کو سوسوں کا شکار کرتا رہے۔ ادیب اس کو کہتے ہیں جو اس توکل کے ساتھ نوک
 قلم کاغذ پر رواں کرے کہ اُسے تو خود اپنی تحریر سے راہ نمائی حاصل کرنا ہے ہریر
 خامہ نوائے سروش نہ ہو تو آزادی تحریر معاشرے پر ظلم ہے۔ اور جو نوائے سروتس
 پر پابندی لگائے وہ بہت بڑا فسطائی ہے۔ قلم اگر انسانیت کو وہ علم نہ دے
 رہی ہو جس سے انسان نا آشنا تھے تو اس پر پابندی از بس لازم ہے۔ علم جس
 کی بنیاد محقق تشکیک پر اٹھا رہا ہو، تحریراً ہو یا تقریراً اس سے پناہ مانگو کہ
 ماسوا و سوسوں کے ایسے علم نے نہ کبھی کچھ عطا کیا ہے، نہ کر سکے گا۔ اسے دنیا بھر
 کے بندوں کی حاکمیت قائم کئے ہوئے حاکمو! بہت ہو چکی۔ اب چلے بھی جاؤ، کہ
 گلشن کا کاروبار چلے۔ جن کے آنے سے گلشنِ فطرت میں غیر اللہ کا کاروبار در آیا
 ہو، جن کی آمد نے بندوں کی حاکمیت کے باڑا بازار کھول دیئے ہوں، گلشنِ کاروبار
 چلنے کی بجائے جنگل کا کاروبار چل لکلا ہو، اُن کا چلے جانا ہی انسانیت کی بقا
 ہے۔ فقیر نہ کسی خاص صاحبِ اقتدار سے مخاطب ہے، نہ محروم و طالبِ اقتدار
 سے۔ اُن سرچشموں سے مخاطب ہے جو اللہ کی حاکمیت غصب کرنے کا درس
 دیتے ہیں۔ تمنائے فقیر صرف یہ ہے کہ عرصِ اقتدار چلی جائے۔ بندوں کا ذوق و

شوقِ حاکمیت چلا جائے، تفرقات چلے جائیں۔ کدورتیں، رقابتیں، اختلاف برائے اختلاف۔ فرقہ بندی، گروہ سازی، پارٹی بازی، پیشہ ور سیاست، اجارہ داری، تقلیدِ طریقِ غیر، غلامانہ ذہنیت، افترا بدوری، اقربا نوازی اور اقربائی سازشیں، لسانی و نسلی تعصب، طبقاتی تقسیم، خود غرضی، سیاست کاری، سیاسی سرمایہ داری، انسانوں کا زعمِ قانون سازی، مغربی جمہوریت، اشتراکیت و مزدکیت کے فروعی مفروضے، حاکمیتِ الہی پر بے یقینی اور اس کے ساتھ روارکھی ہوئی دُرُغی حق و باطل کی آمیزش، سبھی چلے جائیں۔ سبھی انسان یہیں رہیں۔ انسانوں کی عبدیت، اللہ کی حاکمیت، انسانوں کی انسانوں سے حریت باقی رہ جائے تاکہ کلشن کا کاروبار اُس سپریم طاقت کی رضا کے مطابق چل نکلے جو کائنات کی ناظم ہے۔ ہم سبھی اُس سپریم طاقت کے اہل کار ہوں، احکامِ الہی کے پابند۔ اگر ان اصولوں پر مبنی خلافت و مشاورت کا نظام نافذ نہ ہوا تو ہم انتخاب نہیں کروا رہے ہوں گے، یہ ترانہ گارہے ہوں گے کہ چلے بھی آؤ کہ جنکل کا کاروبار چلے۔ ہم نہ بدلے تو امریکی انتخاب کے نتائج ہم پر لازم اثر انداز ہوں گے۔ ایک جیت گیا تو ہمیں مفلوج کر دے گا۔ دوسرے کی بن آئی تو کسی پر ایسی بن جائے گی کہ بن آئے نہ بنے گی میرے ہم وطنو، دانشورو، سیاست کارو اور زمام بدستو! سرِ ضروری کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ انسانی حاکمیت کو دستورِ پاکستان میں کا عدم قرار دے کر حاکمیت صرف اللہ ہی کو زیبا ہونے کا اقرار کرو۔ کوئی سپر طاقت اللہ کی سپریم طاقت سے زیادہ طاقتور نہیں۔ یہ جذباتی بات نہیں، حساباتی حقیقت ہے۔ پاکستان کے دفاع میں ہم کمزور پائے جاسکتے ہیں۔ اللہ کی حاکمیت کا دفاع کرنے والوں نے آج تک شکست نہیں کھائی۔ سنبھالنا ہے تو اس کی خلافت کا منصب سنبھالو۔ فقیر اللہ کے ہر خلیفہ کو سلام کرتا اور اللہ کے ہر رقیب کے

خلاف اعلان جہاد کرتا ہے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا راستہ وہ جہاد
بالسيف ہو یا جہاد بالقلم یا باللسان، اپنی پلکوں سے صاف کرے گا۔ ہم وطنو!
اپنی حاکمیت قائم کرنے کے خواہش مند ہر انسان کی راہ میں، وہ سیاست دان
ہو یا سیاست کار، سیاست شعار ہو یا سیاست پناہ دین اسلام کے ستون کھڑے
کردو کہ ان ستونوں پر اُن غیر مرئی قوتوں کا پرہ رہتا ہے جو سینہ تاریخ پر واردات
بُت خانہ اُزر تحریر کرنے کی منتظر رہتی ہیں۔



بتوں سے امیدیں خدا سے نو میدی

عزیز ہم وطنو! دو قومی نظریہ اور مطالبہ قیام پاکستان کو برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی یا اقتصادی آزادی تک ہی محدود کر دینا، کوتاہی دانش بھی ہے، سہو بالخطا بھی اور سیاسی فکری الحاد بھی۔ تحریک پاکستان کو لاریب ہندوستان کے مسلمان کی سیاسی آزادی مقصود تھی۔ مگر یہ جزوی و ابتدائی مقصد تھا۔ مفکر پاکستان کا اصل مدعا اسلام کو آزاد کروانا تھا۔ دو قومی نظریہ سے مومن و کافر میں کرہ ارض کا احاطہ کرتی ہوئی تقسیم مقصود تھی۔ ایک قطعہ زمین پر آئین اسلام کا نفاذ کر کے دنیا بھر میں اس کے لئے راہیں ہموار کرنا تھا۔ بندوں کی نوع درنوع حاکمیت میں تقسیم شدہ ہلاکت انسان پر تلی بیٹھی طاقتوں کو فساد پروری اور مکر آزمائی سے کنارہ کش کر کے اللہ کی حاکمیت کے تحت لانا آئین فطرت سے باغی انسانوں سے اللہ کی حاکمیت تسلیم کروانا تھا۔ اولاً وحدت ملت اسلامیہ اور بالآخر وحدت انسانیت وجود میں لانا تھا۔ ایک خطہ زمین پر قلعہ آرا و بکتر بند ہو کر اپنی صفوں کو درست کر کے دنیا بھر میں آئین پیغمبرؐ کو یوں آشکارا کرنا تھا کہ کرہ ارض کے تمام تر انسانی معاشرہ پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم ہو کر انسانی کارحیات، کار و بار فطرت و کائنات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

بندوں کی حاکمیت کے تمام مکتبہ ہائے فکر باطل قرار پائیں اور قرآن پاک بطور ایک
 قطعی سچائی کے عملاً تسلیم و وارد ہو۔ دانش اقبال کے ان گنت شہدائی اور
 پیروکار آج بھی پاکستان کا فکری اثاثہ ہیں اور لائق تحسین ہیں۔ اللہ تعالیٰ
 اس سرمایہ کو محفوظ رکھے۔ مگر مفکر پاکستان کے چند خود ساختہ دانش فروش
 مجاور، امریت کے نامزد جمہوریت نواز جو نام، کام، دام، فکر اور عمل کے واسطے سے
 زندگی بھر مخفف رہے، نہایت ہوشیاری سے اقبال ہی کو فروخت کرتے رہے۔
 فکر اقبال کو یوں مسخ کرتے رہے کہ ان کے فرمودات کے مطابق قیام پاکستان
 کا مقصد ہی معدوم ہو کر رہ گیا۔ اور جو یہود و نصاریٰ سمجھ گئے، وہ ان محنتان
 افزنگ نے پاکستانیوں کی سمجھ میں نہ آنے دیا۔۔۔۔۔ نیل کے ساحل سے لے
 کر تابہ خاک کا شجر مسلمانوں کا ایک ہونا، سیاست چھوڑ کر حصار دین میں
 داخل ہونا، خلافت کی بنا کو پائیدار کرنے کے لئے اسلاف کا قلب و جگر ڈھونڈ
 کر لانا، دین کارنگ و نسل پر مقدم ہونا، الاماسعی کے انسان کا کسی چیز پر
 حق نہ ہونا، العفو کا معاشی طور پر وارد ہونا، مزدور کی محنت کا حق سرمایہ دار کو
 کھانے نہ دینا، محمود و ایاز کا ایک ہی صف میں کھڑا کیا جانا، الارض اللہ، الملک اللہ
 الحکم اللہ، سروری صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہونا، جمہوریت کا دیو استبداد ہونا۔
 سراب رنگ و بو ہونا، چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر ہونا،
 اس کے پردوں میں صرف نوائے قیصری ہونا، گفتار اعضاٹے مجالس کا سرمایہ داروں
 کی جنگ زرگری ہونا۔ ان خود ساختہ مجاوروں کے آقا کا چادر زہراؑ، دلق
 اویسؑ و کلیمؑ بوذرجمہ تک بیچ کھانا، کرگس و شاہین کے جہانوں کا جداگانہ ہونا،
 تہذیب و تعلیم مغرب کا شاہیں بچوں کو درسِ خاکبازی دینا، انسان کا نوع
 انسان کا شکاری ہونا، بندے کا کوچہ گرد اور خواجہ کا بلند بام ہونا، حق و باطل

کی آمیزش کا مہلک ہونا، غرضیکہ فکرِ اقبالؒ کا سبھی کچھ شاعرانہ مبالغہ بن کر رہ گیا۔ اور ان کی نذر، فکرِ افزنگ کو راسخ قرار دینے رکھنا ہی صراطِ مستقیم رہ گیا۔ اقبالؒ کا آئینِ اسلام کی نشان دہی کرنا مغربی فکری سازشوں سے آگاہ کرنا سیاستِ مغرب کے کاہنوں کو شاید اسی لئے بُرا لکھا ہے کہ ان کے ذمہ آج بھی یہی ہے کہ شرعِ پیغمبرؐ آشکارا نہ ہونے پائے۔ ہر چند کہ ایسی ہی قلمِ فروشی و کاہنہ لیسے کے طفیل پاکستان کی سیاست پر قیام و استحکام پاکستان کے مخالف چھا گئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان ہوا۔ ان ہی کی مغربی جمہوریت نوازی نے وطنِ عزیز کو لخت لخت کیا۔ مگر یہ مگر مچھ ہیں کہ پاکستان کے وسائل کو بے ڈکار ہڑپ کر کے اس کے جغرافیہ پر ”پلیسٹ“ بھی مارتے رہتے ہیں۔ اور آنسو بھی بہاتے رہتے ہیں۔ ایسے پیشہ ور جھگت بازوں اور طنز تراشوں کے ہاتھ میں قلم تھما دینا، جنہیں قلم تراشی پر مامور کرنا بھی ادب سے ”سودا“ کو چھین لینا اور اس کے قلمدان بردار ”غنی“ کو صاحبِ دیوان قرار دینا ہے۔ ادب و سیاست کے سروہی کچھ تھوپا ہے جو ہم جھگت رہے ہیں۔ آئینِ اسلام خلافت و مشاورت کے نظام کا داعی ہے، انسانی حاکم و حکومت کا اس میں کوئی تصور نہیں۔ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ حاکمیت اسی کی ہوتی ہے جس کا حکم نافذ ہو۔ انسانوں کی حکومت میں انسانوں کی مرضی کا حکم نافذ ہوتا ہے اور خلافت میں فقط احکامِ الہی کی پابندی ہے۔ قانونِ دراصل حاکم کی مرضی کا عین نام ہے۔ انسانی حکومتوں میں مرضی انسان یا ان کے کسی گروہ کی مسلط کی جاتی ہے اور فریب یہ دیا جاتا ہے کہ قانون کی بالادستی دراصل حاکم کی مرضی کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی حاکم کی مرضی کی حکمرانی کے چھلاوہ کے عرفی نام ہیں۔ کسی ایک بندے یا بندوں کے گروہ کی حکمرانی و حاکمیت، خود شناس و خود نگر ہوتے ہوئے انسانوں کو مختلف فریب

دینے کا عمل ہے۔ انسان صرف اللہ کی حاکمیت میں آزاد ہوتا ہے۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب اسلام کے نظام مشاورت کے خلاف سرمایہ داروں کی ایک سازش ہے۔ مغربی جمہوری نظام اسلام کے آئینی گوہر ہائے نایاب کے مقابلہ میں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ مستقل حزب اقتدار و اختلاف نظام مشاورت کی واضح نفی ہیں۔ مشورہ یک رائے ہونے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اختلاف کو استقلال بخشنے کے لئے نہیں۔ اصول بیعت کو اختلاف، گروہ بندی، پارٹی بازی و تفریق سازی کی نفی کے لئے سیاست میں دائم کیا گیا ہے۔ اس ہی غرض سے عہدہ طلبی و ہم جوئی ممنوع ہے۔ انسانوں کو یہ حق نہیں کہ وہ مسائل ارضی کے مالک بن جائیں انسانوں کو اپنی مرضی کا تابع کر کے ان کا استحصال کریں، خود اللہ کی مرضی کے تابع نہ رہیں۔ انسانوں کا طاقت کا سرچشمہ بن بیٹھنا اور یوں خود سر و مطلق العنان ہو جانا کہ خود غرض اعمال و افعال بھی جائز قرار دیئے جائیں۔ تفریق و تفسیر گروہ سازی، فرقہ بندی، حزب ہائے اقتدار و اختلاف، حرص اقتدار کا رہائے طاغوتی ہیں۔ اللہ کی حاکمیت کے قیام سے کسی فرد واحد کے ہاتھ مضبوط نہیں ہوتے مسلمان مضبوط ہوتے ہیں۔ البتہ وہ گائے بانجھ ہو جاتی ہے جس کے سینگ حزب اختلاف نے پکڑ رکھے ہوتے ہیں اور دودھ کی دھاریں نامزد جمہوریت نواز لے رہے ہوتے ہیں۔ میکا ولی کا ایجاد کردہ ایک اسلوب سیاست یہ بھی ہے کہ ان کو کہو اور آن سنی بیان کرو۔ حقائق کو طعن و تشنیع کا ہدف بنا کر ابہام پیدا کرو تاکہ حاکمان وقت کی بالواسطہ اعانت ہو۔ اجرت لے کر بغیر پڑھے لکھے تبصرہ کرنا اور بغیر سننے تنقید کرنے بیٹھ جانا بھی اسی مکتبہ فکر کی دین ہے۔ دوستو! بہتان و الزام تراشی وقت کا تقاضا نہیں۔ یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ سرزمین پاکستان کے بسنے والے کس طرح زیر امتحان ہیں۔ ایک سرحد پر منکرانِ خدا بادوسری

سرحد پر خود ساختہ خدا پرست دو طاقتوں کے درمیان دبی ہوئی مملکت خدا داد
 پر جو بنام خدا برائے بندگان خدا تھی اور جسے ناخداؤں نے خدا سے چھین لیا۔
 منکرانِ خدا سنگین تانے ہوئے ہیں۔ منکرانِ رسولؐ سیوا جی مرہٹہ کی طرح بغل گیر
 ہیں۔ اس سرزمین کو محفوظ رکھنے کے لئے اللہ کی سپریم طاقت کی حاکمیت کا تقاضا
 کریں یا ان کی سیاست کو اپنالیں، جو صوبائی محرومیت، علیحدگی، کنفیڈریشن
 کے داسی ہیں۔ ان کی سیاست کو اپنالیں جو مفکر پاکستان اور قائد اعظم
 پر کفر کے فتوے لگاتے رہے، جو آج بھی پاکستان کو ناجائز مسجد قرار دیتے ہیں۔
 ان کی سربراہی کے لئے اہتمام کریں جو روسی ٹینکوں پر سوار ہو کر آنا چاہتے ہیں۔
 گریٹر بلوچستان کے لئے از خود جلا وطنی وارد کئے بیٹھے ہیں۔ جن کا استقبال
 سرحد پار پنجتوستان کے نعروں سے کیا جاتا ہے۔ جو دیارِ افرنگ میں سازشوں
 کے تانے بٹنے بن رہے ہیں۔ کیا سبھی پاکستانی ہائی جیکر بن جائیں، سیکولزم اپنا
 لیں۔ سبھی بی۔ بی۔ سی کے نامہ نگار بن جائیں۔ پاکستان کا صحافی کوئی بھی نہ رہے۔
 ان حالات کا مداوا کرنے، اس ڈیکوریسی سے حساب مانگنے کی بجائے جو مارشل لا
 ہٹے کے نفاذ کا باعث بنتی رہی۔ تمام سرحدی نگرانوں کو بد دل، بے یقین کر دیں
 نفرتوں، کدورتوں، مخاصمتوں کا علاج ڈھونڈنے، انہیں کم کرنے کی بجائے یہ
 اعلان کر دیں کہ وہ قوم مرچکی جو تمہارے لئے دعا گو تھی اور خدا نخواستہ برا وقت
 آنے پر صرف نامزد جمہوریت نوازوں یا حریصانِ اقتدار کو دیکھتے رہیں کہ تلوار
 اٹھانے سے پہلے کس کس کی چوڑیاں گنتے اور کس کس کی چٹیا سے امامِ ضامن باندھتے
 ہیں۔ لاریب مارشل لا، ناگوار عمل ہے مگر اس کے تحت معاون حکومت میں
 شمولیت کو کیا کہیں۔ عمل مارشل لا دیا عمل سیاست جمہوریتِ غرب۔ ملک
 میں مختلف قومی اداروں کے درمیان نفرت کا عمل بھی ایک سازش ہے جس

نے ۱۹۶۵ کے اس جائزہ سے جنم لیا کہ یہ "کوالٹی" اور "کوانٹیٹی" یعنی
 اوصاف اور تعداد کی جنگ تھی۔ قوم کا اپنی فوج پر دلی دعائیں نچھاور کرنا، اس
 کی راہوں میں آنکھیں بچھانا۔ اس تاثر کا ابھرنا کہ عام فوجی نہیں اللہ کے ولی لڑ
 رہے ہیں، ہتھیار نہیں کرا مائیں ساتھ دے رہی ہیں، سپاہی نہیں آسمان
 سے اترے ہوئے سبز پوش فرشتے ہیں۔ حالانکہ اُس وقت بھی ایک فوجی
 ہی کی حکومت تھی۔ مگر سبھی کچھ فراموش کر کے لا الہ الا اللہ کی آواز پر قوم یوں
 سیسہ پلائی دیوار بن گئی کہ مغربی جمہوری اور پاکستان مخالف دینی سیاست ہر
 دو منہ تکتی رہ گئیں۔ لوگوں کا ہوائی جہازوں کی جنگ کا یوں مزالینا جیسے پتنگ
 بازی کا مقابلہ دیکھ رہے ہوں، آخر کس کو نہ بھایا تھا کہ قوم کو۔ ۱۹۷۰ دکھایا گیا
 اور آج کے دن دکھائے جا رہے ہیں۔ ہم وطنو! منکرانِ رسول اور منکرانِ خدا
 ٹکرانے کے لئے سینگ تول رہے ہوں تو نظام لا الہ الا اللہ سے گریز، اس
 پر طعنہ زن ہونا، بے جا تنقید، بے ذلی، بے یقینی مرگِ مفاجات کو دعوت دینے
 کے سوا کچھ بھی نہیں۔ آئین اسلام کے نفاذ کا مطالبہ، خلافت و مشاورت
 اور مغربی جمہوری طریقِ انتخاب میں امتیاز تقاضائے وقت ہے۔ یہ وقت تنقید و
 افترا و طعن زنی کا نہیں، تحقیق و اطاعت کا ہے۔ تحریروں اور تقریروں کے
 ماہانہ معاوضہ اور گھر کے بجٹ میں غلطاں نہ رہو۔ بینکن کی مدح و سبوح کی بجائے
 سلطان کو احساس دلاؤ کہ حضور کی تھالی میں فقط بینکن ہیں اور قوم بینکن بڑی
 عیار ہے۔ اقتدار میں شرکت کے لئے خوشامد اور بعد از شرکت سازش ان
 بینکنوں کی تاثیر ہے۔ اول تو اعلانِ انتخابات میں انتقال اقتدار لازم ہی نہیں۔
 ہو بھی تو موجودہ اجارہ دار سیاسی صورت حال میں مغربی جمہوری انتخابات
 کے نتیجہ میں کسی مستحکم حکومت کی توقع عبث ہے۔ کچھ لوگ آئندہ انتخابات

کے ذریعہ قائم ہونے والی سول حکومت پر ابھی سے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔
 یہ جوڑ توڑ، یہ پابندیاں، یہ رہائیاں، یہ سودا بازی۔ یہ لین دین فکری ہو، کہ سیاسی،
 نہ ملک و قوم نہ سیاست دانوں نہ حکمرانوں کے اُس وقت تک کسی کام آسکے گا
 جب تک مغربی جمہوری نظام حکومت اور طریق انتخاب رائج ہے۔ لفظ ”رہا“
 لفظ ”ہار“ ہی کا عکس معکوس نہ ہو۔ قوموں کی زندگی میں اس قسم کا اتفاق جو فرقہ
 کی تقسیم تک ہی قائم رہے، بڑا مہلک ہوتا ہے۔ ہمیں تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ
 بھی۔ پھر عبرت کیوں نہیں۔ مغربی جمہوری نظام کے میدان میں اسلام اور سوشلزم کی
 مصنوعی جنگ چھیڑ کر بنگلہ دیش بنوانے والے اب جیلے بہانے اسلام کے مقابلہ
 میں سیکولر جمہوریت کو لاکھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ جن مغربی جمہوری سیاسی کارروائیوں
 نے بار بار وطن عزیز کو مارشل لار کے حوالے کیا وہ موجودہ حکومت کے انتخابی پروگرام
 کو سبوتاژ کر کے ایک نئے مارشل لائی سربراہ کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے۔ ایسا
 ہوا تو کوئی اس وہم میں گرفتار نہ رہے کہ سیاسی جوڑ توڑ سے کچھ سیاست دانوں
 کی حمایت حاصل کر کے مغربی جمہوری طریق انتخاب کے ذریعہ مثبت نتائج حاصل
 کئے جاسکتے ہیں۔ اس کاوش کا حاصل ”ستم کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا“
 کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ پاک تانی سرحدی خطرات کا علاج اگر قیام و استحکام پاکستان
 کے مخالفین سے گٹھ جوڑ ہے، اندرا کو دعوت مداخلت دینے والوں سے پینگیں
 بڑھانا ہے، اُن کا ساتھ ضروری ہے جن کے معاون بیرون ملک سازشوں میں
 مہروف ہیں، تو یہ عمل صرف اس افیونی کی مثل دانشوروں کو اس آٹے کا
 جو دوسرے افیونی سے کہہ رہا ہو۔ کہ اگر یہ ٹانگ تمہاری ہے تو پھر میری ٹانگ
 کہاں ہے۔ بیرونی خطرات بھی پیش نظر ہوں تو واحد علاج اللہ کی حاکمیت کے
 قیام کے تحت ایسا نظام خلافت و مشاورت قائم کرنا ضروری ہے جس میں

عمدہ طلبی ہو، نہ ہم جوئی، نہ پیشہ وری، نہ اجارہ داری۔ پوری قوم مسلسل
 عمل مشاورت میں شامل ہو۔ بہ قائمی ہوش و حواس کوئی شخص اپنے
 گھر کے انتظام کو اس شخص کے سپرد نہیں کرے گا جو اس کے قیام
 کا ہی مخالف رہا ہو۔ پھر آخر اس سوال کا معقول جواب محتاط محبان
 وطن کیا دیں کہ جو سیاسی جماعتیں یا افراد قیام و استحکام پاکستان کے ہی
 مخالف تھے، انہیں پاکستان میں اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے،
 سیاسی جماعتیں بنانے اور پاکستان کی سیاست میں حصہ دار بننے یا
 اقتدار میں شریک کرنے کا کیا جواز ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ بیوروکریسی مغربی
 جمہوری نظام کا لاینفک جزو ہے، مارشل لا کا نہیں۔ اس کے مشوروں پر
 انحصار مارشل لا کو جمہوری تو بنا دے گا مگر فطرت کی بیوروکریسی اسے
 ایک مارسل سل بنا دے گی۔ اللہ کی حاکمیت کے پردہ میں بندوں کے حاکمیت
 نواز پنپ نہ سکیں گے۔ ایسے لوگ بھی ہمیشہ اسی دنیا میں موجود رہتے ہیں جو
 آزدہ دوستوں کے کمروں میں رستیاں یہ کہہ کر لٹکا دیتے ہیں کہ جھولنا بناٹیں
 گے اور پھر آزدگی کو اس حد تک ہوا دیتے ہیں کہ خود کشی سرزد ہو جائے۔
 مغربی جمہوری نظام کے ذریعہ ان کو شریک اقتدار کرنا جنہیں بتان آزدی کہتے
 ہیں اور اللہ کی حاکمیت کے نفاذ سے گریز کر جانا ”بتوں سے تجھ کو امیدیں
 خدا سے نو میدی“ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مغربی جمہوری طریقہ سے انتخاب
 ہوا تو امریکی صدارتی انتخاب کے نتائج کچھ بھی ہوں، یا موجودہ مارشل لا
 طویل ہو جائے گا یا پھر کسی مزید مارشل لا کے لئے زمین ہموار ہو جائے گی۔
 تنخواہ داروں کے لئے خبر تو بن جائے گی، ماتن خواہی کی تمنا پوری ہو کہ
 نہ ہو۔ آج کے مسلمان کو اس کی قوت ایمان لوٹائے بغیر اس کی جھولی

میں جمہوری آلائشیں ڈال دینا اس کے عقائد کو مجروح و مشکوک کرنے کا عیارانہ
 طریقہ ہے۔ جو یورپ کے شکر پارہ فروش تعلیم مغرب کی نیم دانشوری کی پروردہ
 طفلانہ طبیعت کے لئے ہمیشہ سے تجویز کرتے چلے آئے ہیں۔ خدا انسانوں کی
 حاکمیت کے ہر مکتبہ فکر کو غرق دریا بھی کرے اور رسوا بھی۔ یوں کہ نہ کہیں
 جنازہ اٹھے نہ مزار ہو۔ آج انتخابات پر منافقانہ سیاسی اصرار، دورانِ در
 جماعتی بائیکاٹ کرنے اور انفرادی طور پر انتخاب لڑنے کے ارادے موجودہ
 حکومت کو اسی کی مجلس شوریٰ میں انتشار پیدا کر کے رسوا کرنے کی تجاویز، افراد
 کی سازش کہ الیکشن جیتنے کے لئے بظاہر موجودہ حکومت کی چھتر چھاؤں میں رہا
 جائے اور درپردہ اس کے سیاسی رقیبوں سے گٹھ جوڑ رکھا جائے، عین
 وقت پر مجلس شوریٰ سے استعفا دینے جائیں، افغان مہاجر کیمپوں میں
 شر پھیلایا جائے مسلکی تفریق کو فساد کی حد تک ہوا دی جائے کے عوامل
 واضح ہیں۔ ان حالات میں اگر کل کے "انڈرا" نوازے آج مخلص تسلیم کئے
 جا سکتے ہیں تو پھر کسی ملک دشمن کو نہ بند بجا چھپانے کی ضرورت ہے مانہ
 آستین کا لہو دھونے کی اور نہ جبیں سے پسینہ پونچھنے کی۔ یہ ملک پھر ان
 ہی کا ہے جو سبھی کچھ کر گزرنے کی قسم کھائے شہ لگائے بیٹھے ہیں.....
 خدا نہ کرے۔ مغربی جمہوریت کے غلاف میں جمہور مغرب کوئی نیا گل کھلا جائیں۔
 لوگو! نجات میکا دلی سے گٹھ جوڑ میں نہیں، حجر سے وفا میں ہے اور مغربی جمہوریت
 اور اس کا طریق انتخاب حضور کی ایجاد نہیں۔



پلامار کے بچاؤ دیا

یہ فیصلہ کرنا کہ مطلق حاکمیت کے باوجود ملازمت سے سیاست میں آنے کو ترقی کہا جائے گا یا تنزل، وقت کے دھاروں کا رخ متعین کرنے والی اس قوت کا منصب ہے جو انسانی تاریخی مفروضوں، تجربوں، مشاہدوں اور اندازوں کی محتاج نہیں، افراد کے لئے اپنے لافانی فطری قوانین میں ترمیم نہیں کرتی اور اپنے فیصلے یوں صادر کرتی ہے کہ ہر ابن بطوطہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ فطرت افراد کی تاریخ سے لاقلم اور زمانوں کی تاریخ سے

متعلق رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ نے فقط زمانہ ساز شخصیتوں کو اپنایا ہے اور جنہیں سانحات و حادثات زمانہ نے نمود و نماد ہی یکسر فراموش کر دیئے گئے انسان اگر تواضع بالحق اور تواضع بالصبر کا عمل نہ اپنائے تو خسارہ اس کا مقدر ہے۔ حق و صبر پر انحصار نہ کرنے والا نہ صرف ہلاکت آمیز تیروں کی زد میں رہتا ہے بلکہ ”دیکھا جو تیر کھا کے کہیں گاہ کی طرف؛ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی“ اس کی تقدیر کا نوشتہ دیوار ہوتا ہے۔ حق و صبر پر انحصار نیت کا معاملہ ہے، عمل کا نہیں اور نیت تک انسان کی چونکہ رسائی نہیں، انسان صرف اس کا قیافہ لگا سکتا ہے لہذا کوئی انسان اس خدائی کا دعویٰ کیوں کرے کہ ملازمتی حاکمیت سے سیاسی حاکمیت کی طرف انتقال کا نتیجہ اُسے معلوم ہے۔ لیکن یہ امر تو غور طلب ہے

کہ اگر کسی فرد کا اقتدار متاثر ہوئے بغیر اس کی قوت کے سرچشمے بدل جائیں تو اُمینی و
 قانونی محفوظ ڈیم تعمیر کر لینے کے باوجود اس واقعہ کو بالآخر حادثہ کہا جائے گا،
 سانحہ یا اصلاح احوال ایسے انتقال کا عمل بڑا احتیاط طلب ہوتا ہے۔
 اس لئے کہ حلقہ نیابت بدل جائے تو انسانی سیاست درمیانی لمحات کے لئے
 مقتدر کو یا تو نیابت بنا دیتی ہے یا تازہ خدا مشہور کر دیتی ہے۔ پرانے سرچشمے
 اگر خشک ہو جائیں اور نئے سیراب نہ کریں تو ظاہر ہے گھڑے کی مچھلیاں دریا میں
 ڈالنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ مشاہدہ گواہ ہے کہ نہ مچھلیاں بدل کر گھڑے کو
 مفید بنایا جا سکتا ہے نہ گھڑے کو مچھلیوں کو زیادہ دیر تک زندہ رکھا جا
 سکتا ہے۔ دریاؤں کے سرچشمے بدل جائیں تو کیا فقط ان کے نام دائم و قائم
 رکھنے سے وادیاں اور دو آبے بھی وہی رہیں گے۔ اور پھر وعدہ و وعید کی سیاست
 کا تو یہ خاصہ ہے کہ اگر نئے سرچشموں کا بھرپور تعاون حاصل نہ ہو تو پرانے پل نئے
 پل تعمیر ہونے سے پہلے توڑ دیئے جاتے ہیں اور پرانے بہاؤ کے راستے خشک و
 ویران قرار دے دیئے جاتے ہیں۔ کیا معلوم انسان عقل کیا سوچ رہی ہے
 اور فطرت کے زائچے میں کیا لکھا ہے۔ کاش انسان فطرت کی بساط پر اپنے
 مہرے سجانے سے باز رہتے۔ انسان کھیتوں میں کیا بوریہا ہے، یہ تو انسان
 سے دریافت بھی کیا جا سکتا ہے، انسان کو بتایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن
 کون جانے فطرت نے بادلوں میں پانی چھپا رکھا ہے کہ بجلیاں، کیسے خراب
 کہ اٹھتی ہوئی گھٹاؤں سے زالہ باری ہوگی یا کوئی آندھی انہیں اڑا کر لے جائے
 گی، اقتدار کے تصور میں لہلہاتی کھیتوں کی کونپلیں کیرے مکوروں اور سُنڈ
 کی خوراک بنیں گی یا کھلیاں سجے گا۔ یہ جان جانا انسانوں کے بس میں ہوتا
 سیاسی خدا آئے روز میدانی حشر برپا کرتے اور داورِ محشر بن بیٹھتے۔

ایں کی جہاں بانی چھینوا کر آنجہانی نہ ہو گئے ہوتے۔ یہ کارنامہ کسی انسان کا ہے یا خدا نے بزرگ و برتر کا کہ جس آئین کی منسوخی کی سزا انسانوں نے متفقہ طور پر موت مقرر کی۔ فطرت نے اس کی معطلی کا انعام حکومت تحریر کر دیا۔ راتوں کی سیاہی میں گھرے ہوئے مسافر، اس اندھیرے میں سمتیں متعین کرنا ہیں تو اپنے سائے ڈھونڈو۔ نہیں ملیں گے۔ آسمان کی طرف دیکھو۔ شاید فطرت نے سمت نمائی کے لئے ستارے چمکا رکھے ہوں۔۔۔۔۔ کہیں سہو تو ہو گا، کہ آئین جو قوموں کی رہنمائی کے لئے ترتیب دیئے جاتے ہیں، ہمارے ہاں فقط عتبر کے لئے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ کہیں یہ اللہ کی حاکمیت کے پردے میں بندگانِ خدا کا استحصال کر کے اپنی حاکمیت قائم کرنے کا معاوضہ تو نہیں۔ ریاست پاکستان کو ریاستوں کا پاکستان بنانے کی اجرت تو نہیں، جو فطرتِ عادل نے پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دی ہو۔ کہیں یہ وہ سزا تو نہیں جو اللہ کی حاکمیت نے جمہور کی حکومت کے لئے تجویز کی ہو۔ کہیں یہ وہ بدلہ تو نہیں جو مدنیت نے ری پبلک اور فیڈریشن سے چپکے سے لے لیا ہو۔ یہ وہ زرتخو اہی تو نہیں جو ہم نے ریاست اسلام کو جمہوری ری پبلک بنانے کے صلے میں وصول کیا ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چنار کھلے ہوں اور ہماری غیر دور اندیش سیاست نے مشہور کر دیا ہو کہ گلشن میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے دین اسلام کو مغربی جمہوریت اور یہودی سوشلزم کی بیساکھیاں دے کر اس کی تکمیل پر آئینی طعن کیا ہو۔ ایسا تو نہیں کہ ہم نے عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں دے دیئے ہوں۔ یوں تو نہیں کہ نظریات کے تصادم کی وجہ سے ہم کو نظری کا شکار ہو کر حق را بسجودے کی بجائے صنماں را بطولافے کے عمل میں مشغول ہو گئے ہوں۔ ایسا تو نہیں کہ ہم نے امر و حکم میں امتیاز نہ کیا ہو اور ہمارے

امر، امرا کے سپرد کر دیئے گئے ہوں۔ ایسا تو نہیں کہ ہم نے اللہ کی بجائے مکتبہ ہائے شریکانِ خدا سے ”اھدنا الصراط المستقیم“ کی التجا کی ہو اور ”ضالین“ قرار پا کر مغضوب ہو کر رہ گئے ہوں۔ ہم وطنو! کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ خدا کے لئے سیاست کو مزید عشوہ طراز نہ بناؤ۔ کہ ہاں میں نہ اور نہ میں ہاں مخفی ہو۔ خدا نے تمہیں اقتدارِ فانی سے نوازا ہے تو احتیاجِ اقتدارِ لافانی سے بھی نوازے! یہ طور بھی نہ اپنانا کہ ہم سے ہاں کہلو اور رکھے منہ فرمان ہو کہ ہم نے ارادہ بدل لیا ہے۔ نظامِ اسلام کے نفاذ کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان کی بجائے ریاستِ اسلام وجود میں لائی جائے۔ یہ بھی لازماً زیرِ نظر رہے کہ اسلامی ریاست اور ریاستِ اسلام کی تصریحات و توجیہات جداگانہ ہیں۔ یہ ہم معنی و ہم مطلب ترکیب نہیں اور نہ ان کی تبریک ایک سی ہے۔ دانشور و املکی وحدت کے بغیر نہ ملی وحدت ممکن ہے، نہ فکری یک سوئی۔ یاد ہو گا، ایک دفعہ ہم نے ون یونٹ بنانے کا دعویٰ کیا مگر پس پردہ عملی طور پر دو یونٹ بنا ڈالے تھے۔ جس سیاسی لغزش کا مداوا پیریٹی سے بھی نہ ہو سکا اور آج پاکستانی وہ قوم ہیں جن کا مشرق ان سے چھن چکا اور مغرب کو اگرچہ حالات نے ہاتھ دے کر رکھ لیا مگر حالات کی جھولی میں فقط مغرب کی آسمانی سیاسی طشتی رہ گئی جس میں بیگن ہی بیگن ہیں۔ جن کا سیاسی رویہ بیگن کی پاکستان دشمنی سے بھی پیش روی کا متمنی ہے۔ اُف وہ منحوس لمحات جب حالات نے میدانِ سیاست ان اذہان کی کار آزمائشوں کے سپرد کر دیا جن کی زندگی متوفیہ اندرا گاندھی کو یہی اشارے کرتے گزر گئی کہ ”پلا مار کے بچا دے دیو۔ تے اکھ نال کھل کرے“ اُف! سات آیات کے وطن میں چھ نکات کا غوغا۔ اور ہائے وہ گوہر جو الطاف کی نذر ہو گئے.....

اے حالیہ ریفرنڈم کی کامیابی۔ تو نے اگر نہ جانا کہ ریاست اسلام کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے، نسل و زبان پر نہیں، اس کی دل آویزی خوبصورت الفاظ اور دلکش نگار سے نہیں، مضبوطی کردار اور عقیدہ راسخ سے نشوونما حاصل کرتی ہے۔ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں توازن سے متوازن معاشرہ کا قیام کہیں زیادہ اہم ہے۔ ملک و وطن مصلحتوں کے بسیرے نہیں ہوتے، انہیں نسلوں سے نہیں نسلوں کے لئے بنایا اور بسایا کرتے ہیں۔ وطن سے یارا نہ نہیں ہوتا، محبت ہوتی ہے۔ ان میں گھروں کی طرح بسا کرتے ہیں، ہوٹلوں کی طرح نہیں رہا کرتے۔ زبانوں کا اختلاف فاصلوں کا پیدا شدہ ہے اور فاصلے بڑھاتے رہنا اس کا مشغلہ ہے۔ تہذیب اُسے نہیں کہتے جو فکری تقاضوں نے ڈھالی ہو، اُسے کہتے ہیں جسے فطری تقاضوں نے جنم دیا ہو۔ وحدتِ مدنیّت کے بغیر تمدن کا پینا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ اور تمدن کو محفوظ رکھنے کے لئے ہاتھ روم اور غسل خانے تعمیر نہیں کیا کرتے، صحن وسیح رکھا کرتے ہیں۔ صحن میں دیواریں اٹھادی جائیں تو رسوم و رواجات، تہذیب و تمدن میں دراڑوں کا درآنا لازم ہو جایا کرتا ہے۔ صحن کا خلوص اور رازداری اگر لان کی سیاست بن جائے تو گھروں کا مغربی جمہوری روایتیں اپنا کر محض روایتی بن کر رہ جانا مقدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مغربی جمہوری گھر متصور یتیموں کے گھر ہوتے ہیں۔ انسان مجسم جنس بن کر رہ جاتا ہے۔ چلتی پھرتی دانش متنازعہ۔ رینگتی ہوئی سیاست۔ دہشت زدہ اور وحشت خوردہ انسانی اعمال متوازی ہو جاتے ہیں۔ مساوی نہیں رہتے۔ احکام کی وحدت و یکسانیت ہی تہذیب و تمدن کی ہمہ گیری و یک سوئی کی ضامن ہے۔ مومن کو فقط احکامِ الہی کا پابند کرنا تکمیلِ دانشِ انسان کا باعث اور دانشِ خداوندی کے بالاترین ہونے کا ثبوت ہے۔ انسانِ کامل کی نامکمل اطاعت ایمان کی

کمزوری ہی نہیں، آج کی سیاست کا دوغلا پن بھی ہے۔ اے حسبِ صوابید
 کامیابی استصواب ہاں! کہہ دے۔ تو نے قوم کا شکریہ ادا کیا۔ قوم تیرا شکریہ
 ہی ادا نہیں کرے گی، تیرے اور اپنے خدائے واحد کے روبرو ہمہ گیر خشیت
 سے سجدہ ریز بھی ہو جائے گی۔ ”تمیز رنگ و خون کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا۔
 نہ ایرانی ہے باقی نہ تورانی نہ افغانی“۔۔۔۔۔ ”ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی
 کے لئے۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر“۔۔۔۔۔ ”فرد قائم رطل
 ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں۔ موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں“
 یہ سبھی کچھ عشقِ داناٹے راہ نے ملت کے قوالوں کے لئے نہیں، سیاستدانوں
 کے لئے فرمایا تھا۔ اور ”الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن۔ ملا کی اذان
 اور ہے مجاہد کی اذان اور“۔۔۔۔۔ ”پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں۔
 کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور“ کہتے وقت مفکرِ پاکستان کے
 تصور میں پی آئی اے نہیں کوئی اور ادارہ تھا۔ کوئی شیخِ کلیانواز نہیں تھا،
 بندہٴ مومن کا خالق و کارِ آفریں، کارکشنا و کارساز کردار تھا۔ وہ مومن جو حلقہ
 یاراں میں ابریشم کی طرح نرم اور رزمِ حق و باطل میں فولاد کی مانند سخت و راسخ
 ہوتا ہے اور مومن کے لئے زیب نہیں کہ سرمایہ داروں
 کے لئے جنگِ زرگری کا سامان مہیا کرے۔ ایسے ادارے قائم و استوار کرے
 جن میں گرمی گفتار بیٹھے مزے اور خواب اور اثر کو ہنر و ایمان ایمان بنالے
 اور سردی صرف چند افراد کو ہی زیب دینے لگے۔ انسانی سیاست میں خدا کا
 کوئی عمل دخل نہ رہے۔ مریدوں کو تو مٹی کا دیا بھی میسر نہ ہو اور پیر کا گھر
 بجلی کے چراغوں سے منور رہے۔ لوگ قبروں کی تجارت کر کے نکونام ہوتے
 رہیں۔ اور علم کے نام پر کلیم بوذر، دلِقِ اولیس و چادر زہرا نیلام ہوتی رہے

بھرے بازار میں بندے خدا کو بیچتے رہیں۔ خدا کے نام پر خدا ہی پر بولی لگتی رہے۔ رشوت مالیہ سرکار کے انداز سے وصول کی جاتی رہے، لوگ کفن کی مہنگائی کے زیر نظر موت سے ڈرتے رہیں۔ بچوں کی فاقہ کشی کے ڈر سے خاندوں اور بیویوں کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اندھیرا اجالے کے واسطے سے مقبول ہوتا رہے اور لوگ آب و دانہ کی تلاش میں کبوتروں کو دانے چگتے ہوئے دیکھ کر محفوظ ہوتے رہیں۔ یہ صورت حال رہی تو لوگ اپنے ووٹ بیچ دیں گے۔ اور ووٹ خریدنے والے اپنے آپ کو۔ اپنی بولی لگانے والے قانون ساز نہیں قانون ساز ہوتے ہیں اور شمع روشن ہی اس درد کے ساتھ کیا کرتے ہیں کہ ”اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات۔ رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے“ اور دل سے دیتے رہتے ہیں کہ اللہ کے ہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے اور سیاست میں ایک رات پانچ سال کی۔۔۔۔۔ کوئی ملک الرائے، کوئی اہل الرائے، کوئی عیال الرائے برائے منائے کہ زخم دکھانا کسی رواج میں بھی گستاخی نہیں ہوتی۔ زخم پر مرہم نہ رکھنا بے دردی ضرور ہے، بالخصوص جب زخم ریس بھی رہا ہو۔ سیاست دانوں کو ووٹ نہیں ملتے، کوئی باعث حیرت امر نہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ لوگوں کو اپنے بچوں کے لئے ایک پاؤ دودھ خالص ایک چھٹانک وہ چیز جسے کبھی گھی کہا کرتے تھے، میسر نہیں۔ مہنگائی کے صدقے اچھا خاصا کھاتے لوگ بھی اپنے گھروں میں نکھٹو کھواتے ہیں۔ اوپر سے الیکشن کا زمانہ آگیا ہے۔ امیدوار اولاد کے رشتے بھی یہ دریافت کر کے طے کرتے نظر آنے لگے ہیں کہ ماشاء اللہ گھر کے کتنے ووٹ ہوں گے۔ کوئی دن آتا ہے، خاوندوں کی دعائیں ہوں گی، یا اللہ تو اولاد دے نہ دے، بیوی کا ووٹ لپکا رکھنا۔ بیویاں مزاروں پر دعا گو ہوں گی، اور جو کچھ بھی ہو خاوند کی مجھے ووٹ دینے کی نیت خراب نہ ہو۔

صرف اس دن اسے تندرست رکھنا۔ کدورتیں، نفرتیں، محاصمتیں جو معزنی
 جمہوری طریق انتخاب عطا کرے گا، اس کے پیش نظریہ کہنا کوئی پیش گوئی نہیں
 کہ انتخابات کا سب سے زیادہ مالی فائدہ چند کیلوں اور اس کا دس فیصد ان کے
 منشیوں کو ہوگا۔ سیاست بے ہوش کا جوش مایوس گہرائیوں میں اتر جائے گا
 اور غائبوں کو بہت دیر کے بعد یہ معلوم ہوگا کہ تلنگے کے گھوڑے کے
 سینے پر بندے کا موجود رہنا کیوں ضروری ہوتا ہے اور گھوڑوں کو گرمی کے
 موسم میں کارپوریشن کی لگائی ہوئی سبیل کا قائم مقام کیوں نہیں بھولتا۔ اور اگر
 اعلان شدہ اسلامی حکومت کے انتخابی منشور پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی سرزد
 ہوگئی تو لاکھ نیک خواہشات کے باوجود اصل مارشل لا نہیں اٹھایا جاسکے گا۔ بلکہ
 مارشل لا کی لفٹ کے بغیر منازل عمارت حکومت کی تمام باقی ماندہ سیرٹھیاں ناکارہ ہو
 کر رہ جائیں گی۔ نظام مشاورت کے بغیر عوام اور حکومت کے درمیان رابطے قائم ہو سکتے ہیں
 نہ انسانی حریت میسر ہو سکتی ہے، نہ حاکمیت الہی کا نفاذ ممکن ہے۔ اگر ہوتا تو
 اللہ تعالیٰ امر ہم شوریٰ بینہم کا حکم نہ فرماتے اور میکا ولی حامل وحی قرار پا گیا ہوتا۔



ویرمیر یا کرسی کہندی آ

بے حمیت و بے ترتیب، سرمایہ کارانہ و جاگیر دارانہ، پیشہ و سیاسی اجارہ داری، کہ وطن عزیز میں جس کی پرورش زیر آئین بھی رہی، بالائے آئین بھی اور بغیر آئین بھی، ان دنوں شب و روز عمداً ۱۲ اگست کے اعلان صدر کونسیسی صدر ہی کے لئے سڈراہ بنا دینے کی غرض سے مقید طوطوں اور پابند قفس میناؤں کی طرح اس لئے ڈمرا رہی ہے کہ خود صدر بھی بھول جائیں کہ یہ وہی اعلان ہے جس کے صادر ہونے پر ان ہی سیاست کاروں نے صدمہ دفعہ لاحول و نعوذ پڑھا تھا اور وہ ملک گیر تحریک چلانے کی ٹھانی تھی جو ان ہی کی نیتوں کے طفیل صرف ایک صوبہ کی قلیل اور بھارت کی "اندر آ" صوابدید کو متحرک کر سکی۔ اندرونی میر خوار ہوئے اور زنا رپوش کرپانوں کی زد میں آگئے۔ غرضیکہ "وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گدار کے" وارد ہوا۔ اور یہ تحریک لغتِ سیاست پاکستان میں، محرومیت، خود مختاری و کنفیڈریشن کے الفاظ کا اضافہ کر کے خاموش نفرتوں میں ڈھل گئی۔ ۱۲ اگست کے اعلان کی تعمیل کا شور و غوغا اس لئے کیا جا رہا ہے کہ اعلاناتِ ملتان و پشاور کی بانگِ درانقا خانہ میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائیں اور نہایت پُرکاری سے انتخابات یوں منعقد کروائے جائیں جیسے مگنر بنیا سادہ لوح کاشتکار سے حصولِ قرض کی دستاویز پر انگوٹھا لگوا لیتا ہے اور

دستاویز کے تجوری میں بند ہو جانے تک آنکھوں کی طوطا چشتی ظاہر نہیں ہونے
 دیتا۔ بدیں حالات ملتان کے اعلان میں فکر اقبال ح کے اثبات اور مغربی جمہوریت
 کی نفی اور لپشاور کے انتخابی منشور کے تمام تر نکات جو بعدہ ڈیو کر لسی کی ہمزاد
 بیورو کر لسی کی پڑکار شورسی کر لسی کی طفیل نورہ گئے اور نو دو گیارہ نہ ہو سکے جناب صد
 کو یاد نہ دلانا ملک و معاشرہ کے ساتھ فکری بے انصافی ہوگی۔ ان اعلانات کے نتائج
 کو سرمایہ کار پیشہ و سیاست کے لئے پیامِ مرگِ ناگہاں جان تمام تر ذہانتِ حیلہ ساز
 کو مجتمع کر کے ان کی افراد کے ایما پر، جن کی رقابت و منافرتِ سیاست نے علیحدگی کی
 سرحدوں پر سجدہ ریز ہونے کی ٹھان لی تھی۔ قومی یک جہتی کے حسین غلاف میں ”کتاب
 جمہوریتِ غرب“، صدر مملکت کے ہاتھوں میں تھام دینے کی بھرپور کاوش کی۔ مگر کرنا
 خدا کا کہ جو ہاتھ یہ کتاب تھامنے کے لئے بڑھے تھے، دعا کے لئے اٹھ گئے اور صدر
 اس جال سے یوں نکل گئے کہ شاید انہیں بھی معلوم نہ ہو کہ کیا ہوا، کیوں کر ہو۔ یہ خیال
 آرائی دراصل ”ویر میریا کرسی کہندی آ۔ ایہ نام نبی دالیندی آ۔ ویر میریا کرسی!“
 کی دھنوں پر تھی۔ جو نغمہ خوانوں کے طلبچیوں کا ساتھ نہ دے سکی اور یوں ”جگنی“ رات
 کی تاریکیوں میں ڈوب گئی۔ ہر چند کہ تاریخ بارہا ثابت کر چکی کہ خدا بہترین حیلہ ساز
 ہے اور قدرت غیر فطری موجدانِ فکر کے ہر نقش کو معدوم کرنے کی بھرپور صلاحیت
 رکھتی ہے۔ مگر حیلہ ساز انسان پھر بھی باز نہیں آتا۔ فکری الجھاؤ میں گرفتار زمانہ
 آگاہ بھی رہے اور گواہ بھی کہ نگاہِ فطرت میں سیاست و عسا کر متقابل نہیں، آئین
 اسلام اور مغربی جمہوریت دو بدو ہیں۔ مغربی جمہوریت آئینہ رو ہے اور اسلام ابھی
 فقط نیک خو، بعض مسلمان آئینہ ایام میں اسلام کا عکس نمایاں کرنے کی بجائے
 مغربی جمہوریت کے عارض پر بل کھائی زلف بے گرہ کو دیکھ کر وعظ کناں ہیں کہ اگر
 ”لا“ کو دیکھو۔ کتنی دل آویز ہے، کتنی ایمان پرور، کتنی راہِ غائے تمکین ہوش

کتنی گریہ گیر کہ اس کا ہر صیاد اس کے دام میں گرفتار درم درم لپکارتا اور تجوری پر
 ہاتھ رکھ کر قسمیں کھا رہا ہے کہ جی کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا کہ شام گیا۔ اسلامی انتخابی
 منشور کے نو لکات کو سیاستِ آخرِ شب کے نوستاروں اور بوجہ کار خود ڈوبے ہوئے
 قمر کے خون آلود شفق کی افق تابوں سے محفوظ رکھنا ہر محبِ وطن کا فرض ہے۔ قبل اس
 کے کہ فطرت جان لیوا کرب کے باوجود موجودہ دور کے لم پید و لم یولد ہونے کا اعلان
 کرے۔ طعن و تشنیع، تنقید و تحریف سے بالاتر ہو کر حالات سے باخبر رہنا اور
 صراطِ مستقیم کو تاریک و معدوم نہ ہونے دینا ہر اُس مسلمان کا فرض ہے جسے میدانِ
 حشر اور سامانِ حشر پر یقین ہے۔ تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کا ایوانِ اقتدار سے فردِ واحد
 کے انخلاء کے مطالبہ کی حد تک سکر جانا، ثانوی مسئلہ قرار پانا، اُسی کو دیکھ کر
 جیتے ہیں جس کا فرسے دم لکھے اور "ہائے اُس زود پشیمان کا پشیمان ہونا" کی سیاست
 و فراست کا وارد ہونا۔ اول احتساب اما بعد انتخاب کی التجا، قاصد کے ساتھ ساتھ
 تابہ کوئے رقیب جانا اور سر کے بل لوٹ کر آنا، سیاہ دوپٹوں کے زندہ خطرات کا
 ہیبت ناک بھوت بن کر کھلی آنکھ خواہوں میں دکھائی دینا۔ دستارِ واعظ کا مے خانے
 کی چوکھٹ پر پایا جانا، اذہان کے خوف کا دلوں میں لٹک جانا۔ نالے کا پابند نہ
 رہنا۔ باہمی ٹوٹ پھوٹ کا توڑ پھوڑ کے لئے رضا مند ہو کر سیاسی مرہٹوں کی طرح بغل گیر
 ہونے کے لئے بازو پھیلانا۔ بغلیں جھانکتے ہوئے بغل گیر ہو جانا، ایسے ناقابلِ یقین
 سانحاتِ فکر و عمل ہیں جیسے کھنڈر سے پانی میں پتھر پھینک رہے ہوں اور خلقِ خدا
 انہیں دانشور گردان رہی ہو۔ ایسے ہی کئی اور واقعات ہیں جنہیں عنوانِ نصیب نہ
 ہو سکے۔ تحفظِ ختمِ نبوت کے پردے میں منسوخی آئین اور بالجبر انتقالِ اقتدار کے لئے
 "مرزائی راہِ دہندہ" گٹھ جوڑ کے صلے میں مایوسی و محرومی کو تاریخ کس کی بد بختی اور کس
 کی خوش بختی قرار دے۔ اور اس عمل کا عنوان کیا ہو کہ لڑکوں اور لڑکوں کا رعب

جاتے ہوئے سیاسی جگنو دم سیدھی بھی نہ کرنے پائے تھے کہ سویر ہو گئی اور دم
 سادھنا پڑا۔ اسلامی سربراہی کانفرنس میں گونجتی ہوئی آواز کا گلا رندھ دینے کے لئے
 مشترکہ یہودی واشتراکی سازش کے کمانڈر ابھی تسے ہی باندھ رہے تھے کہ پستہ
 سیاست کے کفن میں بطرز اعجاز ایک کیل گڑ گئی۔ ان تمام ناکامیوں کے بعد اور باوجود
 بارہ اگست کے اعلان پر عمل درآمد کا تقاضا خالی از علت اس لئے نہیں کہ آئین میں
 عسکری کردار کے تعین کے معترض مخالفین یقیناً یہ نہیں بھول گئے ہیں کہ اس اعلان
 کے ساتھ آئین میں کچھ ترمیم کا ذکر بھی تھا۔ جس پر عمل درآمد کے بعد سیاست و ملازمت
 میں صرف لفظوں اور ہجوں کا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ اردو بازار میں کتابیں فروخت
 ہونے سے اردو زبان غیر لشکری نہیں ہو جاتی۔ اردو یہ کہے کہ میں لشکر نواز نہیں
 تو ہم سادہ لوح تو یقین کر لیں گے مگر اردو لغت کو یقین نہیں آئے گا۔ اقتدار
 کٹی میں موہوم سی شرکت کے عمل کو انتقال اقتدار کا عمل تصور کر لینے کے رجحان کو
 خود فریبی یا کسی بڑی سازش کے لئے عملی بنیاد کا نام دیں۔ پیشہ در اجارہ دار سیاست
 کتنی ہوشیار ہوتی ہے، اس کا اندازہ تو مجلس شوریٰ میں مخالف سیاسی جماعتوں
 کے اراکین کی تعداد سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ پیشہ ور سیاست کاری مجلس شوریٰ
 میں نہ جبراً نہ سہواً داخل ہوئی، اور نہ آئندہ غیر پائندہ انتخابات میں اپنا کام
 دکھائے بغیر رہے گی۔ چنانچہ جن لوگوں نے لنگر توڑ دیئے تھے، وہ لنگوٹے دھلوا
 رہے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ پہلوان ہیں جنہیں اٹھا کر اکھاڑے میں لایا جائے گا اور
 انشاء اللہ اٹھا کر ہی لے جایا جائے گا۔ سورج نکلنا دیکھ کر جو وفاداری بدل جائے،
 اس کی اصلیت عشا سے پہلے ہی کھل جایا کرتی ہے۔ نصف النہار کے پجاری لازماً
 نصف شب کے لقب زن نہ ہوتے تو تاریخ نے وزیروں سے زیادہ شب بیدار
 غریب چوکیداروں پر اعتماد نہ کیا ہوتا۔ افسوس ہے کہ یہ مد نظر نہ رہا کہ قرض خواہ

سیاسی سود خوروں کے منشی مصدیوں کو کھیتوں کے نگہبان مقرر کرنا ایک عام دہقان کو بھی کن مصائب اور ہولناک نتائج میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سیاسی مرقدوں کے اسی سرمایہ نے کفن میں آخری کیل لگانے والے کو کفن کے لئے آخری کیل کی تلاش کی بجائے آخری کیل کے لئے کفن کی تلاش میں لگا رکھا ہے۔ اور جو روزِ طلوع ہونا چاہیے تھا اُسے غروب کی گودی میں بہلایا جا رہا ہے۔ تدفین میں التوا و تاخیر سے میت جوان نہیں ہو جایا کرتی۔ بیٹوں کی درازی عمر کے لئے دعا کرنا کارِ حیات کے اجر کو روکنا اور اس کے لئے دوا مہیا کرنا فرعون کو ہی نہیں عملِ قارون کو بھی محفوظ کرنا ہے۔ انتخابات اور انتخابی عمل کے اجرا کا جو کوئی مخالف ہے، واجب ہے کہ اس کا منہ کالا کر کے اُسے آرائشی آئینوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ تقاضائے وقت ہے کہ انتخابات ہونا چاہئیں۔ بہت پہلے ہو جانا چاہئیں تھے۔ اُس وقت سے بھی پہلے جب ان کے التوا کے لئے عرضیاں گزار سی جا رہی تھیں۔ تاکہ مثبت نتائج نہ بھی ہوتے تو بھی آج چوتھے مارشل لاء کے سال تو شمار ہو رہے ہوتے۔ تاہم اس پر بھی غور لازم رہے کہ دیر آید کا درست آنا تو شاید لازم ہو، دردِ دست ہونا تو کوئی ضروری نہیں اور پھر سیاسی اقتدار کوئی بٹیر نہیں ہوتا اور نہ سیاسی انصاف اندھا ہوتا ہے۔ بارہ اگست کے اعلان کے مطابق انتخابات کا انعقاد اول تو ممکن ہی نہیں۔ اس لئے نہیں کہ کسی کی نیت درست نہیں، اس لئے کہ سیاست سمت بگاڑ رہی ہے۔ حالات ہی کی نہیں خود انتخابات کی نیت خراب ہے اور اس لئے بھی کہ مغربی جمہوری امیدواری کی نیت کے خرابے تو فرشتے بھی آباد نہ کر سکے، کسی اور کی تو بساط ہی کیا ہے۔ اور پھر ہماری سیاست جو ٹریک کے لئے ہل خریدنے نکلی تھی ٹینک خرید لائی۔ اور اب کون محب وطن چاہے گا کہ وہ کچھ وجود میں آجائے جو قیامِ پاکستان کے مخالف سیاست دانوں کے تصور میں جنم لے چکا ہے۔ استحکامِ اقتدار و وطن تو گجا انتخابی "پھلے" کے دن گزارنا

ہو جائیں گے۔ پاکستان کا صحیح و سالم و صحت مند مستقبل متقاضی ہے تبدیلی نظام
 حکومت کا۔ بندوں کی حاکمیت کے ختم شریف اور نفاذ حاکمیت الہی، بندوں کی
 حکومت کو بندوں کی خلافت میں تبدیل کرنے کا۔ انسانوں کو صرف پیشہ ور سرمایہ دارانہ
 اجارہ داری کے شکنجوں سے آزاد کروانے کا ہی نہیں، بندوں کو بندوں کی ہر قسم کی
 غلامی سے آزاد کروانے کا۔ عام حریت انسان کے وارد کرنے کا۔ اپنے مفاد کے لئے
 بنائے ہوئے چند انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی گرفت سے سسکتی ہوئی انسانیت کو
 آزاد کروانے کا۔ سرمایہ داروں کی جنگ زرگری کو حرام قرار دینے کا۔ حاکموں کو اللہ
 کا اطاعت گزار بنانے کا۔ نیک و بد اور نیکی و بدی میں تمیز کا انسانی اہلیتوں کے احترام
 کا۔ طاغونی طاقتوں اور ان کے وسائل کے انہدام کا۔ زمانے کو نہ ہر فن مولادار کا ہے
 نہ جرنیل سنگھ، تنازعہ حاکم وقت اور سیاست دانوں کا نہیں، مغربی جمہوریت اور
 اسلام کا ہے۔ مغربی جمہور می دیو استبداد کھجور کے سائے تلے دوپہر گزارتے
 ہوئے فاروق پر شہہ لگاٹے بیٹھا ہے، مشکیزہ اٹھائے گھروں میں پانی مہیا کرتے
 ہوئے خلیفہ وقت پر کمان تانے ہوئے ہے، کاش اپنے ماتھے پر سجدوں کے واضح
 نشان لئے ہوئے زمام کار بست جان سکیں کہ مطالبہ دراصل انتقال اقتدار کا نہیں،
 حصول ذرائع استبداد کا ہے۔ یہ آوازیں جو ہم سن رہے ہیں، دلوں کی دھڑکنوں کی
 نہیں ہیں، مضمیروں کی راکھ کی آندھیوں کی سائیں سائیں ہے۔ بارہ اگست کے اعلان
 کے واسطے سے سیاسی سیزر اعلان جنگ فرما رہے ہیں۔ یہ طبل سکوت توڑنے کے لئے
 نہیں، سقوط برپا کرنے کے لئے بجائے جا رہے ہیں۔ بارہ اگست کے اعلان انتخاب
 پر عمل ہونا چاہیے۔ لازماً ہونا چاہیے مگر اعلاناتِ طمان و پشاور کے ساتھ ساتھ اگر
 ایسا نہ کیا گیا تو ہر بروٹس، آگٹس بن بیٹھے گا اور ڈولپوں کے بانس جنازے اٹھانے
 کے لئے استعمال کرنا پڑیں گے۔ کسی کو سیاست کے ان بت ہائے نازک بدن کے پاؤں

بھی دابنا ہوں گے۔ جنہیں خوابوں میں غیروں سے ملنے کی عادت ہے۔ اور اگر بارہ
 اگست کے اعلان پر ملتان اور پشاور کے اعلانات کے واسطے سے عمل کیا گیا تو
 پیش گوئی ہی جائیے، ایک واویلا جس کے مقدر میں ریلا بننا نہیں ہوگا۔ محترمہ
 کے لئے بلبلائے گا کہ انگریز کھٹے ہیں۔۔۔۔ اور انگریز پک چکے ہوں گے۔ اسے زمام
 بدست۔ تجھے مزارِ نبیؐ پر تیری رقتِ قلب اور دعا کے لئے اٹھائے ہوئے ہاتھوں
 کا واسطہ، مغربی جمہوری نظام کے اعادہ کا اہتمام نہ کرنا کہ تیرے وطن کے متوسط
 طبقہ کو، کہ دانش و خلوص و راسخ الاعتقاد سی جن کی ملک و سرمایہ ہوتی ہے، انتخابی مہم
 جوٹی کے لئے لاکھوں روپے میسر نہیں۔ ناجائز اسلحہ بھی نہیں کرائے کے متشدد
 بھی نہیں۔ دھاندلی کا سلیقہ بھی نہیں۔ خفیہ سازشوں اور گٹھ جوڑ کا اسلوب بھی نہیں۔
 نہ دوٹوں کی گدائی نہ ان کی خرید و تجارت ان کے بس کا روگ ہے۔ یہ نہ ضمیر فروش
 ہیں، نہ دانش فروش، وطن کی مٹی سونگھ لیتے ہیں اور تصور حیات میں گلشن بسا لیتے ہیں۔
 سرمایہ دارانہ سیاست آج تک ان کا استحصال کر کے ان سے دریاں بچھواتی اور
 شامیانے لگواتی رہی۔ شادی ہوئی تو ان سے بلبے بجا لئے، مرگ ہوئی تو مفت
 میت نہلوالی اور قبر بھی کھدوالی۔ متوسط طبقہ کو اپنی خواہشات کو سلجھانے، تمناؤں
 کو بہلانے، دلائل کو مسخر کرنے اور قلب و ضمیر سے مسخر ہو جانے کا فن آتا ہے۔ ان کی
 اہلیتیں وطن کی بہبودی کے لئے استعمال ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ مگر سرمایہ داروں
 کے نیلام گھروں میں صرف غداری پر بولی لگائی جاتی ہے ان کی نمائش گا ہوں میں پس پردہ
 سازش کے ذریعہ شاہ گری اور خوشامد کے ذریعے مسز آرائی کے قمار خانے سیاسی "سکل گیم"
 کے نام پر کھولے جاتے ہیں۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب روارکھا گیا تو وطن عزیز کے
 اصل سرمایہ کو کوڑے کے ڈھیروں پر پھینک دیا جائے گا اور ایوان سامان خود کشی
 سے سجا دیئے جائیں گے۔ خفیہ رائے دہی کا مروجہ جمہوری طریقہ اپنی اصل میں ضمیر و قلب

کو سر بھر کرنے کا عمل ہے، آزادی ضمیر کا نہیں۔ اسے آزادی ضمیر کہنا بہت بڑا فریب ہے۔ اس عمل سے ہر انسان کے اندر ایک پورا جاگ اٹھتا ہے۔ ہر وہ پارسانی جس کا تخلیقہ محبوب ہو، بند قبا سے پہچانی جاتی ہے، طرہ و دستار سے نہیں۔ وطن عزیز کو مثبت سیاست کی راہوں پر ڈالتے اور افرنگ زدہ دانش کونیکی اور بدی میں تمیز کے ڈھنگ سکھانے کے لئے نیک و بد کی پہچان کا سلیقہ واضح کرنے کے لئے لازم ہے کہ اعلانِ پشاور کی روشنی میں رائے دہندگان کی فہرستیں از سر نو ترتیب دی جائیں۔ عہدہ طلبی، امیدواری اور ہم جوئی کا قلع قمع نہ ہوا اور پتیا ہوں روزِ عید و شبِ مہتاب میں کی رعایت دے دی گئی تو کسی سیاسی یا اخلاقی ارتقا، کسی اتحادِ ملی کی تمنا عبث ہے اور اگر یوں ہی رہا تو نیلامِ یوسف جاری رہے گا۔ اور ہر دیدہ بینا کی حقیقت فقط روزنِ دیوارِ زنداں ہو کر رہ جائے گی۔ یہ دیوارِ زنداں کے روزن ہی تو ہوتے ہیں جن سے عوامِ سرمایہ دار منتخب شدہ نمائندوں کے جشنِ فتح کے جلوس دیکھا کرتے ہیں۔ عہدہ طلبی و ہم جوئی سے پیدا شدہ مخاصمت و کدورت معاشرہ کا کینسر ہے۔ ہر عہدہ طلب ہم جو خائن بھی ہوتا ہے اور قارونِ خصلت بھی۔ مملکتِ اسلامیہ کو مشاورت کے وسیلہ سے امیر مملکت کا متفقہ انتخاب اپنی سالمیت کے لئے درکار ہے۔ یہ مقصد عہدہ طلبی سے نہیں، اصولِ مشاورت و بیعت اپنانے سے حاصل ہوگا۔ مروجہ طریقِ انتخابِ اصولِ بیعت کی واضح نفی ہے۔ کرتہ تراشنے اور کرتہ پھاڑنے میں فرق جانئے۔ یہ عہدہ طلب ہی ہیں جو سازشوں کے موجد ہوتے ہیں۔ ایسا نظام موجود ہے کہ عہدہ طلب نہ کیا جائے بلکہ پوری ملت کے باہم مشورہ سے پیش کیا جائے۔ عہدہ حاصل ہو جانے پر جشنِ منانے والے اور عہدہ پیش ہونے پر گریاں و لرزاں ہو جانے والے مختلف نظام ہائے سیاست کی پیداوار ہوتے ہیں۔ گداگری اور انعام یافتہ ہونے میں کچھ فرق تو ہوتا ہوگا۔ مشورہ کے دوران اختلاف

رائے اگر یک رائے ہونے کی غرض سے ہو تو عین رحمت ہے ورنہ "ر" چلا اٹھتی ہے۔ مجھ پر نکتہ بھی ڈالو اور نقطہ بھی کہ میں ننگی ہوں۔ بحث بغرض اختلاف تفرقات و تعصبات کی حاتم طائی ہوتی ہے۔ تفرقہ بازی سماجی ہو یا مذہبی، نہ از روئے قرآن جائز ہے نہ از روئے حدیث، پھر یہ سبھی کچھ کس کی پیروی میں ہو رہا ہے۔ ایسا نظام برپا کرنے کے لئے جو انسانی حاکم کو خلیفہ بنا دے، بندوں کی حکومت کو خلافت میں تبدیل کر دے، حاکموں کو اطاعت گزار بنا دے، اس وقت تک راج نہیں کیا جا سکتا جب تک مروجہ مفسدانہ انتخابی قوانین یکسر منسوخ کر کے اسلام کی شرعی انتخاب نافذ نہیں کی جاتی جس کی نشان دہی پشاور کے اس انتخابی منشور میں موجود ہے جسے سن کر باوجود دیگر اختلافات کے ہم جیسے بے غرضوں کو بھی صاد کہنا پڑا تھا۔ اگر اسلامی ریاست وجود میں لانا مقصود ہے تو ہر کار حکومت میں تمام شہریوں کے بلاواسطہ مشورہ کے نظام کا قیام از بس ضروری ہے۔ اور اگر بندوں کے اقتدار کی جنگ زرگری ہی برپا کرنا ہے تو یہاں پہلے کون سا انسان ہے جس کا رداں رداں نہ پکار رہا ہو کہ یہ جہاں عجب جہاں ہے، نہ قفس نہ آشیانہ۔ قوم سے جو کوئی بھی انسانی اقتدار کی یہ جنگ لڑوائے گا، وہ بالآخر معاشرہ کو خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے پائے گا۔ یہ تحریر لکھ دی ہے تاکہ سندر ہے۔



جناب صدائے تاریخ نے قلم اٹھالیا ہے

ایک ہی فضا میں شاہین و کرگس کی پرواز کے انداز ہی مختلف نہیں ہوتے، مقاصد بھی جدا گانہ ہوتے ہیں۔ اگر پرندوں کے بھی نظریات ہوتے ہیں، جانوروں کا بھی نکتہ نظر ہوتا ہے تو ”شکارِ مردہ سزاوار شاہساز نہیں“ کے کلیہ کے پیش نظر یہ امر کسی شہادت کا محتاج نہیں کہ شاہین و کرگس میں نظریاتی اختلاف بھی ہوتا ہے۔ الفاظ و معانی میں تفاوت نہ بھی ہو، پھر بھی ”ملاں کی اذان اور — مجاہد کی اذان اور“ کی دلیل لائیں تو لازماً ایک جانب نگاہیں جھک جاتی ہیں اور دوسری طرف افتخار چھپاتی پھیلا لیتا ہے کہ ملا اور مجاہد کی فکر میں رہبانیت اور جہاد کے تفاوت کی وجہ سے ”انی اکبر“ اور ”اللہ اکبر“ میں عملاً فرق کا واقع ہو جانا لازمی امر ہے۔ اسلام کے ”نظامِ حریت“ اور مغرب کے نظامِ جمہوریت کی آمیزش سے تیار شدہ جو مشروب سیاسی عطائی عطار ”داروئے امراضِ سیاست“ کے لیبل لگا کر اپنی الساد فروشی کی دکانوں کے لادین نظارہ کشوں میں گزشتہ ۳۶ سال سے سجائے بیٹھے ہیں، وہ دراصل ایسی میٹھی نشہ آور شراب ہے جسے چکھتے ہی انسان اپنی حاکمیت کی ”برکیں“ مارنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی عبدیت کے کفن میں کبر و نخوت کی میخیں گر جاتی ہیں۔ اور پوری قوم کے کندھوں پر درباری خادموں

کے سر نصب ہو جاتے ہیں۔ پھر اللہ کی حاکمیت کے پردے میں بندوں کی حاکمیت کا قیام، یا حاکمیتِ الہی میں بندوں کی شرکت، انسان کو الہ اور نعوذ باللہ اللہ کو انسان گرداننے، درونِ بیت اللہ صنم تراشی، اپنے ہی سائیوں کے رو برو کو ع اور اپنے آپ کو سجدہ کرنے کے مکروہ و گمراہ کن عمل کے سوا اور کچھ ہے تو وہ شہنشاہِ اکبر کا اللہ اکبر جل جلالہ گڑ گڑا اٹھنا ہے۔ گڑ گڑا اس لئے کہ انسان بزعم خود خدا تو بن جاتا ہے مگر بندہ ہونے کے احساس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ہر مصنوعی اکڑ میں لرز اور فوں میں ارتعاشِ عجز کا شمول لازمی اور فطری عمل ہے۔ جو انتہائی زور سے بولے گا اس کی آواز پھٹے گی۔ بیرونی انسانی خطرات سے حفاظت کے لئے قلعے تعمیر کئے جاسکتے ہیں، اپنے ہی اندر کی سنگساری سے کوئی انسان محفوظ نہیں۔ فقیر راہ نشین ہو یا شاہِ تخت نشین۔ انسانی اور الہی حاکمیت کی آمیزش کا بنیادی عمل ہمارے ہاں وہ مغربی جمہوری طریق انتخاب ہے جس کے نتیجے میں ہم تلاشِ خدا کے لئے بندوں کے پاؤں چھونے کا رواج استوار کئے بیٹھے ہیں اور تسبیح کے دانے نوکِ خنجر سے شمار کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس خنجر کو زہر آلود کر کے ہمارے دانشور اس کی میان پر حق بالغ رائے دہی تحریر کر کے آئین و دستور کی جھولی میں یوں ڈال دیتے ہیں کہ فرارِ دامِ مقاصد سے لہو ٹپکنے لگتا ہے اور پھر اس پر بھی دلیل لائی جاتی ہے کہ یہ طریق انتخاب حاکمان و قانون سازان، اسلام کے بنیادی اصول اور شاہدِ ہم فی الامر اور وامرہم شوریٰ بینہم کے عین مطابق ہے۔ ہر چند کہ یہ طریق انتخاب کوچہ رقیب میں سر کے بل جانے کے مترادف ہے۔ جنسی بلوغت، عہدہ طلبی، ہم جوئی، فکری اغوا، حرص و آرزو دہی، قارونیت و فرعونیت کی مضبوط گرفت میں جکڑا رہتا ہے۔ اور تمام تر عمل میں نہ مشاورت کا کوئی مقام ہوتا ہے، نہ

لمحات وقوع۔ بس ایک کھرام ہے۔ جس کی افرا تفری میں اندھے سرمہ بیچ جاتے ہیں، مصنوعی دانت لگانے والے منجن فروخت کر لیتے ہیں اور خضاسب کی خوبیاں گنوا کر بال صفا لوگوں کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا ہے۔ کہ لو انتخاب کے آئندہ روز گھر والوں سے پوچھ لینا کہ کہاں نہاؤں، کیا دھوؤں اور کیا نچوڑوں۔ فقیر بے تقصیر نہ فقیر مصالحت بین ہے نہ رند بادہ خوار۔ نہ معلوم کون سی مستی ہے کہ سچی بات اس کے منہ سے نکل جاتی ہے۔ چشم خلق روشن ہو تو دل ماشاد ہو جاتا ہے۔ دعوت دیتا ہے کہ ہر وہ نوا ایجاد فتویٰ جو لادینی یا دینی سیاست کی پٹاری میں ہے اس پر عائد کر دیا جائے مگر وہ بہ بانگ دہل یہ تقصیر بالذت اپنے ذمہ لئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ برملا اعلان کرے کہ جس طریق انتخاب میں مشاورت نخست اول و آخر کے طور پر نمایاں نہ ہو وہ اسلام کا مجوزہ طریق انتخاب نہیں۔ اور جنہیں یہ گمان ہے کہ اسلام میں کوئی خاص طریق انتخاب متعین نہیں، وہ یہ جان لیں کہ ان کی آن گم شدہ ہی نہیں اغوا شدہ بھی قرار پائے گی۔ یہ نافرمانی اسلام کے بنیادی اصولوں کی بیخ کنی ہے۔ اسلام کے اصولوں کے مطابق ہونے والے انتخابات میں مشاورت جزو لازم اور عمل ملزوم ہے۔ اس مشاورت میں نفس امارہ کو پالتو بنائے رکھنے کے اہل، ذہنی شرارتوں، سازشوں اور سوسپل کو قوت ایمان سے تسخیر کئے ہوئے شہری، جنہیں عرف عام میں اہل رائے کہا جاتا ہے، ہر اقدام، ہر مرحلہ اور ہر عمل کے دوران شامل رہتے ہیں، شامل رکھنا ہوتے ہیں۔ اسلام کے آئین مملکت کی رو سے ہر اہل رائے جسے آج کی اصلاح میں ووٹر قرار دیا جاتا ہے، امور مملکت میں مسلسل و متواتر مشورہ کناں رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ چار پانچ سال بعد ہر نوع کی فریب دہی سے متاثر کر کے اس کی تبصہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ایک پرچی انگلیوں میں تھما دی کہ لو! چھپا کر رازداری

سے کسی رائے بند سر بھر صندوقچی میں ڈال آؤ کہ نہ کوئی آنکھوں آنکھ دیکھ سکے نہ کانوں کان خبر لگے۔ اور آتا بعد فوراً نمائندہ آئندہ نما قرار پائے اور یوں قومی زندگی میں گزشتہ را احتیاط اور آئندہ را صلوات کا عمل جاری رہے۔ آج کی زبان بھی استعمال کریں تو اسلام کا طریق انتخاب امور مملکت میں ایک ایسے مسلسل مستحکم ریفرنڈم کی بنا قائم کرتا ہے جس میں مشاورت ضمنی اول قرار پاتی ہے۔ جس عمل میں، جس امر میں مشاورت معدوم ہو یا اس کی نفی کر دی گئی ہو، اس کا ما حاصل ”ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری“ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ مصرع مغربی طرز انتخاب کے وجود میں لائے ہوئے ہر وزیر کے آئینہ پر تحریر ہوتا ہے۔ انسانوں کی دنیا میں نوشتہ دیوار تو شاید کبھی کبھی کوئی ایک آدھ پڑھ لیتا ہے۔ نوشتہ آئینہ کوئی بھی نہیں پڑھتا۔ تاہم ”اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی ولی ہے نہ نصیر“ قلب کی گہرائیوں میں محفوظ لوح پر نمایاں نہ ہو جائے۔ انتخاب فقط مجلس مشاورت کو وجود میں لانے کا ایک ذریعہ ہی نہیں ایک امر ہے، ایک مرحلہ ہے، ایک مسئلہ ہے جو مملکت کے درپیش آتا ہے۔ اسے مشاورت کے بغیر طے کرنا اور اس کے بعد منتخب شدہ افراد کو مجلس مشاورت کے ارکان گردان لینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سلائی کی مشینوں کی فروخت کی دکان کو درزی خانہ جان کر کپڑا سیلزمین، مشین فروش کو تھما دے اور یہ بھی خیال نہ ہے کہ ناپ تو اس نے نہ لیا نہ مانگا، نہ یہ پوچھا کہ شیردانی سلے گی یا انگریزی سوٹ۔ نہ معلوم کیا تراش ڈالے۔ بغیر گز کے اگر درزی کا کاروبار چل سکتا ہے، اس کی مہارت کی نمائش ہو سکتی ہے، اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو بغیر مشاورت کے انتخاب بھی اسلامی طریق انتخاب کہلا سکتا ہے۔ اور اگر نہیں تو پھر ایسے انتخاب میں رائے دینے سے یہ کہیں

بہتر ہے۔ کہ شہری قسمت کا حال بتانے والا طوطا پال لے، کہ کام تو یوں بھی چل ہی جاتا ہے۔ "امور میں ان سے مشورہ لیا جائے" سے یہ کیونکر مراد ہے کہ ان سے مشورے کا حق چھین کر، نہایت عیاری سے انہیں امور سے لاتعلق کر کے اعزاز مشاورت گنتی کے چند آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے اور ان کا کوئی ایسا چیئر مین مقرر کر دیا جائے جس کی آنکھیں روشنی میں کھلنے کے لئے رنگ دار روشنیوں والی عینک کی محتاج ہوں۔ یا سیاسی تفریقی گروہوں کی بساط سے اٹھائے ہوئے مہرے امیر مملکت کی میز پر سجادیے جائیں کہ یہ آپ کے لئے محذب شیثوں کا کام دیں گے۔ یہ درس کس نے دیا ہے کہ افہام و تفہیم کے بغیر، بحث و تمحیص سے بے تعلق، سمجھے اور سمجھائے بغیر رائے قائم کر لینے کو بھی مشورہ ہی کہتے ہیں۔ دیواروں سے مشورہ تو شاید ہو سکتا ہو کہ ان کے سنا ہے کان ہوتے ہیں۔ مگر شہتیروں سے مشورہ کرتے آج تک نہ تاریخ نے کبھی دیکھا، نہ سنا۔ شہتیر گنتے ہوئے لوگ ضرور پائے گئے ہیں۔ اور پھر شہتیر شاہ کے تیر تو ہو سکتے ہیں، انہیں مشیر تو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ہوتے ہی سر کے اوپر ہیں۔ جس میں بالآخر اتفاق رائے نہ ہو کیا وہ بھی مجلس مشاورت ہوتی ہے۔ مشورہ تو ہوتا ہی یک رائے ہونے کے لئے ہے۔ اختلاف قائم رہے تو مشورہ تو نہ ہوا، صرف اظہار رائے ہوا۔ مشاورت اور کثرت رائے دو متضادم تراکیب ہیں۔ ہر دو باہم کُش ہیں۔ مشورہ کے باوجود اگر اختلاف رائے رہے تو جان لو کہ ابھی سچائی ظاہر نہیں ہوئی۔ اصول کثرت رائے اصول مشاورت کی نفی ہے۔ انہیں سمونے کی کوشش سہو ہی نہیں، اصول بیعت سے ناآشنائی بھی ہے "ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ" مخفی حکمتوں کے خزینے کے صدر دروازہ کی تحریر پیشانی ہے۔ معاملات و امور کے زیر و بم سے بذریعہ افہام و تفہیم اور معروف و منکر سے آشنا ہو جانے کے بعد باہم متفق ہو کر ہاتھوں میں

ہاتھ دے دینے کو بیعت کہتے ہیں۔ ورنہ لوگ رائے دینے جاتے ہیں اور رائے چھنوا کر واپس گھر آجاتے ہیں۔ اختلاف واقع ہو جائے تو بیعت ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ ٹوٹ جائے تو آئین و دستور کے ضمن زمین کر بلا پر تحریر ہونے لگتے ہیں۔ بیعت لینے والا اگر مومن کا ہاتھ نہ رہے تو حسین رضی اللہ عنہ قتل ہو جاتے ہیں۔ اور بیعت دینے والا ہاتھ اگر دست حسین رضی اللہ عنہ نہ ہو تو ہریزید کی حکومت مستحکم بھی ہو جاتی ہے اور رسوائے زمانہ بھی۔ شریعت معدوم ہو جاتی ہے، اعتماد کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ جابر کی سزا اور مجبور یوں کی گالیاں روزِ مہرہ کی شہ سرخیاں بن جاتی ہیں۔ حالات اگر آئینہ دیکھیں تو ہر مغربی ہی نہیں ہر انسان ساختہ طرز حکومت کو مصنوعی مگر عیار میک اپ کی تہوں تلے ہی نقوش اکھرتے نظر آئیں گے۔ نہیں۔ ہم وطنو نہیں۔ مشاورت سے عاری طریق انتخاب و انتظام امور مملکت میں شہریوں کی حیثیت فقط اس درباری مسخرے کی ہوتی ہے جس نے شاہی لباس پہن رکھا ہو۔ اسلام کے نظام مشاورت میں ہر وہ انسان جس نے اپنی عبدیت کی حفاظت کر رکھی ہو، بجائے خود ایک ریاست ہے، ایک آزاد مملکت ہے۔ جو اس معیار کا بندہ حُر نہیں۔ وہ آزاد نہیں، غلام ہے۔ غیروں کا نہ ہو گا، اپنوں کا ہو کر رہ جائے گا۔ یہ بنیاد ہل جائے تو نہ کوئی چار دیواری گھر کھلانے کی مستحق رہتی ہے، نہ افراد خانہ کو خاندان کہا جا سکتا ہے۔ مملکت تو گھروں اور خاندانوں کی وسعت کا نام ہے۔ خاندان کے ہر فرد نے بالآخر اپنا گھر بسانا اور نئے خاندان کی بنا ڈالنا ہوتی ہے، ایک انفرادی ریاست قائم کرنا ہوتی ہے۔ انفرادی ریاست تباہ ہو جائے گی تو اجتماعی ریاست کا رواں رواں دکھنے لگے گا۔ مغربی طریق انتخاب میں مشاورت کی عدم موجودگی نے ہی مغربی معاشرہ سے گھر اور خاندان کا اصلی تصور چھین رکھا ہے۔ تمام رشتے اور سماجی بندھن معدوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ذوق آزادی میں انسان مادرِ پدر آزاد

ہو کر رہ گیا ہے۔ مشاورت ہی باپ کو شفیق اور اولاد کو فرمانبردار بناتی ہے۔ بغیر مشاورت کے صاحبِ رائے ہو جانے والوں کے ماں باپ تنہائیوں میں اپنی کمر اور کوکھ سہلاتے بسورتے رہتے ہیں کہ کاش یہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ ”شادی میں نے کرنا ہے لہذا میری ہی پسند ہوگی۔ میں ہی اہل رائے تسلیم کیا جاؤں“ بڑی پُر زور دلیل ہے۔ لیکن ایسے زور آوروں کے زور ٹوٹتے ہی پائے گئے ہیں۔ ان مواقع پر ماں باپ سے مشورہ کا اصول محض جذباتی نہیں۔ جس طرح مشاورت سالمیت و استحکامِ خاندان کے لئے ضروری ہے، اسی طرح مشاورت استحکامِ ریاست کے لئے بھی لازم ہے۔ مشاورت سے کیا اس لئے کنارہ کش ہو جائیں کہ سیاست بڑی پُر کار ہے۔ اپنے چوزوں پر کسی چیل کو جھپٹتے ہوئے دیکھ کر، یادانہ دُکھا نظر آنے پر مُرغی جو عمل کرتی ہے، اُسے سیاست کہتے ہیں۔ چیل کے عمل کو کسی نعت میں سیاست نہیں گردانا گیا۔ چرواہے کا اس لئے بھینٹوں کو ذبح کر ڈالنا کہ رات کو ان کے چوری ہو جانے کا خدشہ ہے، سیاسی عمل نہیں۔ علی بابا کی آنکھ بچا کر مالِ غنیمت کا حساب لگاتے ہوئے چور سیاست دان نہیں کہے جاسکتے۔ جس نے اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں نہیں دیا، اُسے کوئی حق نہیں کہ مومن اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دے دیں۔ جس نے مومنوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اللہ سے اختلاف کیا، اس کے حکم کے مطابق حکومت نہ کی، اللہ کی قسم وہ ظالم ہے۔ فاسق ہے، کافر ہے۔ جس نے اللہ کی بیعت برقرار رکھی، اُس کے ہاتھ سے جو ہاتھ چھڑالے، کم وہ بھی نہیں۔ وہ نافرمانِ رسولؐ بھی ہے اور قاتلِ حسینؑ بھی۔ نواسہِ رسولؐ کے قتل کے جواز میں ”سہو“ کوئی دلیل نہیں۔ امورِ حیب اللہ کی طرف لوٹائے جائیں تو امور کے صحیح حل اللہ تعالیٰ بندوں میں لٹا دیتے ہیں۔ یہی وہ منبعِ عقل و دانش ہے جس کی طرف ”انی جاعل فی الارض خلیفہ“ کا اعلان اشارہ کر رہا ہے۔ شرفِ آدم آج بھی

خلافتِ الہی ہے۔ دورانِ انتخاب مشاورت سے گریز کی وجہ سے سیاست
مفروزمذموں کا کردار بن کر رہ گئی ہے۔۔ جناب صدر انتخابات میں مشاورت
کے ملزوم ہونے کا اعلان ہم فقروں نے بھی سن لیا اور یقین بھی کر لیا۔ تاریخ
نے سنہری قلم بھی اٹھالیا۔ آپ نے تو انسانوں کے شرفِ خلافت کا اعلان کر دیا
مگر ڈر ہے کہ مشیرانِ بادشاہوں سے لاعلمی کی بنا پر ملزوم مشاورت کی بجائے
مظلوم مشاورت تحریر نہ کر دیں۔ مشتری کی ہوشیار باشی سے پہلے اشتہار ہوشیاری
نہ دکھا جائے۔ مشاورتی انتخابات کا مغربی انتخابات سے دور کا بھی رشتہ نہیں۔
نیویارک، لندن، ماسکو اور مدینہ کے درمیان بڑے طویل فاصلے ہیں۔ مغربی طریق
انتخاب سے زیادہ سے زیادہ رفاہی مملکت وجود میں آتی ہے۔ مشاورتی طریق انتخاب لازماً
فلاحی مملکت کا قیام عمل میں لاتا ہے۔ راستے میں سبیل اللہ دینا، پل تعمیر کر دینا رفاہی
عمل ہے۔ منزل تک پہنچا دینا فلاحی کارکردگی ہے۔ اسلام حج الرفاہ نہیں،
حج علی الفلاح کا پیغامبر ہے۔ اور جو آخری زندگی کا بھی احاطہ نہ کر لے، فلاحی عمل
نہیں۔ اور شاورہم فی الامر، وامرہم شوریٰ، بینہم اللہ کے محکم کلام کا حصہ تو ہیں ہی
موقع ہے، شرفِ عبدیت حاصل کر سکیں تو کر لیں۔



اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے!

یادش بے خیر۔ جونہی خبر چھپی کہ اُسندہ انتخابات کے متعلق وفاقی کابینہ نے غور کیا۔ تمام پیشہ وروں اور ان کے کاسٹ لیسوں کی رالیں خالی تھالیوں میں ٹپکنے لگیں، وفاداروں کی وفا کا فور ہوئی اور جفا شعاروں نے بغیر جھاڑے پھونکے عزاداری کے لئے صفیں بچھا لیں۔ بائیکاٹ نے بلند آوازے تو نہ کئے مگر دو ہتھڑوں اور سینہ کو بی کا شور اس انداز سے بلند کیا کہ اہل اقتدار کا ماتھا بھی ٹھنکنے لگا۔ بظاہر طالبان انتخابات نے عمل انتخاب میں ہر ممکنہ رکاوٹ پیدا کر کے درپردہ اسے ناکام بنانے کا تہیہ کر لیا۔ وفاقی مجلس شوریٰ صوبائی کونسلوں، بلدیاتی اداروں، حتیٰ کہ یونین کونسلوں کا ہر چیئر مین انتخابی امید سے ہو گیا۔ دیواروں پر فلموں، شباب آوردائیوں اور انتخابی امیدواروں کے اشتہارات گڈ مڈ ہو گئے۔ کھوئی جوانی۔ امیدوار قومی اسمبلی، پہلی ہی خوراک۔ امیدوار صوبائی اسمبلی، خادم اسلام۔ مولا جٹ، آپ کا امیدوار۔ جیب کٹرا، قسم کی لاتعداد پہیلیاں دیواروں پر تحریر نظر آنے لگیں۔ کراہیہ کے نعرہ بازوں اور ہٹ بازوں کو بیجانے ادا ہونے لگے۔ ہر تباہ کار نے خادم قوم کا روپ دھار لیا۔ پاکستان دشمن بیرونی طاقتوں نے اپنی اپنی بساط

بھالی کہ بذریعہ انتخاب اگر اپنے مفادات کو محفوظ کیا جاسکے تو کسی دیگر سازش
 یا طاقت آزمائی کی ضرورت نہ رہے گی۔ قیام پاکستان کی مخالف سیاست نے
 انگریزیوں کی کہ لو! طالع آزمائی کا وقت آپہنچا۔ لہذا نسیم جاگو، مگر کو بانڈھو، اٹھاؤ
 بستر کہ رات کم ہے۔ بائیکاٹ سے مراد یہ نہ تھی کہ کوئی سیاسی جماعت
 انتخابات میں حصہ نہ لے گی۔ پرکاری سے بین الاقوامی طور پر یہ تاثر قائم کرنا تھا
 کہ موجودہ انتخاب یکطرفہ غیر سیاسی عمل ہے۔ اور آئندہ قائم ہونے والے
 قانون ساز اداروں کو کوئی سیاسی تہریک حاصل نہیں۔ عالم نزع میں گرفتار
 سیاسی گرگان جہاں دیدہ اپنی معذوری کو چھپانے کے لئے چادر دیکھ کر پاؤں
 پھیلانے کی بجائے آثار زندگی کے مظاہرہ کے لئے چادر میں منہ پھلانے، ٹاسم
 دھنکانے اور بڑبڑانے لگے کہ ہمارا مقابلہ دوران انتخاب نہیں، انتخاب کے
 بعد ہوگا۔ اول تو ہم نہ ہوئے تو برات ہی نہیں چڑھے گی۔ چڑھالی تو بند نہیں
 بچنے دیں گے۔ یا تو تخت بچھا رہ جائے گا یا ڈولی نہیں اٹھے گی۔ اٹھ بھی گئی تو عندالطلب
 حق مہر ہی اتنا ہوگا کہ ادا نہیں ہوگا۔ منہ نہ دیکھا سکو گے۔ اتفاقاً پوسرک بھی گیا تو
 شبِ عروس کا ماحصل طلوعِ صبحِ طلاق کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ نک خواروں
 نے خاندانِ غلاموں کی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنے حواریوں کو کامیاب کرولنے
 کے لئے داؤ بیچ لگانا شروع کر دیئے۔ قطب الدین ایک اور قطب شہید ایک
 ہی سیاسی شخصیت کے دو عرفی نام گردانے جانے لگے۔ اسی عطار کے بیٹے کا
 نسو مجرب قرار پایا جس کے باعث میر سادہ کے دوبارہ بیمار ہو جانے کا یقین تھا۔
 کسی کی رگِ حمیت سیاست اندر آچتا کا طواف کرتے ہوئے پھرک اٹھی تو کسی کو
 روسی ٹینکوں پر روس نواز پاکستانی پرچم لہرانا نزدیک تر نظر آنے لگا۔ پھر سے پیام
 آیا کہ شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی فسادات عملِ انتخاب کو ناکارہ کرنے کا

مؤثر ذریعہ ہیں۔ تو ادھر سے سندیہ آیا، مجلس شوریٰ کے ممبران کو ساتھ ملاؤ۔ ان
 کی وفاداریوں کے دام لگاؤ عین وقت پر استغنیٰ دلواؤ۔ کرنا کار پر داران حکومت
 کا، کہ دیک دم پانسہ پلٹا۔ اعلان ہوا کہ حکومت موجود فی الوجود اپنی سابقہ کارکردگی
 پر بلا واسطہ عوام سے اعتماد حاصل کرے گی۔ جرح کے معیاری اصولوں کے مطابق
 تخت سفید پر یہ سوال لکھا گیا کہ کیا نفاذ اسلام کا سات سالہ عمل صحیح تھا شریکوں
 کو باز رہنا چاہیے۔ اور بمطابق اعلان بارہ اگست ۱۸۲، ۲۳، مارچ ۱۸۴ تک
 انتخابات ہونا چاہئیں۔ اگر ہاں کہو گے تو متصور ہو گا کہ موجودہ صدر مملکت آئندہ
 پانچ سال کے لئے بھی قبول ہیں۔ اور اگر نہ کہو گے تو پھر کیا ہو گا، یہ اندازہ لگانا ہمارے
 غیر سیاست دان ہونے اور بے شعور ہونے کا ثبوت ہو گا۔ یہ سوال کسی سوالی کا نہیں،
 حکمران کا سوال تھا۔ لہذا ہر مسلمان مسئول علیہ پر ”لا تنہر“ لازم۔ سوال کا اٹھنا تھا
 کہ اندرون و بیرون ملک تمام ارادے، تمام ادارے تمام سکیمیں، تمام پروگرام
 تمام پرکاریاں، تمام ہوشیاریاں۔ تمام سیاستیں برف پوش ہو گئیں۔ کٹے دھرے
 پر طوفان پل پڑا، ہر نامے پر تحریر حرف سر پٹ، چوپٹ پڑھا جانے لگا۔ مگر اعلان
 ریفرنڈم کرتے وقت شاید ادھر دھیان نہ لگا کہ مغربی جمہوریت کا خاصہ ہے
 کہ اقتدار لینا ہو تو خوشاد اور مل جائے تو سازش اس کے ضمیر
 اور خمیر میں شامل ہے۔ نیز یہ کہ بیوروکریسی اور موجودہ بلدیاتی ادارے نہ مارشل لا
 نہ مکتبہ اسلام کی تخلیق ہیں، نہ ان کے تربیت یافتہ ہیں۔ نیز یہ کہ مغربی جمہوریت
 اپنی راہ پر گامزن رہے تو پیشہ ور سرمایہ کار، اجارہ دار سیاست دان پالتی ہی
 نہیں، پوستی بھی ہے۔ اور اسے کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے تو سیاست و تجارت
 میں امتیاز ممکن ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ ذاتی اغراض نے راہ نکال لی۔ اشتہار چھپوانے،
 بینز لگوانے، جوس نکالنے اور جلسے بھرنے کے لئے بھی وہ ہتھکنڈے استعمال کئے

گئے جو شوگر مل لگانے یا کسی صنعت کو واپس لینے کے لئے کوئی تاجر استعمال کرتا ہے۔
یہ سمجھ لیا گیا کہ سیاسی عمل کی مقبولیت کے لئے عقل کی نہیں، صرف "نیروبی آن" کے
ٹیکے لگانے اور دکھانے کے اور نئے دانت دکھانے اور کھانے کے پرانے دانت
چھپائے رکھنے کی اہلیت کی ضرورت ہے۔ ہر اشتہار اور ہر بینر کے نیچے، من جانب
سے شروع ہو کر امیدوار۔ اسمبلی پر ختم ہونے والی ہر سطر خود غرضی و خوشامد کا
منہ بولتا ثبوت تھی۔ گویا جنرل محمد ضیاء الحق کے مردمومن و مردحق ہونے اور ان
حضرات کے مناسب ترین امیدوار ہونے میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آستین
کے باسیوں کا یوں دامن پر ریگنا مغربی جمہوریت ہی کی عطا ہو سکتی ہے۔ ہر اشتہار
پر جنرل محمد ضیاء الحق کی تصویر کے برابر یا ذرا نیچے ہر امیدوار نے اپنی بٹنیہ اس
خود غرضی سے جمائی۔ کیا سیاسی جمائیوں کو بھی انگلیاں آنے لگیں۔ جو لوگ قومی اسمبلی
کے امیدوار تھے، انہوں نے صدر مملکت کی تصویر پر اکتفا کر لیا۔ اور جوے عدم سے
بشر آئے گا ایک دن۔ زمانہ کہے گا اُسے تیک دن۔ کی طرح صوبائی امیدواری
تک ہی محدود تھے۔ انہوں نے صوبائی گورنروں کی تصویر کا اضافہ ضروری سمجھا۔ لیکن
ادھر جناب صدر قبل از ریفرنڈم کامیاب "وہرل ونڈلوٹ" ختم ہوا۔ ادھر
ان افراد کی اکثریت نے یہ یقین کر کے کہ اب صدر اور گورنر صاحبان کی نظر میں
تو آچکے، عمل ریفرنڈم کو اپنی خود غرضی کی نذر کر کے بے حمیتی کو یوں اوڑھ لیا جیسے
عمل ریفرنڈم سے زیادہ سرد و خنک شے کائنات نے قطبین پر بھی نہیں دیکھی۔
غریب محبان اسلام غریب خانہ سے ریلوے اسٹیشن کو ڈھونڈتے رہے اور یہ
آئینہ رو اپنی اُس "ل" نما زلف کو رخ زیا پر سجاتے رہے جس کا راہ زن ایمان
ہونا ہمیشہ روح تغزل رہا ہے۔ ریفرنڈم ہوا تو کسی نے بغض کی آنکھوں سے
دیکھا۔ کسی نے مغضوب آنکھوں سے، کسی نے معتوب، کسی نے مجذب اور کسی

نے ٹیلیوژن کی معکوس آنکھوں سے۔ صبح و سالم آنکھوں سے دیکھنے کی توفیق کسی کو نہ ہوئی۔ تمام بینکوں کے نمبر غلط ہو گئے اور اندازے اور دعویٰ پانچ فی صد سے ستر فی صد تک بکھر گئے۔ ریفرنڈم ہو چکا، مگر کیوں ہوا کسی کسی کو معلوم ہو گا ریفرنڈم کیا ہوتا ہے۔ صرف انگریزی لغت میں ہی تحریر رہا۔ لوگ قرآن نہیں کھولتے۔ لغات کون کھولتا۔ ریفرنڈم کیسا ہوا، نتیجہ کیا نکلا۔ ہر دو طرف تقاضا ہے، اس زور شور سے پروپیگنڈا کے ذریعہ استحصال کرو کہ لوگوں کا یقین اپنی آنکھوں پر سے اٹھ جائے کہ ہر قدر کو متنازعہ بنا دینے میں ہی پاکستان کی عافیت ہے۔ حالات جو پیدا کر دیئے گئے تھے، ارادے جو بد اعمالی کے لئے تڑپ رہے تھے، نیم جان بھی رہتے تو اصول ہائے آئین اسلام کا تقاضا ہی یہی تھا کہ امیر مملکت کا انتخاب پہلے ہو اور دیگر شورائی ادارے امیر مملکت کی مشاورت و اعانت کے لئے بعد میں وجود میں آئیں۔ لیکن یہی ریفرنڈم اگر جمعہ کی نماز کے ساتھ ہوتا اور تمام جمعہ مساجد پولنگ بوتھ ہوتیں۔ اُس روز نماز جمعہ کی عدم ادائیگی جسم قرار پاتی، حلف لیا جاتا کہ میں رائے دہندہ حدود اللہ کی خلاف ورزی کا گزشتہ ساڑھے سات سال میں مرتکب نہیں ہوا۔ تو کیا حاضری و عدم حاضری کے یہ ناگوار مفروضے مشتہر کرنے یا کسی قابل اعتراض پابندی لگائے جانے پر شکایت کا کوئی موقع اس طرح میسر آتا جیسا کہ آرہا ہے۔ کاش اسلام کے داعی مغربی جمہوری طریق کار نہ اپناتے چلو، جو ہوا سو ہوا۔ ریفرنڈم کے یہ مثبت و مفید نتائج تو نکلے کہ بیرونی طاقتوں کے انتخابات میں دخل انداز ہو کر اپنی مرضی کی حکومت قائم کروانے کے حیلے ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ منتخب امیدواروں کو صدر مملکت کے عہدہ کے لئے امیدواروں کو اپنا مسنون احسان بنانا اور اپنی اغراض کے لئے سوا بازی کا تختہ مشق بنانا ممکن نہ رہا۔ کسی اسمبلی کے کسی امیدوار کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ مغربی جمہوریت،

سوشلزم یا سیکولزم کو اپنا منشور بنا سکے۔ مگر ساتھ ہی یہ خطرات بھی اُبھر کر
 سامنے آئے کہ انتظامی بدحواسیوں اور مغربی جمہوری نظام انتخابات کی نابالغ
 افزائش کی طفلانہ حرکات کی وجہ سے پیدا شدہ غییر نظام ہر کردہ بے دلی سے
 فائدہ اٹھانے کے لئے پیشہ ور اور اجارہ دار سیاست نے اپنے پُرزے پُرزے
 پر اپنی سرکوبیوں پر سجا کر، اطاعت گزار ی کا یقین دلا کر سودا بازی کے لئے رہیں
 ہموار کرنا شروع کر دیں۔ اور صدر مملکت کو جو نظام اسلام کے داعی و مدعی
 ہی نہیں، علی الاعلان وعدہ بھی فرما چکے ہیں، ڈالواں ڈول کرنے کے لئے شاطرانہ
 طریقے بھی استعمال ہونے لگے۔ تاکرانکے اعلان پر عمل نہ ہو سکے کہ آئندہ انتخابات اسلامی
 شریعت کے عین مطابق ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ دستور و آئین
 کی بنیاد ہوگی۔ سربراہ مملکت، انتظامیہ اور منتخب افراد صرف اللہ تعالیٰ اور رسول
 مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل کار ہوں گے۔ آئین کے تمام فکری تضادات ختم
 کر دیئے جائیں گے۔ اسلام ہمارا دین، اسلام ہماری سیاست، اسلام ہماری معیشت
 اور اسلام ہی ہمارا ضابطہ حیات ہوگا۔ حقیقی مساوات قائم کی جائے گی۔ ہر شہری
 اسلامی نقطہ نظر سے محترم اور عزت کا حق دار ہوگا۔ ہر شخص کی تکریم اس
 کی اہلیت کی بنا پر ہوگی، عہدے یا حیثیت کی بنا پر نہیں۔ اللہ کی قائم کردہ اخلاقی
 سیاسی حدود کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اہل الرائے تسلیم نہیں کیا جائے گا۔
 شرابی، کبابی، سمگلر اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو حق نہیں ہوگا کہ وہ
 رائے دے سکیں۔ جو منتخب شدہ رکن اللہ کی حدود پھلانگے گا، نااہل قرار دے
 دیا جائے گا۔ آئندہ انتخابات پاکستان میں وحدتِ ملت اسلامیہ کی بنیاد پر
 ہوں گے اور انتخابات کے نتیجے میں معاشرہ پیشہ ورانہ اجارہ دار یوں کے پنجے
 سے آزاد ہوگا۔ طریق انتخاب عہدہ طلبی اور مہم جوئی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اہلیت

و مشاورت کی بنیاد پر وضع کیا جائے گا۔ اسلامی نظام حکومت کا یہ منشور آج بھی
 بینکوں، ڈاک خانوں، نیشنل سنیٹروں اور اہم عمارتوں میں آویزاں ہے اور موسمی
 تغیرات کے باوجود کاغذ اور تحریر کا رنگ ابھی پھیکا نہیں پڑا۔ ریفرنڈم کے ذریعہ یوں
 عہدہ صدارت کے لئے جناب جنرل محمد ضیاء الحق کے آئندہ پانچ سال کے لئے انتخاب
 نے نفاذ نظام اسلام کی ان کی خود عائد کردہ جو انقلابی ذمہ داری ان کے سپرد
 کر دی ہے، اس کی بطریق احسن انجام دہی کے لئے جس ولولہ اور جرات
 اور آہنی گرفت کے علاوہ کانٹوں سے دامن بچانے کی جس احتیاط کی ضرورت
 ہے، اللہ انہیں اس اہلیت سے مزید نوازے۔ لیکن ہمارے ہاں کا دستور سیاست
 یہ رہا ہے کہ بروا ہونہار ہو تو پات اس کے چکنے نہیں ہوتے۔ اور پات اگر
 چکنے ہوں تو بروا ہونہار نہیں رہتا۔ دم تحریر کا بینہ آئندہ انتخابات کے متعلق فیصلہ
 کر چکی۔ راقم پر تقصیر ہے مگر مفروضوں کا قائل نہیں۔ لہذا اس کے لئے یہ امر واضح
 کر دینا ملک و ملت کی صحیح خدمت کے لئے ضروری ہے کہ اگر نفاذ نظام سیاست
 اسلام کی بجائے شرکت میانہ اسلام و مغربی جمہوریت کو رد رکھا گیا اور مندرجہ بالا
 منشور پر بین السطور عمل کرتے ہوئے آئین اور انتخابی قوانین میں مؤثر تبدیلیاں کئے
 بغیر عملی انتخاب جاری کر دیا گیا تو سیاست دانوں، پیشہ وروں، اجارہ داروں
 عمدہ طلبوں اور مہم جوؤں سے تو شاید وقتی مفاہمت ہو جائے اور بائیکاٹ
 کا خطرہ نہ رہے لیکن فطرت کے بائیکاٹ کا خطرہ بہر حال لاحق ہو جائے گا۔ لوگ
 اگر بنیادی حقوق کی بحالی، جمہوریت کے احیاء، مارشل لا کے اٹھائے جانے،
 اسمبلیوں میں کرسی نشین ہونے اور اپنے اقتدار نیم اقتدار کے متمنی ہیں تو کچھ امیدیں
 اللہ تعالیٰ نے بھی حکومت وقت سے شاید لگا رکھی ہیں، جو اگر پوری نہ ہوئیں تو
 اللہ تعالیٰ اس کی قوتیں، اس کی برکات کہیں حالات مملکت خداداد پاکستان

کا بائیکاٹ نہ کر دیں۔ کچھ امیدیں اس ملک کے عزیز پسماندہ اور متوسط طبقہ نے
 بھی لگا رکھی ہیں۔ وہ جو اللہ کے آئین کے لئے لٹے، پٹے، اجرٹے ان کی بھی کچھ
 تمنائیں ہیں، کچھ دعائیں ہیں۔ ملک و ملت سے غیر مخلص سیاست دانوں سے
 انعقادِ انتخابات کے وعدہ کے ایفا ہونے پر جو کچھ ہوا، وہ تو اللہ کی مدد سے
 برداشت کر لیا۔ اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو ایفا نہ کیا گیا تو شاید عوام کی امداد
 بھی کسی کام نہ آسکے۔ دشمنوں سے تعاون حاصل کرنے کے لئے دوستوں سے
 نہیں بگاڑا کرتے۔ بالخصوص جب دوستی اللہ اور رسول کے واسطے ہو۔ خیال
 رہے کہ سپر طاقتوں کو خوش کرتے کرتے کہیں سپریم طاقت ناراض نہ ہو جائے۔
 تاریخِ پاکستان کے مستقبل کو یہ دریافت کرنے کا حق تو ہے کہ جو اس کے قیام
 کے مخالف تھے، اُن کو اس مملکت کے انتظام میں شریک ہونے کا کیا حق ہے۔
 اور کسی کو بھی کیا حق ہے کہ انہیں شریک کرے۔ وہ شریک تھے تو ماسوا شراکتوں
 اور منافقتوں کے انہوں نے کیا کیا اور شریک ہوں گے تو کیا کبھی امر معروف
 کی توقع ان سے کی جا سکتی ہے۔ کیا پاکستان کی سیاست میں صرف "نیوسینس
 ویلیو" ہی قابلِ اعتنا اور مؤثر قدر ہے۔ گھر کی تعمیر کے لئے معماروں کی ضرورت ہوتی
 ہے۔ خدا نخواستہ کوئی طلبہ اٹھوانا ہے کہ سیاسی خراکار گھاروں کے نام اور
 پتے معلوم کئے جائیں۔ کیا حق ہے شرابیوں، سٹہ بازوں، سمگروں، جواہ
 بازوں، ذخیرہ اندوزوں اور خلافِ شرعِ اسلام عمدہ طلبوں اور مہم جوؤں کا
 کہ انہیں کاروبارِ مملکت میں شریک کیا جائے اشتہاروں اور بینروں کے لئے سرمایہ
 فراہم کرنا اگر خوش آمد فعل ہے تو جن لوگوں نے محض محبت سے اپنے ہاتھوں سے
 یہ اشتہار چپکائے، بینر لگائے ان کے جذبات کا بھی کوئی صلہ ہے یا نہیں۔ وہ
 بوڑھے، معذور، مفلوک الحال، پسماندہ، مریض مرد اور عورتیں جو اسلام کی

محبت میں پولنگ اسٹیشن ڈھونڈتے پھرے۔ کیا ان کے مقدر میں صرف یہی انعام ہے کہ ٹیلیوژن پر ان کے جذبات نشر کر دیئے جائیں۔ اور انعام سے سابقہ نوازوں کو نوازا جائے۔ جناب صدر! کیا بس ہی۔ وطن عزیز کا تین کروڑ سے زائد پسماندہ طبقہ بھی خواب تو دیکھتا ہے، وہ مغربی جمہوری نظام کے تحت تو شرمندہ تعبیر نہیں ہوں گے۔ روٹی، کپڑے اور مکان کے پرفریب لغروں نے تو انہیں مایوس کیا، اسلام تو مایوس نہیں کیا کرتا۔ یہ تو کوئی مثبت اقدام و انتظام نہ ہوا کہ سابقہ انتخابات میں ٹکٹ سیاسی جماعتوں کے دفاتر میں فروخت ہوتے رہے اور آئندہ کے انتخابات کے لئے یہ منڈیاں تحصیل، ضلعی سربراہی دفاتر میں لگیں اور انتخابی سٹاک ایکسینج کے ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ پاکستانی شہری سے مراد پاکستان کے شہروں میں رہنے والے ہی نہیں۔ دیہات میں رہنے والے بھی پاکستان ہی کے شہری ہیں۔ کہ ”شہری“ جغرافیائی نہیں، سیاسی اصطلاح ہے۔ اگر پاکستانی دیہاتی شہریوں نے ریفرنڈم کو کامیاب یا کامیاب ترین کر دیا ہے تو پھر انعام و اکرام ان ہی کی فلاح و بہبود ہونا چاہیے۔ شہری تاجروں نے خدمت کی ہے یا تجارت، تاریخ یہ فیصلہ ۲۳ مارچ ۸۴ء سے پہلے صادر کرنے کی غلطی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ فریب و سیاست کا دین کی صورت میں یک جا ہوجانا بیرونی طاقتوں کو پسند ہے، نہ سرمایہ دار مغربی جمہوری پاکستانی سیاست کو۔ یورپ میں سیاست نے مذہب سے یوں پیچھا چھڑایا کہ پیرانہ کلیسا کی پیری ناکام ہو کر رہ گئی۔ تاریخی حقیقت ہے جس سے مفرا اور الکار ممکن ہی نہیں۔ مگر دانشوروں یا یورپ نے جو کچھ جھیلایا کیا وہ حضرت علیؑ کی کسی غلطی و کوتاہی کی وجہ سے تھا یا پائیت کی کج فکری اور بے عملی کی وجہ سے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ آئین اسلام کی دینی افادیت کو ثابت کرنے کے لئے ہم بیک وقت

مغربی جمہوریت اور اس قسم کی پاپائیت سے خبردار رہیں جس کی نشان دہی مفکرِ پاکستان نے اصرار کے ساتھ کی ہے۔ دینِ اسلام کو ان عوامل سے بچانا کیا ہم سب پر فرض نہیں۔ آج کی وہ پاپائیت جسے مغربی جمہوریت اور اس کے طریق انتخاب میں اسلام نظر آتا ہے، وہ دانشوری جو یہ کہہ کر عوام کو بہکاتی ہے کہ مغرب نے اسلام سے جمہوریت سیکھی ہے، دراصل اس حقیقت کو چھپانا چاہتی ہے کہ مغربی جمہوریت اسلام کے نظامِ حریت کے خلاف بادشاہوں اور اُمرا کی گھناؤنی سازش کا دوسرا نام ہے۔ ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس۔ شاہی کا جمہوری لباس پہننا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کسی اسلام کے شیعائی مجاہد کا تلوار میان میں ڈال لینے کی بجائے تلوار پھینک دینا ہے۔ ہر چند کہ دینِ اسلام میں مجاہد سے بڑھ کر کسی کا مقام نہیں لیکن حالات نے اگر اب بھی شاہی کو جمہوری لباس پہنایا تو پھر خدائی اُن سے ہوگی نہ ہم سے بندگی ہوگی۔



کی نہ نبیوں کے وفات کو خدا یاد آیا

دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں، تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے، یہی شاہد نہیں، تاریخ اسلام گواہ ہے کہ طریق انتخاب بدلا تو خلافت راشدہ کے منفرد و یکتا نظام حاکمیت الہی و عبدیت مومنان کا ورثہ ملکیت قرار پایا۔ لہذا کیوں کر لغتیں کر لیں کہ انتہائی محتاط احتیاط لازم کے بغیر مغربی جمہوری طریق انتخاب کے بے کنار صحرا کی وسعتیں نظام اسلام کی گلشن گلشن سیرابیاں اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی کہ اسلام یوں چھپ چھپا کر بے پاؤں بھی آیا کرتا ہے۔ طب مغرب کے میٹھے مزے کی چاٹ محکوم کے لئے ہی خواب آور نہیں ہوتی، حاکموں کے لئے خطرناک حد تک نشہ آور بھی ہوتی ہے۔ سرور پہلے آئے یا سرود، رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے کے تقاضے لازم ہو جاتے ہیں۔ مغربی طریق انتخاب ہو تو سرمایہ داروں کی جنگ زرگری بہر حال برپا ہوتی ہے۔ انفرادی ہو یا جماعتی، جنگ زرگری سرمایہ کے صرف کی نہیں سرمایہ کی قمار بازی کی طالع آزمائی ہوتی ہے۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب میں پیسہ پیسے کو ہی نہیں کھینچتا، انسانوں کو بھی دراز کرتا ہے۔ پانسہ ذہنی آمادگی کے گرم خانوں پر پھینکا جاتا ہے اور فکری شمعیں یوں جلائی بچھائی

جاتی ہیں کہ شعور کی بنیائی چندھیا جاتی ہے۔ اور معاشرہ کی آنکھوں میں سرمہ لگانے کے بہانے خاک و خون آلود سلاٹیاں پھیر دی جاتی ہیں۔ انسانی اقتدار کی پازیب کی جھنکار پر انسانیت دھمال ڈالتی ہے۔ لوگوں کے ذہنی، شعوری اور وسائلی افلاس و محکومیت کو یہ کہہ کر درغلایا جاتا ہے کہ ہم سرمایہ لہیبوں کا اقتدار تمہارے پاس مقدس امانت ہے۔ اسی امانت کی پاسداری و نگہبانی نے تمہارے مقدر کی تمام محرومیاں ترتیب دے رکھی ہے۔ یہ امانت ہمیں لوٹا دو۔ تم محروم آسائش ہو ہی، اس لئے کہ ہم محروم اقتدار ہیں۔ ہم تمہارے آئندہ نما ہیں، تمہارا مستقل مستقبل ہیں۔ ہم تخلیق ہی اس لئے کئے گئے ہیں کہ ہمیں دیکھ کر تمہیں خدا یاد آتا ہے۔ ہماری کمیں گاہوں سے تیرنہ چلیں تو زندگی بھر تمہاری دوستوں سے ملاقات نہ ہو۔ یہ تمہارا افلاس دانش ہے کہ تم ہمارے جذبہ خدمت سے محروم رہے۔ یہ ہماری سعادت مندی کی دلیل ہے کہ خادم اپنے محروموں کی تلاش میں ہیں۔ جمہوری حق رائے دہندگی بے مصرف و بے معنی ہے، اگر رائے لیوانہ ہوں۔ یہ اسی کے فریب چشم کی چشمک ہے کہ محکوم کے اندیشہ طاقت کا سرچشمہ کہلاتے ہیں اور انسانی دانش کی سنگلاخوں سے حاجات کی پامردی خدا تراستی کے اسلوب سیکھتی ہے۔ انسانوں کی دوراندیشی تجوریوں کی دور بینی کی زد میں یوں آجاتی ہے کہ دوریاں مزید دور اور اندیشے جبل الوریڈ سے بھی قریب تر آجاتے ہیں۔ ہونے والے شاہ گلی گلی مانگتے پھرتے ہیں۔ اور نسلی و اصلی گدا بادشاہت کی رعایت بانٹنے پر مامور ہو جاتے ہیں اور حسین خوابوں کا طلسم ٹوٹنے سے پہلے معاشرہ کی کچ کلاہی دیوہائے استبداد کے اُن سردوں کو تاج پہنا چکی ہوتی ہے جن کی کھوڑیاں لات و عزی کے ابوالہول کی تکونی تعمیری فن کاری کو یوں اجاگر کرنے میں ماہر ہوتی ہیں کہ خشت بنیاد کلیسا سنگ

اسود نظر آنے لگے اور یوں میراثِ خلیل فرزندانِ تثلیث کے نام ورثہ کر دی جاتی ہے۔ اور انسانیت ”یور ایکسی لینسی اور مائی لارڈز“ کے مساوی ترازوؤں میں متوازن ہونے کے ذوق میں متوازی ہو جاتی ہے۔ ہر مستقیم اپنی عمودیت کھو بیٹھتا ہے اور صراطِ مستقیم کی متمنی عبدیت نام نہاد نمائندوں کے روبرو ایک نستعین بسورتی دست بستہ کھڑا رہنے پر بے ارادہ عمد کی پرکاری سے مجبور کر دی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک تجربہ ہے جس میں اہل وطن مبتلا ہو چکے ہیں اور شاید تادمِ اشاعت ابتلا آشنا ہو چکے ہوں گے۔ اور ان مفروضوں کی تمام قلعی دھل چکی ہوگی، تمام ملمع اتر چکا ہوگا کہ نظامِ اسلام اور مغربی جمہوری طریقِ انتخاب متصادم و متعارض نہیں ہیں۔ بندگی، زمانہ اور اطاعت الہی میں فرق واضح ہو چکا ہوگا اور فضا میں چلا رہی ہوں گی کہ خطا کار اور خطاؤں کے سزاوار انسانو! خدائی انسان سازی اور انسانی خداگری میں بڑا فرق ہے۔

تادمِ تحریر جو کچھ سننے میں آیا ہے، اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ اراکینِ مجلس شوریٰ اور وزیرانِ خدادادے صدر مملکت اور مملکت کا نمک چکھاتک نہیں اور حق شکر ادا کرنے کی تلفین چونکہ کسی رسم دنیا میں موجود نہیں لہذا سارے آم کھا جانے اور گٹھلیاں لپنے باغیچوں میں بولینے کے باوجود دعویٰ ہے کہ اسمبلیوں میں مختلف بنیادوں پر گروہ بندی ہوگی، مغربی جمہوری پارلیمانی نظام بحال ہوگا۔ تضاداتِ آئین کو ”خود انقلابی“ قدروں کے لئے محک کیا جائے گا۔ سابقہ عمل، اس کے نتائج اور آئینی ترامیم پر اپنی اپنی نبض پر ہاتھ رکھ کر غور کیا جائے گا۔ اراکین اپنے اپنے گروپ متعین کروائیں گے۔ موجودہ انتظامیہ کا بلڈ پریشر اینارمل قرار دیا جا کر ”بائی پاس“ کروانے کے ذرائع تلاش کئے جائیں گے اور ہر وہ ممکن کوشش کی جائے گی کہ بیمار معاشرہ پھر

سی۔ ایم۔ ایچ کا آؤٹ ڈومیشنٹ بنا رہے۔ مغربی جمہوری نظام انتخاب میں امیدواروں نے جو کچھ بظاہر فریج اور بیاطن انوسٹ کیا ہے، اس کا اصل زر مع سود وصول کرنے کے لئے آئندہ حکومت پر اپنا دباؤ قائم رکھنا ضروری ہے۔ لہذا جہاں بائیکاٹ کرنے والوں کی آشریاد ضروری تھی وہاں ان سے مسلسل ربط و ضبط بھی تقاضائے پرکاری سیاست ہے۔ ہر چند کہ اسمبلیاں اجتہاد کے ادارے ہوتی ہیں اور ان کے ذمہ قانون سازی نہیں، قانون بنی ہوتی ہے، تاہم آج کے سیاسی مومن اتنے سادہ لوح بھی نہیں کہ انہیں وعدہ آخرت پر ٹالا جاسکے۔ زمانہ روش بدل چکا۔ اب تو یاں سودا نقد بہ نقدی ہے۔ اس ہاتھ لے اُس ہاتھ دے کا اصول کار فرما ہے لہذا ہر اطاعت سبکے گی، ہر معاونت کا بھاؤ بیچ چوک کے، سرمایہ ان لگے گا۔ سیاست اشتہار دے گی کہ گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں۔ قوم و ملک کے سبھی ہی خواہ، خواہ مخواہ ہوتے ہیں۔ اپنا گروپ نہ ہو تو وزیر کون بناتا ہے اور گروپوں کے گروپ نہ ہوں تو میر خوار پھرتے ہیں اور عزت سادات میخواروں کے کھاتے ہیں تحریر ہو جاتی ہے۔ پانچ کے مختصر عرصہ میں سے سال دو سال رسہ کشی میں، دو سال رسیاں جوڑنے میں اور سال آخر چلہ کشی میں کٹ جاتا ہے اور قومی مسائل کا حل تلاش کرتے کرتے قوم خود ایک مسئلہ بن جاتی ہے۔ ان حالات میں لمحہ فکریہ تو ہوگا کہ قوم نے جس نظام اسلام کے نفاذ کے لئے استصوابی ہاں کہی ہے، پانچ سال مزید صدر رہنے کا اختیار دیا ہے، کیا اسی بے بس مغربی جمہوری نظام کے ذریعے صدر مزید کے سپرد کر دی جائے گی۔ آخر انتخابات غیر سیاسی بنیادوں پر منعقد کروانے کے بعد اخلاقی، سیاسی، قانونی آئینی طور پر یہ درست ہوگا کہ آئینی اداروں میں گروہ بندی، تفرقات کا عمل جاری رکھا جائے۔ حدود و احکام

الہی کے پابند نہ رہ کر اراکین عوامی نمائندگی کی مرتبت کو داغدار کرتے رہیں، منگلوب
 قانون سازی ہوتی رہے، معذور انصاف و عدل و احسان ہوتا رہے۔ انتظامیہ
 غیر منظم بھی رہے، الٹ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتی اور سرعت سے چھوڑتی رہے
 اور اس کے حسن انتظام کا چرچا بھی ہوتا رہے۔ سنتے ہیں آئندہ اسمبلیاں جب
 نشستیں کام شروع کریں گی تو سیاسی جماعتی عمل پر پابندیاں ختم کر دی جائیں گی۔
 گویا بائیکاٹ کرنے والوں کو منتخب ہونے والوں پر اپنی کاٹ آزمانے کی آزادی
 ہوگی۔ فرمانا رائے عامہ کی تربیت کرنے والوں کا یہ ہے کہ یوں نہ ہوا تو لوگ
 سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ اب کون سمجھائے کہ گھروں میں چھپے ہوئے لوگ تو ان
 سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کہ تارکیوں کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ امر ہر
 زمام کار بردار پر ہم فقیروں کی طرف سے واضح رہے کہ جو نقصان مغربی جمہوریت
 کے پاسدار نہ کر سکے وہ اس کی پاسداری سے ان کے اپنے ہاتھوں سرزد ہو جائے
 گا۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب کے نتائج عام تر وعدہ ہائے وفاداری اور خوشامد
 خسروی کے باوجود "اسپیرین لاؤ" کا حکم صادر کروائیں گے۔ اسلامی نظام کے
 نفاذ کے لئے مغربی جمہوری ذرائع استعمال کر کے بلال گنج سے بلال رضی تلاش
 کرنے کا یہ عمل وہ رنگ لائے گا کہ آئینے ہی نہیں ہنسیں گئے آئینہ رو بھی مضحکہ
 اڑائیں گے۔ تسلیم کہ تدریجی عمل کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں مگر تجریدی عمل
 اس کی نفی ہوتا ہے۔ تقاضا نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب بھی وقت ہے
 کہ اسمبلیوں کے صدر دروازے کو الٹ کی حدود کی خلاف ورزی سے توبہ
 کا دروازہ قرار دیا جائے۔ اطمینان لیا جائے، قوم کو اطمینان دلایا جائے
 کہ اسمبلیاں اجتہاد کے ادارے ہوں گی۔ احکام الہی کی دانش کی روشنی
 میں امور مملکت و معاشرہ کا متفقہ حل تلاش کرنا ان کا فرض ہوگا۔ عہدہ

طلبی و ہم جوئی نااہلیت کا ثبوت ہوگی۔ جو کوئی ان تقاضوں کو پورا نہیں کرے گا، باقاعدہ قانونی کارروائی اور نااہلیت کا سزاوار ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سیاسی بے راہ روی حاشیہ آراء ہوگی اور تمام روشنیاں گمنا جائیں گی۔ روشش روشش آبلہ پا ہوں گے اور آستیں در آستیں جو نکلیں گے جھپٹ جائیں گی۔ اسمبلیوں کو اپنے دائرہ کار میں با اختیار ہونا چاہیے۔ لیکن کیا انہیں بے عملی یا بد عملی کے لئے بھی با اختیار ہونا چاہیے۔ بے لگام قانون ساز کو ہی فسطائی اور ڈکٹیٹر کہتے ہیں۔ ہمیں اسمبلیاں قائم کرنا ہیں۔ نظام اسلام کے نفاذ کے لئے، ڈکٹیٹروں کی انجمن تشکیل نہیں دینا ہے اور پھر با اختیار قانون ساز اور بے اختیار عدالت معاشرتی موت کے پیش گو ادارے ہوتے ہیں۔ عدلیہ کو مقننہ کی رضا کا پابند رکھنا اسے اللہ اور ضمیر سے بغاوت پر آمادہ کرنے کا عمل ہے۔ آئین کی تخلیق کردہ عدالتوں اور قانون کی وجود میں لائی ہوئی عدالتوں میں وہی فرق ہوتا ہے جو اصلی اور پلاسٹک کے پودوں میں ہوتا ہے۔ کسی انسان ساختہ آئین کی قائم کی ہوئی عدالت انسانی رضاؤں سے آزاد نہیں ہوتی۔ مقننہ اگر احکام الہی کی پابند نہ ہو تو عدالتوں کے خدا ساز بن جانے کے خطرہ سے قطع نظر نہیں کیا جاسکتا۔ آخر وہ گھڑی آن لگتی ہے جب ان کے حلف پر ان کا اپنا اعتماد بھی اٹھ جاتا ہے۔ مخدوش عادل سے پڑیچ انسان تاریخ نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو..... خطانہ سہی، کوتاہی ہی سہی مگر ہو چکی۔ زمام کار ڈھیلی چھوڑنے کے لئے نہیں، سنبھالنے کے لئے ہوتی ہے۔ زمانے کو احکام الہی کا پابند عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہے جو اپنے عمال کو احکام الہی کا پابند رکھنے کے لئے مومنانہ جرأت، فراست، ہوش مندی کا حامل ہو اور لمحات کے اخبار کو اپنی نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ رجب رات بارہ بجے قومی نمائندگی

کے لئے ” مہم جوئی ختم ہو جائے گی۔ عمدہ طلبی، خوشامد و سازش کی بساط
 بچھالے گی۔ کچھ نام دیواروں پر لکھے رہ جائیں گے، کئی نقش ذہنوں میں در
 آئیں گے۔۔۔۔۔ جو کچھ بھی ہوا۔ جو کچھ بھی ہو۔ تاریخ یقین دلا رہی ہے کہ مغربی
 جمہوری طریق انتخاب کا آخری تجربہ ہو چکا۔ اس کے بعد کی نہبتوں سے
 وفا تو خدا یاد آیا، کی کار فرمائی ہوگی اور جو اس عمل میں رکاوٹ بنے گا، اس
 کے اپنے ہاتھ اس کا سر پیٹیں گے۔



عن صلاتہم ساہون

وائے حاصل سیاستِ نیت "چارہ" سازاں، فکرِ غم گساراں، عمل تیمارداران
و تشخیصِ بیماراں کہ پورا معاشرہ عالمِ ہدیانِ نزع میں آخری ہچکولتی ہچکیوں سے بطرز نبرد
آزماؤں دوچار ہے اور بساطِ حیات پر مہرے جملے یہ خود ستا، ستی ذہن، ستے فکر، مخمور
چارہ ساز و غم گسار پھتیاں لارہے ہیں کہ حمامِ سیاستِ گرم کے جملہ ٹھنڈے ننگو، سنو!
صبحِ غسلِ صحت زیرِ طلوع ہے۔ بے یقینی و بے حمیتی کی اس شبِ تحفظات و احتیاط
آزما کے بطن سے ایک ایسا آفتابِ تازہ تولید پذیر ہے جس کے چمکنے پر کسی انسان
کو آنکھوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ بے تدبیر و بے تفکر انسان لحم و شحم مادیت
کے فیل بنے یوں چنگھاڑیں گے کہ عرصوں تک ہر بستی کے صدر دروازے پر "بے زبانی
ہے زباں میری" تخریر رہے گا۔ ہر چند نورِ دیدہ حیراں میانِ قوسِ قزح ڈوبنا نظر
آتا ہے مگر گذرتی ہوئی رات چونکہ "طلع المبدد علینا" کے تصور سے
شبِ باش ہے۔ لہذا چاند ڈوبا تو جانو سورج نکلا۔ اس لئے اے سورج بنسیو!
فبائی اللہ ربکما تکذبتن۔ صبر و صلوات سے اعانت چاہو۔ اور فی الحال
شوخی آمد و زرتشت رفت پر قناعت و اکتفا کرو۔ کہیں کی اینٹ اور کہیں کے روٹے
سے پاربتی جو کنبہ جوڑ رہی ہے، بالآخر مشرف بہ اسلام ہو جائے گا۔ تم اسلام سے

مزید گریز بھی کر جاؤ۔ تو بھی چنداں حرج نہیں کہ مسلمان مومن نہ رہیں اور ہر یجن مسلمان ہو جائیں۔ تو حاصلِ ضربِ یہود تفریقِ آشنا نہیں ہوگا۔ حیاتِ علیل سے مرگِ مشفا نہیں زیادہ سود مند اور حظ آمیز ہے۔ موت کو جو ان تو ہو لینے دو، زندگی اسی نزاعِ مرگ سے ہی جنم لے گی۔ تحفظِ اسلام کا ہر متمنی سپر طاقتوں کے اہرام سے رشتہء اتقار رکھے۔ غیر جانبدار قوتوں کے حصار کے فرش پر صلواتِ قائم کر کے جو کچھ عالمی بینک سے اسے رزق کیا جائے، اُس میں سے بعد ادائیگی جائز سود جو کچھ بچ جائے، سارے کا سارا خرچ کرتا رہے۔ اور اس کلیہ غیب پر ایمان رکھے کہ دیوارِ چین جب تک چس بجیں نہیں، کسی ذوالقرنین کو سینک اٹکانے کی ضرورت نہیں کہ اہلیانِ مدرسہ تفرقہ بازاں نے جس گلے کو گھونٹ رکھا ہے، اس سے صدائے لا الہ الا اللہ بلند کر دانے کا یہی ایک طریقہ ایجادِ دانشِ منافقتِ حاضر ہے۔ افغانستان و ایران و پاکستان و ہندوستان کی آن اگر ٹوٹ رہی ہے تو کیا ہوا۔ افریشیا و انڈونیشیا اگر دوش تا کر زہِ یہود و نصاریٰ میں ڈوب گئے ہیں تو کیا؟ عالمِ پیر تو مر رہا ہے۔ تسلطِ غیر کی سپر مادرِ جہان نو کی یونیفارم اٹھائے درگورستان پر منتظر ہے کہ جونہی آغوشِ لمحہ ہری ہو، اسے مردہ تازہ کو پہنا بہتر توپوں کی سلامی گذاروں گی کہ اسلام تو زندہ ہی بعد کر بلا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے بعد کوئی حسین پیدا نہیں ہوتا اور کسی یزید کو موت نہیں آتی۔ ہائے! یہ کیا ہوا کہ عیاریٰ مادیت، فریبِ یہودیت و پرکاریٰ اشتراکیت کا پروردہ جاں بہ لب انسان اپنے گرد و پیش سے ابھی کوئی عذرِ معقول بھی نہ کر پایا تھا کہ ان ہی کے دین و مذہب و روحانیت کے پوشاک برداروں نے بندِ قباچرا، دستارِ پا پوش میں چھپا، کلاہ کو کشکول بنا "میرے مولا بلا لومدینے مجھے" کی صدائیں لگاتے ہوئے سامانِ آرائشِ تل ابیب خریدنا شروع کر دیا۔ ابھی نویدِ عیدِ آمدِ اسلام مکمل سن بھی نہ پلٹے تھے کہ انقلابِ اسلام منقلب ہو گیا۔ ہم سبہ

شکر کے لئے وضو بھی نہ کر پائے تھے کہ ہر محرابِ پیشانی سے لہو پکنے لگا، ہر تہیج کے
 ہردانے میں شبیرِ صلیب کیوں نظر آنے لگی، ہر عصا اژدہا بن کر کیوں پھنکارنے لگا۔ فرعون
 کی توبہ قبول ہو گئی کہ موسیٰ سے کوئی سوہوٹی۔ من و سلویٰ دیر ہضم تھا یا بچھڑا غیر نامزد
 پایا گیا۔ ہر ہارون وارٹھی چھپا آیا۔ گلوٹے خطیب میں پاربتی و عزیٰ کے نغے کیوں رقص
 کرنے لگے۔ بر سر منبر کیا کوئی دریودھن آبراجا۔ کسی درویدی نے مصلوں کی جگہ اپنی ساڑھی
 کھلوا دی کہ مسجدوں میں قومیل المصلین الذین عن صلا تہم ساہون
 کی صدا میں بلند ہونے لگیں۔ یہ کیا ہوا کہ فضائیں بائی ذنبِ قتلت پکاراٹھیں۔
 اسلام تو امن و آشتی و صلح و رواداری کا پیام بر تھا، مومن قتال پر کیوں اتر آئے۔
 استقبالِ انقلاب کی راہوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں شیدائیانِ انقلابِ اسلام کے
 لاشے کیوں تڑپ گئے۔ رحماء بینہم کا کیا ہوا۔ انجوت نے کس سے شرما
 کر گھونگھٹ میں منہ چھپا لیا۔ کس ناہموار چوٹی سے مساوات کا پاؤں پھسلا کہ عمیق غاروں
 کی آخری گہرائیوں تک اس کا نشان نظر نہیں آتا۔ یہ کیا ہوا کہ تیغِ انتقامِ مقتدر بے دریغ
 و بے پس، بنامِ اسلام رقصِ قتلِ ابنوہ میں مہروف ہو گئی۔ ہر شاخِ گل سے سپولے لپٹ
 گئے جتنے چراغ تھے وہ چمکا دڑوں نے پشت کر لئے۔ ہر سواندھیرا مچ گیا ہے۔ کوئی
 تو بتائے کہ روزانہ بیسیوں مسلمانوں کو گولی سے اڑا دینے کی خبر آئے تو معصوم معتقد
 اسلام کون سے آئینے میں اپنے عکس کو اپنا منہ دکھائے۔ بہتر سے زائد راہ نما ایک
 ہی دھماکے میں یوں بے جان ہو جائیں کہ داعیِ اجل کو لبیک کہنے کا موقع بھی نہ ملے
 تو ان مسلمانوں کو جنہوں نے اسلام سے اپنی عاقبت وابستہ کر رکھی ہے، اپنا کلیب
 اپنے دانتوں سے چبانے کا سہل طریقہ کون بتائے۔ جو مسلمان یہ سن پائے کہ
 کل کے اسلامی انقلاب کے داعیوں نے آج اپنے صد اور وزیر اعظم کو ہلاک کر ڈالا،
 وہ دورانِ التحیات عباد الصالحین پر سلام بھیجتے وقت ہر کلا نہیں جائے گا

تو اور کیا کرے گا۔ جن گولیوں سے مسلمانوں کو اڑایا جا رہا ہے ان میں سے ایک بھی کسی مسلمان ملک کے کسی مسلمان اسلحہ ساز کی بنی ہوئی نہیں۔ جو بم ہلک دھماکوں کے لئے استعمال ہو رہے ہیں ان کی فروخت کا بل کسی مسلمان ملک میں نہیں کاٹا گیا۔ گولی بندوق، بم نصاریٰ و کفار کے ہیں، ہاتھ مسلمان کا استعمال ہو رہا ہے، جان مسلمان کی جا رہی ہے۔ چرند و پرند بھی سوچتے ہوں گے، اسلام کا انقلاب آ رہا ہے یا اسلام میں انقلاب آ رہا ہے۔ سوچتے تو ہوں گے، مقیم مدینہ مہاجر اور مقیم پیرس مہاجر کے اسلامی انقلاب لانے کے اسلوب کتنے جداگانہ ہیں۔ کہاں ابوسفیان کا مسلمان ہو جانا اور کہاں مسلمانوں کا ابوسفیان بن جانا۔ کیا اسی کو انقلاب اسلام تسلیم کر لیں کہ ایک دن بھی اصلاح احوال کی جسد نہ آئی۔ ہر فرد کے سنگین و سازش کی زد میں ہونے کو، کیا ہم منکر ختم نبوت ہیں، کہ خوشنودی رحمۃ للعالمین تسلیم کر لیں۔ کیا شوئے قسمت ہے کہ کوئی پھول کھلا بھی تو بس شگوفہ ہی پھوٹا۔ اس صورت حال کے ذمہ دار ایک ایک فرد سے ہم بصد ہزار منت التجا کرتے ہیں، ہمیں اتنا بتا دو، ہم ان غیروں کو کما جواب دیں جو تاریخ اسلام ہاتھ میں لئے آج تمہارے واسطے سے ہم پر نئے ممرے سے طعنہ زن ہیں۔ انہیں کیا بتائیں کہ انقلاب اسلام بنی صدر کے مونچھیں رکھ لینے کو کہتے ہیں یا مونچھیں منڈوا دینے کو۔ یا یہ تنازعہ کھڑا کر دیں کہ ہر آدمی کی مونچھ ہوتی ہے، مونچھیں کسی کی نہیں ہوتیں۔ مونچھوں کے درمیان حد فاصل مصنوعی ہے جو ناک کے بہاؤ کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ پہلے یہ طے کرو کہ بنی صدر نے مونچھ منڈوائی کہ مونچھیں۔ مونچھ واحد ہے اس لئے صیغہ جمع کا استعمال شرک ہے۔ از روئے گرام بھی، اور از روئے جغرافیہ بھی۔ فویل کہ آج تک رعایا کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اب حکیم الامت سے کیا کہیں کہ حضور مشرق کا جنیوا اب کہاں تعمیر ہوگا۔ تہران میں تو مسائل حل کرنے کی بجائے یا شہریوں نے راہ نما حل کر ڈالے یا راہ نماؤں نے

شہریوں کا محلول بنائے رکھا۔ فویل، کہ قتل و غارت گری سازش و انتقام، تشدد و
دہشت گردی اس اسلام کے نام لیواؤں کا شیوہ بن گیا جو دنیا بھر کو پیغام امن دینے
کا دعویدار ہے۔ جو خطاب جی چاہے چھین لو اور جو خلعت چاہو واپس لے لو مگر تاریخ
میں یہ تحریر ہے گا کہ نعمۃ اسلام کے یہ غیر سائنسہ طنبورے جو نہی جھنکارے، انسانوں نے
انسانوں کو ہی نہیں، فرشتوں کو بھی ڈس لیا۔ مسلم برادر ہڈنے جب بھی اپنا ترانہ چھیڑا،
مسلمان پھوٹ پھوٹ گئے۔ بامِ یہود پر بہ ایمائے نصاریٰ جب بھی علمِ اسلام بلند ہوا،
ایک غوغا پیشِ عرشِ الہی بپا ہوا کہ آدمِ فرشتہ صورت ملائک خور ہوا جاتا ہے جو ریں
سسکیاں پھرتی ہوئی عرض گزار ہوئیں، پروردگار ہمیں ان نیک بندوں سے محفوظ رکھو۔
علماءِ بلال حبشی کے واسطے دے دے کر سبحان ربی الاعلیٰ پکارتے گڑ گڑاتے سجدوں
میں سر ٹکرانے لگے کہ اے خالقِ اسلام ہمیں چھپالے کہ جنت میں سی آئی، اے در آئی
ہے۔ فرشتوں نے صف باندھ کر عرض کی۔ اے خالقِ دین امن عالم! انسانوں کے ہاتھوں مسلمانوں
کا قتل عام، شب و روز یہ تماشائے انتقام، دہشت و تشدد کا یہ دیوناچ، گفتار و
تحریر و فکر کے آنگن میں محور قہص یہ بھوت، یہ تذلیلِ احترامِ انسانیت، ان میں سے
تو کسی کا بھی ذکرِ خطبہ حجۃ الوداع میں نہ تھا۔ تیرے نیک بندوں نے بندوں کی زبان
کیوں بند کر دی۔ تیرے یہ خاکی فرشتے خصلتِ آقائی الحاد کے گردیدہ کیوں ہو گئے۔
شرفِ انسانیت کو حفاظت کے بہانے غضبِ حقوق کے قلعوں میں کیوں محصور کر دیا
گیا۔ انسان کیوں طبقوں کا طباخ بن کر رہ گیا۔ انسانوں کے ننگِ خیال نے خود کو
مستور رکھنے کے لئے لباسِ اسلام کے چھپتھڑے کیوں کر ڈالے۔ ہر مدعی لاریب ہونے
کا دعویٰ کرتا ہوا ہر حکمِ الہی میں ریب پیدا کرنے پر مہر کیوں ہونے لگا۔ ہر سادہ لوح
مسلمان سوچتا ہی رہ جاتا ہے، میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جو بھی میری مشکلات،
میری محرومیوں، میرے مصائب کی میسائی کا دعویٰ کرتا ہے، اقتدار حاصل ہوتے

ہی یہ کیوں سناتا ہے، یہ صورت حال مجھے ورثے میں ملی ہے، میرے پاس الہ دین کا چراغ نہیں ہے، میں اندرونی و بین الاقوامی حالات کی وجہ سے مجبور محض ہوں۔ کون سمجھائے کہ حضور لوگ مذہب بھی اپنی مشکلات، محرومیوں اور مصائب کے حل کے لئے اختیار کرتے ہیں، صرف نعرے لگانے کے لئے نہیں۔ مذہب کے نام پر قائم شدہ حکومت اگر افراد کو نجی آسائشوں اور حقوق سے محروم رکھے گی تو لوگ مذہب سے بھی مایوس ہو جائیں گے، اس کی افادیت سے منکر ہو جائیں گے۔ یہ محرومی لوگوں کو ہانک کر دہریت کی طرف لے جائے گی۔ جس ملک کے باورچی خانوں، مہمان خانوں اور استراحت کے کمروں میں سکون و اطمینان نہیں، اس مملکت کا کوئی مذہب نہیں۔ آسائشوں کے قبرستان تعمیر کرنے والے مسجدوں کو آباد رکھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ انقلاب اسلام کے پس منظر میں یہی سنا، یہی پڑھا، اتنے قتل ہو گئے، اتنے قتل کر دیئے گئے، اتنے پابند سلاسل ہوئے۔ اتنے کوڑے برس، اتنوں کی تحقیر ہوئی۔ اتنے رشوت دے کر بچے، اتنوں پر مقدمات قائم ہوئے۔ اتنے سازشی پکڑے گئے، اتنے سازش کا شکار ہوئے۔ فلاں چڑیا گھر میں شیر نے ذورہ کیا، فلاں میں لومڑ نے دربارِ عام لگایا کہ برخاست کر دیا گیا۔ کسی روز یہ خبر نہ آئی کہ اتنے اندھیرے گھروں میں آج پہلی بار شمع جلی، اتنے بھوکے بچوں نے دینگھیوں کا ڈھکنا اٹھایا تو پہلی بار یہ دیکھا کہ واقعی سالن پک رہا ہے۔ آج گلیوں میں ننگے پھرتے ہوئے اتنے بچوں کو نہلا دھلا کر پڑے پہنا سکول بھجوا دیا گیا، آج اتنے استادوں اور استانیوں نے رضا کارانہ طور پر حلف اٹھایا کہ وہ پرائیویٹ ٹیوشن کے لئے بچوں کے مستقبل تباہ نہیں کریں گے۔ آج اتنے بھوکوں نے دسترخوان کی طرف نگاہ اٹھائی تو واقعی چپاتیاں موجود تھیں۔ متوسط طبقہ کے اتنے لوگ سبزی اور پھلوں کی دکانوں سے لوٹ رہے تھے تو ان کی ٹوکریوں میں پھل اور سبزیاں تھیں۔ اتنے افراد نے دروازے پر منتظر بیویوں،

جوان بیٹیوں اور بہنوں کو خبر دی کہ روزگار مل گیا ہے۔ اتنے شرابیوں کو عفتِ نفس
 ملی کہ انہوں نے شراب کی بوتلیں گلیوں میں پھینک دیں۔ اتنے ہاتھوں کا اعتماد بحال
 ہوا کہ سرقہ سے تائب ہو گئے۔ اتنے ملازمین سرکار نے بغیر رشوت لئے اپنے سرکاری
 فرائض انجام دیئے۔ اتنے قاضیوں نے بلا خوف و طمع و رعایت انصاف صادر کیا۔
 اتنے ٹھیکیداروں نے خود اپنی بددیانتی کا احساس کرتے ہوئے سڑکوں اور عمارتوں کی
 مرمت نو شروع کر دی۔ اتنے افسروں نے ان سے کہا کہ ہمارا حصہ نہ دو، اس رقم
 سے تعمیرات کو دیانت آشنا کر دو۔ یہ تو تقاضائے دانش سہی کہ پرلوپے سیاست
 دان اگر پر نکالنا چاہیں تو انہیں سرکاری بیت المال سے پرہیز کئے جائیں۔ یہ
 بھی جانا ہوتا کہ انسان کو اگر دوسرے انسان اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے کی اجازت
 نہیں دیں گے تو وہ پتھروں کو سامنے رکھ کر اپنا دکھ بیان کرنا شروع کر دے گا
 اور بالآخر بت پرست بن جائے گا۔ جانا ہوتا کہ انسانوں کو خاموش کر دینا تو حید
 کے خلاف بہت بڑی سازش ہے۔ جیسے ثقافت کے خلاف اس سے بڑی اور
 کوئی سازش نہیں کہ ماؤں کو خاندانی منصوبہ بندی پر آمادہ کر لیا جائے۔ عورتوں میں
 ماں بننے کی خواہش کو زندہ رکھنا ارتقائے انسانیت کے لئے خالق کائنات کا معاون
 ہونا ہے۔ اور انسان کی زبان کو اس کے دل کی ترجمانی سے روک دینا اس کے
 خدا کو نااہل قرار دینے، اُسے اپنے خدا سے الکار پر مجبور کرنے کے مترادف
 ہے۔ پابندی خیالات کے مقہور معاشرہ کی جھولی میں ہر صدف بے گوہر ہوتا ہے۔ آبِ
 بے موج کے مگر مچھ لاکھ تازہ مچھلیاں کھائیں، اپنے جسم کو بدبودار ہونے سے نہیں بچا
 سکتے اور ہر چیز انہیں مچھلیوں اور مینڈکوں سے کوئی خطرہ نہ ہو، ایک روز اپنے ہی
 جسم کی بو سے ان کی شریانِ حواس پھٹ جاتی اور دل لہو ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر یہی
 اسلامی انقلاب ہے کہ ہر انسان شب بھر عالم خواب میں خود کو قتل ہوتا ہی دیکھتا

رہے تو پھر ہم اس دن کو دعوت دے رہے ہیں جب انسانوں کی دنیا میں
 الصلوة خیر من النوم کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اور
 مرغے بھی اذان دینے سے پہلے اپنے اہل و عیال کو سرگوشیوں میں کہہ دیا کریں گے،
 عادتاً اذان دے رہا ہوں۔ مجھ سے پہلی سی اذان لے مری محبوب نہ مانگ، تمہارا
 جی چاہے تو بیدار ہونا، نہ چاہے تو مزید لمبی تان لینا کہ ہمارے تمہارے گوشت
 کی دکان تو بعد از سہ پہر کھلتی ہے۔ فی الحال تو اس اشرف المخلوقات کو دیکھو کہ
 آتش گلستان نے روش روش ہر گل بوٹے کو جڑوں تک جھلس ڈالا اور باغبان
 کو اب بھی دعویٰ ہے کہ بلسل ناداں یونہی نوحہ کناں ہے، نیت صیاد میں ہرگز کوئی
 خلل نہیں۔ ہر انسانی ذہن کے مدفون مقتولوں میں مردہ خیالات محور قص ہیں۔ ہر
 انسان تنہائی میں یوں سوچتا ہے جیسے روز حشر اللہ نے اُسے ایک طرف بٹھادیا
 ہو اور فرشتوں کو حکم دیا ہو کہ پتا کرو اسے کس نے پیدا کیا تھا۔ جسے دیکھو غنچہ
 تو شگفتہ دور سے دکھاتا ہے۔ مُنہ سے کچھ نہیں پھوٹتا۔ لوگ اپنے ہی وسائل اور
 اہلیتوں کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے بھوکا اور لالچی جمان، میزبان کے بیمار مرغے
 کی طرف دیکھے۔ ہر دانش مند قاتلان عیسیٰ کی میسائی کا قصیدہ خواں ہے۔ ہر سقراط
 نے دیوان خانے میں شربت قوتِ آز کی بوتلوں پر زہر قاتل تحریر کر لیا ہے اور مدعی ہے
 کہ آج کا سقراط زہر سے نہیں، بہتاتِ قوتِ آز سے مرتا ہے۔ ہر افلا تعلمون افلاطون
 ہے۔ ہر بقرة العلم بقراط بنا بیٹھا ہے۔ ہر چنگیز علمدارِ عاقبتِ انسان ہے۔ ہر ہلاکو
 نمازِ استسقاءِ خونِ انسان کی نیت باندھ رہا ہے۔ تمام تکبیرات متکبر دعا و فلاح
 سے عاری ہو چکی ہیں۔ ہر آزرِ تخلیق اصنام پر اظہارِ افتخار کرتا نمود کے مدارجِ خدائی
 میں پیشگی اضافے کر رہا ہے۔ ہر خانہ یعقوب میں قتلِ یوسف کے مشورے ہو رہے
 ہیں۔ ہر یوسف کی نیند اس لئے حرام کر دی گئی ہے کہ یہ پھر کوئی خواب نہ دیکھ لے۔

ہر یعقوب نئی آنکھیں لگانے کے ہسپتال کا پتا پوچھ رہا ہے۔ ہر زینخا تھالی میں بیگن
 لڑھکتی، عزیز مہر کے دیدار کی منتظر سیلوں کے لئے سبب تراش تلاش کر رہی ہے۔
 ہر حاجرہ معصومیت اسمعیل کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑی ہے کہ بیاس سے
 جان بلب ہوں، اسمعیل سے ایڑیاں رگڑوا کہ میرے نشہ لب سیراب ہوں۔ ہر
 پدمنی کا تقاضا ہے کہ ایک بار آئینہ میں محمد غوری دکھا دو، زندگی بھر ساڑھی کا پٹو
 سنبھالوں تو آئینہ توڑ دینا۔ ہر عالم گیر متقاضی ہے کہ نیت مجذوب میرے قدموں
 میں ہے جسے دیکھو سو منات کی دیواروں پر قصائد نظام الدین اولیا تحریر کر رہا ہے۔
 جسے آگ لگ جاتی ہے وہی نورانی بن جاتا ہے۔ جس کی تشنگی سیراب ہو جائے، اس
 کے اندر سے دھواں اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر طرہ بقدر جہالت طویل ہے۔ جو
 کوئی ریش پر ہاتھ پھیرتا ہے، عقل پر پانی پھیر لیتا ہے۔ ہر حامل جام تہی منصب
 سقا پر مزین ہے۔ ہر میخوار تشنہ لب مدہوش ہے۔ تصوف اپنی بے معرفتی پر نازاں
 اور تعارف اعتراف بے تعلقی پر فخر کناں ہے۔ ہر حیوان ناطق اپنا نطق چاٹ رہا ہے
 اور سوچ رہا ہے کہ اگر ابراہیم صنم کدے تعمیر کر رہا ہو تو تحفظ مقام ابراہیم کے لئے
 مقالات تحریر کرنے والا مصنف کون سی لغت ہاتھ میں لے۔ اگر زمانہ مجبور کرے کہ
 برادران یوسف کے قصیدے مادر یوسف کے مزار پر بیٹھ کر یعقوب اپنے ہاتھ سے
 تحریر کرے تو خامہ خونچکاں اور فگار انگلیاں کیا سودگران کاروان یوسف کو دکھائی
 جائیں۔ اگر یہ قصائد تحریر بھی ہو جائیں تو بھاؤ کس کا بڑھے گا۔ قمیض یوسف کا، حص
 زینخا کا، سازش برادران یوسف کا، یا شب وصل عزیز کا۔ اور نگ زیب اگر
 خود پیغام بھیجے کہ ٹوکری میں بیٹھ کر چلے آؤ تو سیوا جی سے کیا پوچھیں کہ دشمن بطن
 افضل میں کیوں گھونپا۔ شیرانگن اگر خود عرض کرے کہ مرو آپ کی امانت ہے۔ تو
 جہانگیر بکون الزام لائے کہ قتل ناحق ہوا۔ اگر علمبرداران دین و مذہب احترام

انسانیت سے عاری ہو جائیں تو کیا جنگل کے درندوں کو آواز دیں کہ تحفظ امن
 انسانیت کے لئے تمہارا وجود ضروری ہے۔ کیا کریں۔ ان جلتے ہوئے انسانوں پر
 اُبلتا ہوا پانی ڈالیں کہ آبلے بیٹھ جائیں۔ ان خاکیوں کو رکھ میں دبا دیں کہ گرد آلود نہ
 ہوں اور اعلان کریں کہ اسلامی انقلاب کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ بنام مذہب
 اگر تشدد اور غارت گری روار ہے تو سورۃ الرحمن کس کو سنائیں۔ اپنے گھر میں پناہ دیئے
 جانے والوں کو ابوسفیان ہی قتل کر دے تو رحمتہ للعالمین کے تقاضے کیا ہوں گے۔
 اپنے ہی ہاتھوں سے امتِ کریم کو قتل کرنے والے کسی ہندہ سے کیوں کر کہیں گے
 کہ ظالم یہ تو عم رسول کا کلیجہ ہے۔ لوگو! جانو کہ جو انسانوں کی دنیا کو جنت جہا نہیں
 کرتا وہ اسلام نہیں ہے۔



عقل عیار ہے، سو بھیس بنا لیتی ہے

اگرچہ بالآخر نئے دستوری ڈھانچے کے کچھ خدو خال پر کار دھند لکوں سے برآمد ہو چکے اور مصنف نے ”لیس منسٹر“ کے کرداروں سے بھی بہتر مہارت کا ثبوت دیا، تاہم اندازہ ہے کہ مجوزہ صورت اور موعود وقت پر اگر کچھ کجال ہوا تو اسے مصلحتاً ۱۹۷۳ء کا آئین کہا جائے گا۔ ہو گا وہ کچھ اور ہی، جس کے انصرام سے کالعدم سیاسی جماعتیں معدوم ہو جائیں گی، موجودہ اقتدار سپریم رہے گا البتہ دعا گو فیض یاب ہو سکیں گے۔ بین السطور مارشل لاء اٹھ جائے گا اور تحت السطور بیٹھ جائے گا مگر میرے اس مضمون کا یہ موضوع نہیں۔ میرے زیر فکر یہ صورت حال ہے کہ بادل جو اُڑ رہے تھے اب گرج رہے ہیں اور برسنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ خیال ہے کہ میخانہ بہہ نکلنے تک برسنے کے ارادے ہیں۔ اس لئے اے لوگو! جو لاکھوں بے گور و کفن لاشوں کو بت کدوں کی اکثریت کی سر زمین میں چھوڑ آئے ہو، ایسے دلو زحادثات سے دوچار ہو چکے ہو کہ آج کے ہندوستان کی ایک پوری نسل اپنی ماؤں سے پوچھتی ہوگی، ہمارے ماموں، ہمارے نانا، ہماری خالہ کا کیا نام تھا۔ ماں! تو جو اس گھر میں جسونت کو کے نام سے جانی جاتی ہے، تیرا پیدائشی نام کیا تھا۔ تجھے تیرے بھائی، تیرا باپ کیوں چھوڑ گئے۔ لوگو! جو آج بھی کبھی خیالوں اور کبھی خوابوں میں اپنی بیٹیوں کی

لٹتی ہوئی عصمت اور بیٹوں، بھائیوں، ماں باپ، اعز و اقارب پر چلتی ہوئی
 بندوقیں، سنگینیں، برچھیاں اور اپنے آبائی مکانوں کو لٹاتا اور جلتا ہوا دیکھ
 کر ہر بڑا اٹھتے ہو، اپنے اکابر کے مقبروں کی زیارت تک سے محروم کر دیئے
 گئے۔ مسلمانو! جنہیں تاریخ ایسے وسوسوں میں الجھائے رکھنا چاہتی ہے۔
 جیسے تاج محل، شاہی مسجد اور لال قلعہ مان سنگھ یا سیوا جی نے تعمیر کروائے ہوں۔
 اور سلیم چشتی سے صرف جو دھا بائی کا رشتہ عقیدت ہو۔ لوگو! تمہاری دو تیز اور
 عصمت شعار بیٹیوں کے بال ہی نہیں، تمہاری جدائی اور اپنے مقدر کے ماتم
 میں دیدے بھی سفید ہو چکے ہوں گے۔ تمہیں اگر اپنی قربانیوں کا احساس نہیں
 تو اپنی منفعیوں کا ہی اندازہ کرو۔ چنانچہ اے آج کے صنعت کارو! اے خواجگان
 بلند مرتبت! اے سرمایہ بے پناہ کے خداوندو! اے افق تجارت کے روشن
 ستارو! اے وسائل سرزمین پاکستان کے اجارہ دارو! اے لشہ امارت
 عمارت میں سرشار تعیش پسندو! ہوش میں آؤ کہ بڑا وقت آگیا ہے۔ ۱۹۷۰ء
 کے انتخابات کے نتائج نے تمہیں دو لخت کیا اور اصل وجہ تم آج تک نہ جان
 سکے۔ تمہیں احساس نہ ہوا کہ ۱۹۷۰ء کے شفق سیاست کو تم نے نافھی سے
 آفتاب تازہ کی افق تابی گردان لیا۔ نہ جان پائے کہ یحییٰ خاں کے لیگل فریم ورک
 میں سقوط مشرقی پاکستان کا اہتمام تھا۔ اور یہ کہ ۱۹۶۲ء کے آئین نے مشرقی
 پاکستان کے علیحدہ ہونے کے لئے متحد اور مغربی پاکستان کے منتشر ہونے
 کے لئے مستعد ہونے کا جو اہتمام کیا تھا وہ اپنی تکمیل کو پہنچا چاہتا ہے۔
 احساس نہ ہوا، پر نہ ہوا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے مابین تمام فکر
 نظری، اور اعتقادی رشتے منقطع کروا کر کچھ سیاسی جماعتوں کی بے شعوری
 باقی کی وساطت سے پاکستان کو تین سیاسی فکری حصوں میں تقسیم کرنے

مکمل اہتمام کر کے فی کس فی ووٹ کی بناء پر کرائے گئے انتخاب قائد اعظم اور اقبال کے قائم کئے ہوئے شیرازہ کو یوں بچھیر دیں گے جیسے کوئی نادان بچہ گل دستہ کی دستی کاٹ کر اسے گلی میں پھینک دے۔ پاکستان میں ایک بھی ملک گیر سیاسی جماعت موجود نہ تھی۔ ایک طرف عوامی لیگ تھی۔ پنجاب اور سندھ پیپلز پارٹی کی ماہر اہلکاروں کی گرفت میں تھے۔ نشتر پارک، اقبال پارک اور موجی دروازہ ہونے والے سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹو کے ذریعہ پلٹنوں کی ملکی میدانی سیاسی ریشہ دوانیوں کے حوالے کئے جا رہے تھے۔ بلوچستان اور سرحد میں جن کی سیاست کار فرما تھی ان کا ٹھنڈا دروں اور اور مستقبل کے ارادے عدالتِ عظمیٰ کے فیصلوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ اگر پورے ملک میں اقتدار حاصل کرنے اور سالمیت کو برقرار رکھنے کی واقعی خواہش ہوتی یا اس کا استحکام پیش نظر ہوتا تو عوامی لیگ مغربی پاکستان میں بھی اپنی مقبولیت کو راسخ کرنے کا کوئی اہتمام تو کرتی۔ ایسا نہیں ہوا، ایسا عمداً نہیں کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کو سندھ اور پنجاب کے لئے چارٹرڈ ہوائی جہاز بھی میسر آگئے اور ہاتھی بھی۔ مگر کسی دیگر صوبے کے لئے شاید کرایہ میسر نہ آسکا۔ درحالانکہ روٹی پکڑا اور مکان کے نعرے باقی ماندہ صوبوں میں زیادہ آسانی سے مقبول ہو سکتے تھے۔ اس جماعت کا عملاً دو صوبوں تک محدود رہنا بھی عمداً تھا اور خالی از علت بھی نہ تھا۔ دیگر دونوں صوبوں کی سیاست نے اپنی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دے دی جن کا ہمیشہ اٹک پارہ نہ کرنے کا رویہ ریفرنڈم ہار جانے کی محاصمت کا شکار رہا۔ مذہبی مسالک کی علمبردار سیاسی جماعتوں کی لائبریریوں میں مفکر پاکستان اور معمار پاکستان پر کفر والحاد کے فتاویٰ کی دستاویزات خفیہ مطالعہ کے لئے

محفوظ تھیں۔ ان کے اسمائے گرامی بڑے پُر مغز اہتمام کے ساتھ استعمال
کئے گئے مگر ان کے فکر و عمل پر مزید دبیز پردے ڈال دیئے گئے۔ جو پہلے
خضر نواز تھے، تقسیم ہند کو ناگزیر دیکھ کر انگریز آقاؤں کے اشاروں اور ذاتی
مصلحتوں کے پیش نظر مختلف ہتھکنڈوں سے صفِ اول کے مسلم لیگی بن
گئے۔۔۔ پھر ری پبلکن بن کر کام نہ چلا تو کنوینشن مسلم لیگ کی ہنڈیا میں اپنی
دال گھوانے چلے آئے۔ کسی نے ملک کی مشرقی پاکستانی رسوائیوں کے
پیش نظر ”ہم ادھر تم ادھر“ والے خادم قوم کو بالآخر سول چیف مارشل لاء
ایڈمنسٹریٹر بنانے کا درپردہ ارادہ ہی کیا تھا کہ یہ مخمور فرشتوں کا ظہور دھارے
روٹیوں، کپڑوں کے طباق سجائے، مکالوں کے خیالی نقشے دکھاتے عوام
کو خوابوں میں نظر آنے لگے۔ یہ صورت حال دیکھی تو زمینی خداؤں کے پروردہ
پیشواؤں نے سوشلزم کے مقابلہ میں اسلام کے فلسفہ محنت و سرمایہ کو یوں
پیش کرنا شروع کر دیا جیسے اسلام سرمایہ دارانہ اجارہ داری کا دوسرا
نام ہو اور یوں قومی فکری رجحانات کو بظاہر نجات دہندہ اور بہ باطن گرگ
جہاں دیدہ کے سپرد کر دیا، اور نہ جانا کہ یہ کسی سیاسی مکتب کی نہیں ایک
ایسی شخصیت کی دریافت ہے جو مزاج کا سکندر بھی تھا اور مرزا بھی۔ سیاسی
جماعتوں کے منشور سے آگاہی تو گجیا، ہم نے یہ حساب بھی نہ لگایا کہ جنہیں
ہم نامور سیاست دان گردانتے ہیں، ان کا نوے فی صد تو قیام پاکستان کے
خلاف تھا۔ مجبوراً پاکستان تو قبول کرنا پڑا، نظریہ انہیں نہ قبول تھا، نہ ہوا۔
ہم اندازہ نہ کر سکے کہ ایسے لوگوں کی برپا کی ہوئی سیاسی فکر ہمیں کن کن تضادات
کا شکار مردہ بنا کر رکھ دے گی۔ ہم کہیں ایسی سیاسی شاہراہوں پر تولا کر کھڑے
نہیں کر دیئے جائیں گے جن پر لکھا ہو ”یہ سڑک پہلے پاکستان کو جاتی تھی“

۱۹۷۰ کے انتخابات نے پاکستان کو دو نہیں تین سیاسی حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک حصہ عوامی لیگ لے گئی، دوسرا عوامی لیگ کے انگریزی ترجمہ یعنی پیپلز پارٹی کے اثر و رسوخ میں سیاست کی کچی آبادیاں بنوانا اور گروانا رہا۔ اور تیسرا سیاسی تنازعات کی آماجگاہ بن گیا اور پاکستان اُس بازو کٹے انسان کا سا بن کر رہ گیا جس نے پوری آستین کی قمیض پہن رکھی ہو اور نعرے لگا رہا ہو، میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا، میں نے زرہ پہن رکھی ہے۔۔۔۔۔ عزیزو! آج کی صورت حال اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔۔۔۔۔ ۱۹۷۰ کے انتخابات نے ملک کے جس حصہ کو سیاسی طور پر تنازعہ بنا دیا تھا، جو کئی سال سول فوج کشی کی نذر رہا وہاں کے صوبہ پرست کابل جا بسے اور باقی ماندہ کانگریس نواز، قومیت پرست، مارول گھٹنا، پھوٹے آنکھ کی سیاست کو اپنائے، کبھی آنکھ کے علاج کے لئے اور کبھی گھٹنوں کے مساج کے لئے ماسکو، کابل، دہلی اور لندن کی یا ترا میں مصروف رہے اور ہر دفعہ ایسی دھول جھولی میں ڈال کر لائے جو نظریہ پاکستان کی نظر کو دور و نزدیک کی عینکوں میں مزید موٹے شیشے لگوانے کی اشد ضرورت کا احساس دلا سکے۔ قومی اتحاد کی ضرورت کس نے محسوس کی۔ جسے لوگ ڈھونگ بنانا چاہتے تھے، اُسے زندہ مثبت حقیقت کن محبانِ وطن نے بنایا، اُن میں ایک کا نام تو عبدالستار خاں نیازی ہے اور دوسرے کا ذکر ضروری نہیں۔ مگر وائے قسمت کہ اس قابلِ تعظیم دوست کو بھی چودھری عبدالحمید صاحب کا حبِ وطن کا آئینہ دار مضمون ”سیاست بے فراست“ ناگوار گزرا۔ نہ معلوم یہ طویل صحبت یاران کا اثر ہے یا سفرِ یورپ میں کوئی کوتاہی سرزد ہو گئی ہے۔ اتنے عظیم محبِ وطن کی سوچ بھی اگر حبِ وطن سے عاری ہونے لگے تو جس بھٹی میں عوام جلنے والے

ہیں، اُس کی آگ کو ”کوئی بردا“، کون کہے گا۔ عظیم دوست! میرے لئے تو اب بھی سابقہ نہیں ہے مگر تیرے زخموں کا علاج فکرِ اقبال میں ہے، فتاویٰ عالمگیری میں نہیں۔ کوئی پاکستانی تمہیں کرگسوں میں پلتا ہوا فریب خوردہ شاہین تسلیم نہیں کرنا چاہتا۔ سیاست واقعی بے فراستی کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ مارشل لا کا نفاذ کسی لادین کو ہی پسند ہو سکتا ہے مگر اس کی چھتری تلے جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہونے والا ہے، وہ کسی وردی میں نہیں، ایک قریباً سو سالہ ڈھانچے میں چھپا ہوا ہے۔ قومی اتحاد کے خلاف جن سازشوں نے ایک نئے اتحاد کو جنم دیا، ان کی بالواسطہ نشاندہی کو سیاست بے فراست نہیں کہا جاسکتا۔ جن نظریات کو تیری جوانی کی جدوجہد نے شکست دی تھی، وہ ری پبلکن پارٹی کے فکری راہ نما و سربراہ بن کر چھا گئے اور آج جو کچھ ہو رہا ہے، یہ اسی فکری اقتدار کی پرچھائیاں ہیں۔ درونِ خانہ پاکستان کی سیاست کے آج کے نامور بر ملا نظریہ پاکستان کے مخالف رہے ہیں۔ اور کچھ تو سجدہ شکر بھی ادا کرتے رہے ہیں کہ ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہ تھے۔ اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہو گا کہ مسلم لیگ اپنی سیاست کی شکست کے اعتراف میں ”بانگیں“ دے اٹھی ہے اور اپنے فکری ”سرینڈر“ سے بے شعور اقتدار کے ”سرینڈر“ ہونے کی فال نکال رہی ہے۔ جس ملک میں سیاست ایسے لوگوں کے ہاتھ آ لگی ہو جو اسے ”لجھی پینر خدا دی، نہ دھیلے دی نہ پاڈی“ کی دھیمی دھیمی سڑوں پر موزوں کر رہے ہوں اور بین الاقوامی طور پر ملک ”سینڈ وچ“ ہو کر رہ گیا ہو، وہاں کے محبانِ وطن اگر بلور کے گھروں میں بیٹھ کر ڈھانچوں کے اشاروں پر پھینکے جانے والے پتھروں کے اصل نشانہ کا پتا بھی نہ لگا سکیں، تو اپنے مقدر کو رونے کا کون سا طریقہ استعمال کیا جائے

نئے اتحاد میں موجودہ نفاق بین الاقوامی اشاروں پر ہے۔ ایک ہی اسٹیج پر دوپتلی گرا کر بیک وقت تماشا دکھا رہے ہوں، تو یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ سفید ریچھ گرم پانیوں میں غسلِ صحت کے لئے بے قرار ہے۔ غنسال روانہ کر چکا اور کفن فروش اپنے دستوں کے عقب میں رکھے ہوئے ہے۔ اگر قیامِ پاکستان کے بدترین مخالف درآکر یہاں مستقل طور پر سیاستِ پاکستان پر چھا سکتے ہیں، تو آج بھی انسانی ہمدردی کی سادگی کسی اس سے بڑے ورود کا ذریعہ بن سکتی ہے۔۔۔۔ سفید ہاتھی اپنی خلیجی ریشہ دوانیوں کے لئے عقبی دروازہ اور سنگِ کنار قرار دے رہا ہے۔ جانتا ہے کہ پاکستان سے اٹھو سوخ اٹھا تو نہ صرف مغربی یورپ کے حواری تباہ حال ہو جائیں گے بلکہ اس کے لئے پورا بحرِ ہند آدم خور مگر مچھوں سے اٹ جائے گا۔۔۔۔۔ دونوں میں سرد جنگ جاری ہے۔ ایک طاقتِ پاکستان میں اپنے فکری اثاثے بکھیر رہی ہے تو دوسری سرمایہ کاری کے پردے میں اسلام کے اس قلعے پر لہرانے والے پرچم کے ستارے کو چھ کونہ بنانے پر تلی ہوئی ہے، اپنی جارحیت نوازی کو عدم جارحیت کی مہاتما بدھی پر اٹھ پڑھا رہی ہے۔۔۔۔۔ دونوں سپر طاقتیں ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اس سرد جنگ کو گرم جنگ میں تبدیل کر کے عالمی جنگ کا خطرہ مول لیں۔ لازماً ایک دن مذاکرات کے لئے کوئی گول میز تلاش کریں گی۔ ان مذاکرات کے دوران اپنے اپنے مفادات محفوظ کر کے اگر انہوں نے کوئی دستاویز تیار کی تو اس سرزمین کا نقشہ کیا ہوگا جو ہماری غیر پاکستانیت کی وجہ سے آج تک اس لسانی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کو ہمارے سیاسی افلاک پر مسلط رکھے ہوئے ہے، جو انگریز نے اپنی سامراجی سیاسی ضرورتوں کے لئے روارکھی تھی۔ یہ لسانی و نسلی

تقسیم پاکستان کو اپنے نرغے میں لٹے ہوئے ہے اس کی حدود کچھ اس طرح متعین ہیں کہ پاکستانی علاقائی زبانیں بولنے والے پاکستانی سرحدوں کے اُس پار بھی ہیں۔ آرپار کی اس لسانی و نسلی تقسیم کو متذکرہ بالا مذاکرات کے دوران اپنا اپنا مفاد محفوظ رکھنے کے لئے اگر پھیلا دیا گیا، تو کیا ہوگا۔ اس کے تصور سے بھی حب الوطنی کو لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ان مذاکرات کے دوران تیار ہونے والی دستاویز کے مندرجات کے لئے فکری، قلبی و ذہنی تضاد نے ۱۹۷۳ء سے لے کر آج تک بڑی بھرپور تربیت و پرورش حاصل کی ہے۔ ہم اس سے نہ بچے تو آج کا ہر محب وطن غدار قرار دے دیا جائے گا اور کینہ پرور مینار پاکستان کو یادگار پاکستان قرار دینے کی قرار داد ترتیب دینے لگیں گے۔ بدیں حالات ان مسلکی پیشواؤں کا کیا ہوگا جو یورپ سے افریقی فکر لے کر آئے ہیں اور اپنی دکان کے بورڈ پر نئی عبارتیں تحریر کروا رہے ہیں۔ ان حالات کا مقابلہ دستگیری سیاست یا بنی اسحاقی معیشت کے بس کا روگ نہیں، نہ ہی اس کا یہ کوئی علاج ہے کہ سرحدوں کے محافظوں کو سپر آئیٹی کردار پر لگا دیا جائے۔ اور جیل خانوں کو نئے مہمانوں کی فرستیں مہیا ہوتی رہیں۔ خلیج کے تیل کی حفاظت سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بلا تاخیر خوش اسلوبی سے مارشل لاء کے نفسیاتی تاثر کو یوں ختم کیا جائے کہ ۱۹۶۵ء کے جذباتی رشتے پھر عود کر آئیں اور قوم یہ محسوس کرے کہ وہ جو سرحدوں پر واپس جا رہے ہیں، ان کے ہی بھائی اور بیٹے ہیں جنہوں نے نگرانی کو سہو تسلیم کر کے نگہبانی کے فرائض پھر سنبھال ہیں۔ میں نے ۱۹۷۵ء میں دریائے چناب کے نئے پل پر دو افسروں اور چند سپاہیوں کو ایک خستہ حال فوجی ٹرک کو دھکے لگاتے ہوئے دیکھا تھا تو میں آبدیدہ بھی ہوا، اور انتظامی

مقتدر کو ملامت کا نشانہ بھی بنایا۔ آج کے نئے ٹرک میں سیاست کی میت
 لدی دیکھ کر اپنی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا خود میرے لئے بھی آسان نہیں
 کہ میں کسی ایسے جہاز پر سوار نہیں جس کے عرش سے فرش نظر ہی نہ آتا ہو۔
 خلاؤں کی بانیں ہم حشرات الارض کے لئے آسان ہو بھی کیوں کر سکتی ہیں۔
 صرف اتنی عرض ہے کہ حکیم بزرگانِ سیاستِ پاکستان پرانے ریفرنڈم کے
 زمانہ کی جس پالیسی کو اپنایا جا رہا ہے اور نئے سیاسی اتحاد سے نئے مشورے
 جو سلوک کر رہے ہیں، وہ سپر پاوروں کے آئندہ مذاکرات کی تیاریوں کی کڑی
 ہیں۔ اس ٹرک کو روکئے، کہ آگے پُل ٹوٹ رہا ہے۔ پُل جس کے پار سنہ
 یافتہ محبانِ وطن سیاسی قوالی کا رہے ہیں۔ ”ہر لحظہ سیاست کی نئی آن
 نئی شان۔ گفتار میں کردار میں بھگوان کی برہان۔“



جی سکتے ہیں بے روشی دانش و فرہنگ

ابراہیم خلیل اللہ کی کارِ خارا گدازی کو پروردہ ملوک دانش و فراست نے صدیوں سے عجیب فرہنگ کی خارا تراش سان پر چڑھا رکھا ہے۔ خود تراشیدہ بتان و ہم و گمان پر نقش نگاری و رنگ آمیزی کے لئے دانش افرنگ سے یوں اعانت حاصل کی جا رہی ہے کہ بندگانِ خدا سا جہانِ زمانہ بن کر رہ گئے ہیں۔ صد حیف کہ بعض تہیوں میں سگے پرولئے گئے ہیں اور ان پر صبح و شام ذکرِ الہ جاری ہے۔ آج یہ فرہنگ و افرنگ زدہ دانش صدیوں کی فکری غلامی کو آزادیِ افکار کا نام دیے، جس طرح مبہوت آن اپنائے محوِ نفس و تماشا ہے اس کی مثال فکرِ سکوس کی دنیا میں ”زلقبین سنور چکی ہیں، قشقہ لگا رہے ہیں،“ مصوّر کر کے لانا تو شاید قطعی درست نہ ہو لیکن یہ قرار دینا خلاف واقع نہ ہوگا کہ زبور کا سنگیت، گیتا کی موسیقی میں سمو کر رہ گیا ہے۔ مڑلی دھر کرشن مکھن چراتے کی بجائے یعقوب کی چتکبری بھیریں سرقہ کر کے تانیں اڑا رہے اور انسانی چراگاہوں کا دل بہلا رہے ہیں، اور خوب بہلا رہے ہیں۔ زبور و تورات و انجیل کی وہ تحریف جس کی نشان دہی کرنے اور دانشِ انسانی کو یک سو کرنے کے لئے نزولِ قرآن ہوا، نہایت پرکاری سے تعلیماتِ قرآن کا حاشیہ بنا دی گئی۔ قرآن پاک تحفظِ الہی میں رہا اور رہے گا مگر داستانِ طرازی، ترجمہ اور انسانی عقل و

فکرِ ناقص کو بنیاد بنا کر بیان کی گئی تاویلات و تفاسیر نے پیشانیوں کے حجابوں پر وہ، وہ گل کھلائے کہ انسانی روح پریشان و لیپشان ہو گئی۔ انسانوں کی دانش فروشی نے قرآن، تاریخ اسلام اور فکر و عمل و کردارِ مسلمان میں بُعدِ مشرقین و مغربین سے بھی زیادہ طویل فاصلے قائم کر دیئے۔ آج کے انسان کا کرب و انتشار اس انسان کی کیفیتوں کا سا ہے جسے غلطی سے ابراہیم جان آتش نمرود میں پھینک دیا گیا ہو یا پھر اس حاکمِ وقت کا سا، جس نے شبیہ سے دھوکھا کر کسی غیر عیسے کو مصلوب کر دیا ہو۔ آج کی دنیا کے انسان یعقوب کو خون آلود کرتہ دکھاتے ہوئے برادرانِ یوسف بن کر رہ گئے ہیں۔ اگرچہ ہر انسان کی رگوں میں آدم کا خون دوڑ رہا ہے، ہر انسان کا دوسرے انسانوں کے ساتھ دودھ کا رشتہ ہے پھر بھی انسان بکھر چکا ہے، انسان ٹوٹ چکا ہے، انسانیت پھوٹ گئی ہے۔ یہ لاریب انسانی دانش کی تعلیم و تربیت کا حاصل ہے کہ اخوت و مساوات، بے لوث محبت، بے غرض لگاؤ اور تعلق محض افسانوی ادبی اصطلاحیں بن کر رہ گئی ہیں۔ انسانی تاریخ اور زمینی جغرافیہ یوں باہم دست و گریباں ہیں کہ ہر انسان بازو دکھانا پھرتا ہے کہ یہی وہ ہے جس کے ساتھ کبھی میرا ہاتھ پیوست تھا اور اس پر بندھی ہوئی یہ پیٹیاں کبھی میرا گریباں ہوتی تھیں۔ ہر انسان دورے انسان کا مشرقی پاکستان نظر آنے لگا ہے۔ جسے دیکھو وہ شل ہے، جسے پاؤ وہ سقوط زدہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ خالق کائنات کے تخلیق شدہ خلیفہ نے ایک اپنی اراضی پر بھی اللہ کی آئینی و قانونی حاکمیت قائم نہیں رہنے دی۔ اس مسجود ملائک کے احساس یا اس وقتو طیت کے زیر اثر اس سے وہ کارستانیاں سرزد ہوئیں کہ خالق و مالک ارض بے ملک ہو کر رہ گیا ہے۔ جس جمعندی و خسرہ گرداوری کو اٹھاؤ اس میں کسی نہ کسی انسان کا قبضہ و ملکیت مندرج ہے۔ کسی اہل کار کا مالک و قابض بلا شرکتِ غیرے بن اصل مالک کو

فقط صدقات و خیرات پر ٹالنے کا عمل بڑا نتیجہ خیز سانحہ ہوتا ہے۔ تاریخِ حاکمیت انسان کا میدانِ کربلا سے گزرتا ہوا، رومن، اینگلو سیکسن لاد کا شمع بردار جلوس دراصل ان کربناک راہوں پر گامزن ہے جن پر سنگِ میل شہنشاہوں نے اپنی حدِ نظر کے لئے نصب کر رکھے ہیں۔ ان شاہراہوں پر ان شہنشاہوں کی تیز رو، روشنیاں گھماتی اور سائرن بجاتی ایمبولینسیں انسانی ضمیروں کے مدفن کی تلاش میں دن رات گھومتی رہتی ہیں اور اعلان ہوتا رہتا ہے کہ شہ آدنے جنت تیار کر لی ہے، نمرود نے آتش کدہ دہکا لیا ہے۔ عوام الناس خود فیصلہ کر لیں کہ انہیں کہاں بسنا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ فیصلہ کرتے وقت جمہوری اصول زیر نظر رہیں کہ اکثریت کا فیصلہ ہی راجح ہوگا۔ اگرچہ راج خالقانِ بالا کا ہی ہوگا۔ ان شمع بردار جلوسوں کا سفر اتنے سانحات و حادثات کا سفر ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے، اتردہوں کی وادی سے ننگے پاؤں گزر رہے ہیں۔ واضح نظر آتا ہے کہ تریاق آنے تک مارگزیدہ کی شریانِ دانش پھٹ جائے گی۔ اور ہم جن کی نمازِ جنازہ کا امام میکالے چلا آ رہا ہے، ہم جنہوں نے اپنے عزاداروں میں ہمیشہ ہیگل، کارل مارکس، لینن کو بھی موجود پایا ہے، ہم جو مجاہدین بدر کو اصحابِ کہف کی غاروں میں دھکیلنے کے عادی و ماہر ہیں، قرآن میں ذوالقرنین کے بیان کو اس طرح سنتے ہیں جیسے نانی اماں سے چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا کی کہانی سن رہے ہوں، ہم جو امثروں کے روایات اور حقیقتوں کے خرافات میں کھوجانے اور تمدن، تصوف، شریعت، کلام کے بتانِ عجم کے پجاری بن جانے کے عمل کا منظر ہیں، روحِ اسلام سے اس حد تک نا آشنا ہو چکے ہیں کہ اللہ کی حاکمیت، قیامِ صلوٰۃ، مشاورت، انفاقِ رزق کو مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ سیکولر نظام کے ہم دامن قرار دے کر اپنے شعلہ سوزاں کو دود کھنے کے مرتکب ہیں اور ہمارا یہ تقاضا ہے، ہماری یہ فراست و دانش و سیاست ہے کہ ہم ایسے ہیں۔ اللہ کی حاکمیت کی

بات کرو۔ انسانوں کی حاکمیت کے ذریعہ نظام سیاست کی نفی کرو۔ تو پیشانی سیاست
 تو کجا سرکاری ذرائع ابلاغ کا غنازہ بھی دکنے لگتا ہے اور سیندوری آنکھیں گھورنے لگ
 جاتی ہیں۔ چہروں پر لالی یوں تمنا اٹھتی ہے جیسے ہر آفتاب کو اسی شفق میں غروب ہونا
 ہے۔ مسلمانوں کو راکھ کا ڈھیر بنائے رکھنے پر مصر آج کا فرہنگ وافرنگ زدہ سرکاری
 درباری دانشور اپنا تحفظ اسی میں پاتا ہے کہ تخت کے پاٹے ہی نہیں، تکلیف تخت
 نشین بلکہ پایہ تخت مسلسل لرزتا رہے۔ تاکہ تخت نشین کے دریافت کرنے پر یہ
 اطلاع لاتے رہیں کہ ایوان کے باہر زلزلہ آیا ہوا ہے۔ اس معلق زمین پر ہر چیز متزلزل ہے۔
 بساط یوں بچھی رہے کہ ہرے دست بستہ بھی رہیں اور شہ نشین لرزتا بھی رہے اور یوں دانش
 کی دور سے لائی ہوئی کھوٹی کوڑیوں کے عوض افراط زر سے ملمع کی ہوئی کوڑیاں وصول
 ہوتی رہیں۔ اللہ کی حاکمیت کا نام لو تو بندوں کی خدائی کے جمہوری علمبردار بلکہ خود ساختہ خدا
 وہائی دے اٹھتے ہیں کہ آزادی انسان خطرے میں ہے۔ اللہ کی حاکمیت قائم ہوئی تو بنیادی
 حقوق کی چٹانوں سے لاوا پھوٹ نکلے گا۔ عوام کی طاقت کے سرچشموں پر حماد یو بیٹھ جائیں
 گے۔ آئینی پارٹی سیاہ ساڑھی پہن کوچہ بہ کوچہ ورلاپ کرنے لگے گی۔ تمدن برباد ہو جائے
 گا۔ تہذیب رجعت پسند ہو جائے گی۔ ڈیمو، بیو، تھیو کریسیاں بے گھر ہی نہیں بے گورڈ
 کفن بھی ہو جائیں گی۔ اللہ کے بے راہ بندو! انسانوں کی حرمت کی اس سے بڑی ضمانت
 تاریخ انسان نے آج تک جتیا نہیں کی کہ کوئی انسان اپنی مرضی دوسرے انسانوں پر
 مسلط کرنے کا اہل نہ رہے۔ المحکم اللہ کا اعلان الہی اور جو اللہ کے احکامات کے مطابق
 حکومت نہ کریں، ان پر عائد کردہ قرآنی قدغن ایسے لاثانی ضمانت آئین ہیں کہ شرف
 انسانی اور حریت انسان کے تحفظ کا اس سے بہتر سیاسی عمل نہ تجویز کیا جاسکتا ہے،
 نہ عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ اللہ کی حاکمیت کا نفاذ اللہ سے راضی اور اللہ کے راضی
 ہو جانے کا عمل ہے۔ یہ اللہ کے سوا کسی اور کے الہ نہ ہونے کا نظام ہے۔ اگر نظام

لا الہ الا اللہ پر خطر ہے تو نظام کائنات میں عافیت کا کوئی اور مقام بھی نہیں۔ اللہ کی
 حاکمیت نہ ہو تو انسان خلیفہ نہیں رہتا، خود حاکم بن جاتا ہے۔ کسی کو خلیفہ قرار دینا
 یہ قدغن لگانا ہے کہ تم حاکم نہیں ہو، تمہارا سہرا امر اللہ کے احکام کا پابند ہوگا۔ تم لوگوں
 کے نگہبان اور لوگ تمہارے نگران ہوں گے اور امور مملکت میں تمہیں مشاورت کا
 پابند رہنا ہوگا۔ تمہارا طریق مشاورت بھی آزاد نہیں ہوگا۔ مشورہ دینے والے بھی احکام
 خالق کے پابند ہوں گے اور اپنی فکر کو حدود الہی سے آزاد نہیں کریں گے۔ وہ ہر کام میں
 اللہ کے راہ نما مشورہ کی استدعا کرنے والے یعنی صلوات قائم کرنے والے ہوں گے، مہموف
 پر عمل کر کے عارف بن چکے ہوں گے اور منکر کی نہی کر کے قدم قدم پر دانش انسان کے
 طاغوتی بتوں کو ہوا اللہ احد کہنے پر مجبور کرنے والے ہوں گے۔ جسے مشورہ کہتے ہیں وہ
 حقیقہ نہیں ہوتا، برسر عام ہوتا ہے۔ انسان اگر خلوت میں وہ بات نہ کرے جو جلوت
 میں کر سکے، چھپ کر وہ کام نہ کرے جو برسر عام نہیں کر سکتا تو اس کے اور ولایت کے
 درمیان فاصلے از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ عوام کو حقائق سے بے خبر رکھنا برہمن پن ہے۔
 میکاؤلی کی سیاسی تربیت میں ہندومت کے پورانوں کا بہت بڑا حصہ ہے، اگر آریہ ورت
 نے سووی لین دین کا رواج قائم نہ کیا ہوتا تو شاید مغرب کے نظام سرمایہ داری اور مابعد
 سوشلزم کیمیونزم نے انسانوں کی معصومیت اور دانش و فراست کو یوں محسورج
 نہ کیا ہوتا کہ آج کا ہر انسان اپنے ہی ضمیر کے خون میں
 ہاتھ ڈبو رہا ہے۔ خلافت بندوں کی حاکمیت کی ایک لفظی نفی ہے جو قطعی بھی ہے
 اور قاطع بھی۔ انسانی حاکم اور پتھر کے دیوتا میں صرف یہ فرق ہے کہ حاکم کا حکم ترشا
 ہوا پتھر ہے جسے قانون کہہ کر وہ انسانوں کی آزادی کو سنگسار کرتا ہے اور پتھر کا
 دیوتا وہ ہے جسے انسان خود تراشتے اور خریدتے ہیں۔ اور اس کے روبرو دوزانو
 دست بستہ بیٹھ کر اپنی خواہشات و ضروریات کا اظہار کرتے ہیں۔ غور کریں تو مغربی

جمہوریت اور آریائی بت پرستی میں کیا یہی فرق نہیں رہا جاتا کہ آریہ ورت نے عبادت
 کے لئے جو انداز اپنایا، افرنگ نے اسی کو سیاست میں اپنا کر ڈیموکریسی کا نام دے دیا۔
 آئیڈولیٹری نے ڈیموکریسی کا روپ دسا کر سیکولر ازم کہلوانا شروع کر دیا اور بالآخر
 ہندومت اور مغربی جمہوریت میں صرف مردہ بتوں اور زندہ اصنام کا امتیاز باقی
 رہ گیا۔ دین سیاست سے الگ ہو جائے تو سیاست بت پرست ہو جاتی ہے۔ یہ سب
 سیاسی گل آریہ دانشوروں کی "تمستے" کے کھلائے ہوئے ہیں۔ یہ سبھی کچھ آواگونی کثرت
 الوجود انسان کے فلسفہ کی دین ہے۔ اگرچہ غیر آریہ کمرشن کی گیتا نے اس فلسفہ کا رُخ
 پھیرا مگر اس کی تعلیم بھی بت گری و بت پرستی کی نذر ہو گئی۔ اکثریت کی بے راہ روی اور
 اقلیت کی بے بسی و گمراہی کے اس نظام کا مثبت علاج یہ ہے کہ ہم دو ٹوک فیصلہ کریں
 کہ ہمیں میکا ولی نہیں زندہ ولی درکار ہے اور قرآن سے بڑھ کر کوئی زندہ و پائندہ ولی
 کائنات میں موجود و مؤثر نہیں جس کی ہدایت سیاست، اللہ کی حاکمیت، نظام
 خلافت، مشاورت، اتفاق رائے اور بیعت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ امرہم شوریٰ
 بینہم کے حکم کی تحریف کر کے مغربی جمہوری اسمبلیوں کو مجالس مشاورت قرار دینا
 مندروں کی گھنٹیاں مسجدوں میں نصب کر لینے اور محرابوں پر نادان سجدوں کے
 نقوش اجاگر کر لینے کا عمل ہے۔ جہاں جملہ امور مملکت میں اول و آخر تمام نیک کردار
 شہریوں کا مشورہ عملاً و انصافاً، اتفاقاً نہیں بلکہ "متفقہ" شامل نہ ہو وہاں اسلام
 کی سیاست رو بہ عمل نہیں۔ اگر یہ کہنا جرم ہے تو زمانہ اپنی صلیب کا نام بتائے
 کہ فقیر نے اپنا نام منصور رکھ لیا ہے۔ یہ دلیل لانا کہ یہ عملاً ممکن نہیں اپنی ناواقفیت
 اور اعتقادی کمزوری کا ثبوت لانا ہے۔ اے توانائی کے متلاشی زمانے! ایک توانائی
 قوت ایمان بھی ہے جو ناپیدا اور مفقود ہو جائے تو انسان کی ذات اس کے جسم سے
 شکست کھا جاتی ہے اور وہ تخریب و تشدد پر اتر آتا ہے۔ ہم ان اوہام میں گرفتار

ہو گئے ہیں کہ ہم بے دانش و دولتِ افرنگ زندہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ہمارا قصور نہیں، ہمارے گزشتہ ڈیڑھ صدی کی تعلیم و تربیت اور بارہ صدیوں کی گمراہی کا فیض ہے۔ ہم خود گریباں ہو چکے ہیں۔ اور اپنے بال و پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ ذہنی گرفتاری سے آزاد ہونا آسان کام نہیں۔ انسان کو اپنی بُت شکنی کرنا پڑتی ہے۔ اپنے تصور و تخیلاتِ مادہ زدہ کی نفی آسان ہوتی تو انسان پردہ تہذیب میں اس غارتگری و آدم کشی کو روانہ رکھتا جو قرونوں سے برپا ہے۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام ہے۔ ہم اس کیفیت سے آزاد ہو جائیں تو اسلام کا نظام سیاست مغربی جمہوریت سے کہیں زیادہ مثبت، سہل اور قابلِ عمل ہے۔ جس میں سہونہ ہو، وہی سہل ہوتا ہے بشرطیکہ اسے مصنوعی آرائش و زیبائش سے عاری و غیر موثر نہ کر دیا جائے۔ ہم اگر چاہیں تو آج بھی گاؤں سے لے کر مرکزی سطح تک سرعام مشورہ سے متفقہ طور پر مجالسِ مشاورت قائم کی جاسکتی ہیں۔ ہر سطح پر مشاورت سے متفقہ فیصلے کئے جاسکتے ہیں۔ ایک عام دیہاتی تک کے شعور کو اتنا پختہ بنایا جاسکتا ہے کہ چرواہے کو بھی عامل بنا دیا جائے تو وہ بھی تاریخ کو سہرے باب عطا کر جائے۔ ان مجالسِ مشاورت کے ذریعہ معروف کو نافرمان اور منکر کو مردود بنایا جاسکتا ہے۔ رشوت، بددیانتی، بے انصافی غرض کہ تمام تر معاشرتی عیوب کا قلع قمع کیا جاسکتا ہے۔ نظامِ قیامِ صلواتیوں رائج کیا جاسکتا ہے کہ نعمتِ علیہم کا معاشرہ وجود میں آجائے۔ اہل الرائے کا متفقہ انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ امیر مملکت متفقہ طور پر چنے جاسکتے ہیں۔ جملہ امور پر متفقہ فیصلوں کا نظام نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور اولی الامر منکم کی۔ اور اگر اختلاف رائے واقع ہو جائے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹ کر ایک رائے ہو جانے کی عملی تصویر پیش کی جاسکتی ہے۔ ایک ایسا نظام جو یہ تاثر پیدا کرے کہ امیر مملکت کو تمام قوم کی متفقہ حمایت حاصل ہے، تمام مجالس

شوریٰ میں معاشرہ کے فقط متقی اور دانشور شامل ہیں، مازامِ کار اللہ اور رسولؐ کے پسندیدہ افراد کے ہاتھوں میں ہے، ہر شخص اللہ کا خلیفہ اور شریکِ کارِ امورِ مملکت ہے، یہ اعتماد ہی معاشرہ، حکومت اور ریاست کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اس سے عاری حکومت منافق نہ بھی ہو تو بھی منافقت پر مجبور ہو جایا کرتی ہے۔ میکانی سیاسی بوزنوں سے چٹکارا حاصل کرنے کا واحد علاج خلافت و مشاورت کے نظام کا نفاذ ہے۔ دیدہٴ عبرت نگاہ ہو تو اپنے حالات دیکھو اور گوشِ نصیحت نیوش ہو تو فقیروں کی صدا سنو، کہ بانگِ درامحلوں سے نہیں بلند ہو کرتی۔



مری دانش سے آفرنگی مرا ایمان کے زناری

غالبِ خسۃ، کہ جس کے بغیر دنیا کا کوئی کام بند نہ تھا، نہ زمامِ کار اس کے ہاتھ میں تھی، نہ پاؤں اس کے رکاب میں تھے، نہ حاکمِ وقت تھا نہ سربراہِ مملکت و طیفِ خوار تھا، شاہ کو دعا دیتا تھا اور ماتم کناں تھا کہ نوکر ہو کر رہ گیا ہوں۔ عشقِ پیشہ تھا، محض حُسن پرست تھا۔ شاعر تھا مگر شاعری ذریعہ عزت نہ تھی۔ سولپست سے شیوہِ آبا سپہ گری تھا مگر ہر حسین نگاہ دل سے جگر تک اتر جاتی تھی۔ ہاتھ میں جنبش نہ رہی مگر تقاضا یہی رہا کہ ابھی ساغر و مینا میرے آگے رہنے دو۔ تاہم اُسے بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ محبوب جس کے تصور میں رات دن پڑے رہنا اس کی سرشت تھی، اُس کے ہاں آٹے تو رقیب کو ساتھ لے کر آئے اور مستی کے آئے اور ایک ہم پار سیاست دان کہ زمامِ کارِ حیات ہماری فراست کی حمایت کچھ شاہ، کچھ شاہ کے ہم رکاب، پلک جھپکیں تو قانون بدل جائے، ابرو پہ آٹے تو قانون کی تشریح نئے لبادے اور ڈھلے۔ عوام کی فکر و ذہانت ہمارے روبرو راکھ، اُن کا عمل ہمارے سامنے ساجد، پھر بھی ہم شیدائے اسلام متقل ہیں کہ اسلام آئے تو ساتھ اپنے رقیب مغربی جمہوری نظامِ حکومت کو لے کر آئے اور سرمایہ دار بدست کے جلو میں یوں آئے کہ غنچہ نوشگفتہ ہمیں دکھاتا رہے۔

اور غرض گلگوں سرمایہ دار کے تصرف میں رہیں۔ بہتر حوروں کے تصور کی ہر منبر
 پر صلیب نصب پا کر جو اسلام الامان والحفیظ پکارتا تلاش ایزدی میں سرگرداں
 تھا، ہم سیاست دانوں نے نہایت پرکاری سے تہتر کے آئین کے ہتھے چڑھا دیا
 اور ذوق جرات میں ہم نے جس طرح مجروح کیا، وہ محتاج بیان ہے بھی تو تاب بیان
 کہاں سے لائیں کہ کوڑوں کی مار سے تسبیحوں کی مار کہیں زیادہ کرب ناک ہوتی ہے،
 ملک بدر ہونے سے دین بدر ہونا زیادہ تکلیف دہ و صبر آزمایہ ہے۔ تلوار کا کاٹا تو ہو
 سکتا ہے، کچھ دیر سسک لے، عطر آلود موٹے ریش کا کاٹا تو پانی بھی نہیں مانگتا۔
 گھر سے نکالا ہوا تو شاید پس دیوار گزر کر لے، راندہ درگاہ پیشوائیت کو کوئے یار
 میں تو کجا، قبرستانِ رقیباں میں بھی گوشہ عافیت ملے کہ نہ ملے۔ دنیوی حاکم تو
 جینا ہی حرام کرتے ہیں، از خود ساختہ کلید بردارانِ جنت ناخوش ہو جائیں تو موت
 کو بھی حرام قرار دے دیتے ہیں۔ زندگی حرام ہو جانے سے جنازے کا حرام ہو
 جانا تو ہر کسی کو تسلیم ہے۔ زیادہ تکلیف دہ ہے، اپنے لئے بھی اور پس ماندگان
 کے لئے بھی۔ خدا کی حاکمیت اور بتدگانِ ناخدا کی حاکمیت اور وہ بھی ناخدا یا ان
 سرمایہ کی، اتنی ہی غیر مشترک ہیں۔ جتنا کہ توحید و شرک..... عطر و شراب کی پیدا
 کردہ فضائیں بھی مختلف ہوتی ہیں، عمل بھی اور رد عمل بھی۔ شبِ برات کی روشنیاں
 اور دیوالی کے دیئے کتنے متضاد افعال و اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ بخشش و
 نجات دونوں میں مانگی جاتی ہے۔ ایک میں رجوع و خشوع و سجدہ کے ذریعہ اور
 دوسری میں جوئے اور بُت پرستی کی طفیل۔ عید اور بیساکھی دونوں خوشی کے تہوار
 ہیں، دونوں میں رقصِ روح و جسم کے زلزلہ کا فرق ہے۔ ۱۹۷۳ کے آئین پر اصرار
 شبِ برات و دیوالی، روزِ عید و بیساکھی بیک وقت منانے کے تقاضا کے مترادف
 ہے۔ جیسے کوئی دین دار مقرر ہو کہ دورانِ سجدہ سبحان ربی الاعلیٰ نہیں پکاروں گا۔

فرطِ عبادت میں ”ہے جمالو“ لٹکار ”میںوں پنج کے یار مناون دے“ برپا کر کہ
حرفِ محبت نہ ترکی ہے نہ تازی اور اگرچہ ہم سب غازی ہیں مگر معرکہ حیات میں
حیات طلب غازیوں کے فیض سے دل نہ تیرا مسلمان ہے نہ میرا۔ وارِ منصور دکھاؤ
یا فتاویٰ منشور۔ مگر حرم آشنا دیر بان دانشور سیاست دانوں، مستقبل کے
مقدربین جو کچھ بھی لکھا ہو، فقیر یہ صدائے انتباہ لگاتا ہی رہے گا کہ اگر وطن عزیز میں
اسے تم نے اقتصادی آزادی کے لئے حاصل کیا ہو، یا تعمیلِ ایمان کے لئے، یہ
معاشی تقاضوں کا حاصل ہو یا ذوقِ اطاعتِ الہی کا، مغربی جمہوری نظامِ حکومت
کو روا رکھا گیا۔ اور قیامِ حکومت یا انتقالِ اقتدار کیلئے مغربی جمہوری طریقِ انتخاب کو
اپنا یا گیا تو ہم جن کی دانش افرنگی اور ایمان زناری ہے، ایک مکروہ عذاب کو اپنے
اذہان و قلوب و اجسام پر طاری کر لیں گے اور جان لو! کہ صوبہ صوبہ، قریہ قریہ سقوط
طاری ہو جائے گا۔ پہلے ہم سکر گئے تھے اب ہم بکھر بھی جائیں گے اور بگڑ بھی جائیں
گے۔ اسلام، مغربی جمہوریت اور سوشلزم کے بیک وقت علمبردار جو بظاہر بنیادی
انسانی حقوق کی بحالی کے ”بھندڑانوالے“ بنے ہوئے ہیں، انسان ہی نہیں انسانیت
بھی گنوا بیٹھیں گے۔ اگر کسی نے قرآن پاک کی سورۃ الشوریٰ کا مطالعہ کیا ہے اور
اس کی صداقت، افادیت اور الفردیت پر ایمان بھی ہے تو انکار ممکن نہیں ہوگا
کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شرعِ دین و آئین مقرر کر رکھی ہے کہ اللہ کی حاکمیت اور اس ہی
کی اطاعت کا نظام قائم کیا جائے۔ گروہ بندی ہرگز نہ ہو، اختلافات کو ختم کیا
جائے اور یک رائے و یکسو ہونے کے لئے ہدایت و راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے
اللہ ہی کی طرف لوٹا جائے۔ اقامتِ دین و آئینِ اسلام، حاکمیتِ الہی، انسانی
اطاعتِ الہی جن لوگوں پر گراں گزرے، جو اس سے گریز کریں، اس سے فرار حاصل
کرنے کی راہ نکالیں، وہ مشرک ہیں۔ اور مشرک تو پھر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ

کی حاکمیت کے مسلم ہونے کے باوجود حیلوں بہانوں سے اپنی حاکمیت قائم کر لیتے ہیں۔
 کیا یہ لمحہ فکریہ نہیں کہ ہمارا دین تمام انسانیت کے فکری اختلافات ختم کرنے کا
 داعی ہے اور ہم ہیں کہ دین میں ہی تفرقات برپا کرنے کا باعث بن گئے۔ بلکہ صدیوں
 سے بنے ہوئے ہیں۔ خود برصغیر میں گزشتہ صدی میں ہم نے کتنے دینی فرقے وضع
 کر ڈالے۔ ہم بُت شکنوں نے مندروں کے تمام بُت اپنے اذہان میں سجالے اور
 اسلام سچا ہے کی بجائے ہم نے ”ہم صادق ہیں“ کی جنگ شروع کر دی۔ انسان جب
 عقل و دانش و ایمانِ خدا کے سوتوں اور سرچشموں سے بے پروا ہو کر قرآن لاریب
 سے علم کے حصول کے لئے بھی ایمان بالغیب کی بجائے تشکیک کو بنائے تحقیق و
 حصولِ علم قرار دے لیتا ہے تو پھر یہ طالبِ علم جو علم حاصل کر پاتا ہے وہ خدا اور
 خدا کو دلیلوں کے غلاف میں لپیٹا رہتا ہے اور ایسے ہی علم کی کوکھ سے تفرقہ بازی
 جنم لیتی ہے۔ مومن اگر یہ حقیقت فراموش کر دے کہ قرآن پاک ایک ایسی واحد
 کتاب ہے جس میں بیان کردہ علم اور اس علم کی تحقیق و حصول کی بنیاد تشکیک پر
 نہیں ہے، ما جب کہ دنیا کے تمام علوم کی عمارت تشکیک کی بنیادوں پر استوار
 ہے اور مزید استوار ہو رہی ہے۔ سچائی کی تلاش اور قطعی سچائی جان جانا مختلف
 کیفیتیں ہیں، جو یائے راہ ہونا مگر نا آشنائے منزل ہونا اور دانائے منزل ہونا
 اور پھر دانائے راہ ہو کر سرگرم سفر ہونا نہ ایک سی صورت حال ہے نہ ایک سی
 کیفیت۔ بھٹکے ہوئے راہی اگر ایک دوسرے سے منزل و راہِ منزل دریافت
 کر رہے ہوں تو انہیں طالبِ علم تو شاید کہا جاسکتا ہو، عالم و آگاہ تو نہیں کہا جا
 سکتا۔ خدائی صفات و دانش اور انسانی عقل و عمل میں مماثلت و متشابہات تلاش
 کرتے رہنے کا عمل نہ دیانت دارانہ ہے نہ صحیح ہے۔ کاش انسان قائل ہو
 جاتا کہ اُمّ القریٰ میں اُمّ الکتاب کا اُمّ اللسان میں ایک اُمّی پر نازل کرنا دانش

خداوندی کا مظہر ہے اور یہ عمل اپنی تشریح کے لئے عقل انسانی کا محتاج نہیں، تو یہ امر واضح ہو جاتا کہ سب سے بہتر عمل نیکی و بدی، اچھائی و برائی کا میزان و معیار احکام الہی کو بنانا ہے۔ امور حیات و ریاست میں لوگوں کی خواہشات و حرص و آرزو نفسیاتی کو راہ نما بنانا یا اس کی پیروی کرنا اور اس کے زیر نظر آئین و قوانین و رسوم و رواجات وضع کرنا گھاس پھوس کی جھونپڑی میں سردی سے بچنے کے لئے تیز تند لو کی آگ دہکانے کا سا عمل ہے۔ اللہ کے عمل اور انسانی فعل میں فرق شاید اس امر پر غور کرنے سے واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی تقسیم جنسی طور پر کرتے ہیں تو خلقت بڑھتی ہے، مجتمع ہوتی ہے۔ انسان جماعت بناتا ہے تو خلقت تقسیم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رزق کی تقسیم میں کمی بیشی اور انسانوں کے حصول رزق میں کمی بیشی پیدا کر دینے کے طریقوں اور نتائج میں کتنا بڑا فرق ہے۔ کیا اتنا ہی نہیں جتنا تعمیر و تخریب میں ہوتا ہے۔ سورۃ الشوری کے مطابق ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت قائم کر رکھی ہے، ملائکہ تک پریشان رہتے اور ان کی ہدایت و مغفرت کے مستحق رہتے ہیں۔ لیکن ہماری اسلامی فراست اس حد تک مفقود ہو چکی ہے کہ ہم مغربی جمہوری سیکولر سرمایہ دارانہ نظام کے لئے ہلکان ہو رہے ہیں۔ بہت ہی مجبوری ہو تو مغربی سیکولرزم یعنی ”حکومت مذہب سے فاصلے پر رہے“ کے اصول کو اکبر کے دین الہی کے اصول میں یعنی ”حکومت ہر مذہب سے قریب ترین برابر فاصلے پر رہے“ مدغم کر کے آئین وضع کر لیتے ہیں۔ حالانکہ صراطِ مستقیم کی ایک تعریف یہ بھی قرآن میں درج ہے کہ انسان اپنی فکر میں اس ایمان کو سرفرست رکھے، راہ نما بنائے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر شے پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور ہمہ وقت ذہن نشین رکھے کہ تمام امور کا اس کی طرف لوٹ جانا اور لوٹایا جانا آئین اسلام کی اساس ہے۔ امور کی فکری ابتداء و انتہا پر اسی حقیقت کو قادر رکھے اور یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے

قرآن پاک کو انسانوں کے لئے نور بنایا تاکہ اس کی روشنی میں وہ یہ جان سکیں کہ صراط مستقیم کیا ہے۔ اور ان انسانوں کے لئے نور بنایا جو نہیں جانتے تھے کہ اللہ کے آئین و دستور میں کیا درج ہے اور اس کی کتاب آئین و دستور کے ضمنات کیا ہیں۔ صراط مستقیم معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسانی عقل کی پیدا کردہ دلیل و حجت لانے کی بجائے اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کے احکام کی تلاش کی جائے۔ کہ اللہ کے احکام حق بھی ہیں اور متوازن بھی اور یہی احکام نیکی اور برائی میں امتیاز کا معیار ہیں۔ انسانی عقل و علم و دانش پر وضع کئے گئے تمام آئین و قوانین قرآن پاک میں احکام الہی کے نزول کے ساتھ ہی کالعدم و غیر قانونی ہو گئے اور اس کے بعد انسان اگر اپنی عقل و دانش سے یا اپنی مادی خواہشات و رجحانات و ضروریات کی تکمیل کے لئے کوئی آئین یا قانون وضع کرے گا یا جاری رکھے گا تو غیر اسلامی فعل ہوگا۔ سورۃ الشوریٰ کے مطابق ہی جس آئین کی منزل اُخروی زندگی ہے، اس کا حاصل مقدار میں بھی زیادہ ہے اور فائدہ میں بھی اور جس آئین کی منزل دنیوی زندگی ہے، اس کا دنیا میں کچھ فائدہ تو حاصل ہوگا مگر اُخروی زندگی میں اس پر عمل کرنے والوں کے حصے میں کچھ نہیں ہوگا۔ انسان خود فیصلہ کر لیں کہ مختصر عرصہ کے لئے معمولی فائدے اور مستقل محرومی میں انہیں کوئی احساس امتیاز حاصل ہے یا نہیں۔ میں حقیر انسان رعب نہیں ڈال رہا۔ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے شرع حکومت کے علاوہ کوئی اور شرع آئین و قانون نافذ کرنا بالآخر عذاب الہی کو دعوت دینا ہے۔ یہ جن کی تقلید میں آج کا سیاست دان فراستی مجنون ہو گیا ہے، وہ کس قلبی کرب میں مبتلا ہیں، کاش جانا ہوتا تو عذاب الہی کے نزالے انداز سمجھ میں آگئے ہوتے غارتگری و آدم کشی کے آلات ایجاد کر کے بظاہر سپر طاقت بن بیٹھنا، مگر ان ہی ایجادات کے خوف سے ہمہ وقت لرزاں

رہنا کیا عذاب کی ایک صورت نہیں ہے۔ کیا یہ ایسا ہی نہیں ہے جیسے جتنے والی نے
 سانپ جن لیا ہو۔ انسان ساختہ آئین و قوانین کا یہ مقدر ہوتا ہے کہ انسان اپنی
 آئینی و قانونی ایجادات سے خوف زدہ رہتا ہے۔ انسان جس قسم کی زندگی کا قلبی
 طور پر متمنی ہے، وہ فقط شرعِ الہی کے نفاذ سے ہی ممکن ہے۔ اسی سورۃ میں یہ نوید
 ہے کہ آئینِ اسلام کے نفاذ سے راعی اور رعایا میں فرد اور افرادِ معاشرہ میں وہ
 محبت پیدا ہوتی ہے جو قرابت داروں، عزیزوں اور خوئی رشتہ داروں میں ہوتی
 ہے۔ گویا سبھی ایک ہی خاندان کے فرد بن جاتے ہیں۔ اے لوگو! اے حاکمو!
 سنو! غور کرو۔ اللہ تعالیٰ ایک نرالی بات کہہ رہے ہیں۔ انسانی وسائل کا انسانی
 ضرورتوں سے زائد ہو جانا بغاوت کا باعث ہوتا ہے۔ اگرچہ تاریخ آج تک یہی
 لکھتی رہی ہے کہ انسانی وسائل کا انسانی ضرورتوں سے کم ہو جانا انسانوں کو
 بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ اے لوگو! اے حاکمو! اپنا انداز نگاہ بدلو تاکہ بغاوت
 کے سرچشمے تمہیں نظر آسکیں۔ اے انسانی آئین سازو! آسمانوں اور زمین پر جانبدار
 مخلوق کو ایک روز اکٹھا ہونا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آئین و احکامِ الہی کے
 نفاذ کے ذریعہ انسان یوں اکٹھا رہنے کی اہلیت حاصل کر لیں۔ اے نوعِ انسان!
 تیری تمام مصیبتوں کا باعث تیرے انسان ساختہ آئین و قوانین ہیں۔ انسانوں کے
 لئے قانونِ فطرت کو شکست دینا ممکن نہیں۔ اس لئے عاقبت اسی میں ہے کہ وہ اپنی
 دنیوی عقل کی مدد سے آئین و قانون سازی اور ضابطہ حیات وضع کرنے سے بازو
 ممنوع رہیں کہ یہ کاوش لا حاصل بھی ہے اور دعوتِ عذاب بھی۔ شرعِ الہی کی مثال
 سطحِ سمندر پر پہاڑوں کی طرح بلند جہازوں کی سی ہے جن کو متحرک رکھنے کے لئے اللہ
 ہوا کو اپنے حکم کے تابع رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا نظام انسانی معاشرہ
 میں ساقط ہو جائے تو دیگر احکامات نافذ کرنے والوں کو ان کی اپنی اختیار کردہ شرع

ہی برباد کر دیتی ہے، حکومتیں اپنے ہی احکامات کی وجہ سے برباد ہوتی چلی آئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ جو لوگ احکام الہی کو نافذ نہیں کرتے ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہوتی۔ شرع مملکت اسلام کے بنیادی اصول ہیں، مگناہ ہائے کبیرہ اور فحاشی سے اجتناب کرنا، غصہ کو غالب نہ آنے دینا، معاف کر دینا، اپنے رب کے ساتھ استجاب رکھنا۔ قیامِ صلوٰۃ کرنا، مشاورت کرنا، جو کچھ اللہ نے عطا کیا ہے، خلقِ خدا کے لئے استعمال و خرچ کرنا، اہلیتوں کو اور ان سے جو کچھ حاصل ہو عوام الناس کے لئے کھلا رکھنا، اگر کوئی زیادتی کرے تو دفاع کرنا، ظلم و زیادتی ہو تو فقط اسی کے مطابق سزا دینا۔ مگر اصلاح احوال کا باعث ہو تو معاف کر دینا۔ ظلم و بغاوت پھیلانے پر سخت سزا دینا مگر عزم امور کے لئے صبر کرنا اور معاف کر دینا۔ یہ اصول سورۃ الشوریٰ میں ہی درج ہیں۔ یہ سبھی کچھ وارد نہ ہو تو نظامِ خلافت وارد نہیں ہوتا۔ صرف امرِ شوریٰ بینہم کا ذکر کر کے اسی سورۃ میں مندرج باقی احکامات الہی کو فراموش کر دینا اور معزلی جمہوری نظام کے حق میں دلیل لانا قرآن پر ایمان رکھنے والوں کو تو زیب نہیں دینا چاہیے۔ جو لوگ یہ طریق کار اختیار نہیں کریں گے، مادہ اپنے کئے پر، اپنے آئین و قوانین و احکام پر ایک دن پشیمان ہوں گے مگر جائے رفتن نہ ہوگی۔ وہ اپنے لئے خود ایک ایسی آگ دہکالیں گے کہ لاچار و مجبور ہو کر، نہیں معذور ہو کر آنکھیں جھکاٹے، مگر ذہن نیہوڑائے کھڑے ہوں گے اور ان کی کیفیت اس آدمی کی سی ہوگی جس پر جرم ثابت ہو گیا ہو اور ابھی سزا سنائی جانے والی ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایسے خسارہ میں محسوس کریں گے جیسے کسی نے خود اپنے آپ کو اپنے اپنے خاندان کو تباہ و برباد کر لیا ہو۔ ہر انسان پر، ہر سیاست دان پر، ہر حکمران پر یہ واضح رہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو منصبِ راہِ نمائی زیبا نہیں۔ جسے شوقِ قیادت ہو وہ اللہ کی راہ نمائی قبول کرے، اس کی اطاعت اختیار کرے۔ اللہ کے

سوا دیگر ان کو راہ نما بنانے والوں کی کیفیت اس مجرم کی سی ہوگی جو نہ جرم سے انکار کر سکے، نہ سزا سے بچ سکے۔ انسانوں کو خوشی عطا کرنے کا منبع اللہ کا رحم و کرم ہے۔ اور غم اور دکھ ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔ اور انسان کی ایک اور بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ جب اس کے اعمال کی وجہ سے اُسے دکھ آئے تو عمداً ناشکرا ہو جاتا ہے۔ آئین و قانون سازی اور اپنی عقل و دانش، ہوشیاری اور چالاکی پر بھروسے کی سزا کھانے لوگ تو ہم اپنی مختصر تاریخ میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ کیا ہم میں عبرت کی توفیق بھی نہیں رہی کہ پھر اسی گناہ کے اعادہ کا تقاضا کر رہے ہیں۔ آؤ! التجا کریں۔

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
میری دانش ہے افزنگی، میرا ایماں ہے زنا رسی



ایک بچٹ ، دو چھٹیائے ! کوئی بتلاؤ ، کہ ہم بتلائیں کیا

صاحبو ! اس ایک بچٹ اور دو چھٹیوں نے ، مجھ بچوں کے باپ اور ان ہی بچوں کی ماں کے مابین تنازعہ کھڑا کر دیا۔ لوگوں کے بھگو ان روٹھتے ہیں مجھ کرموں ہارے کی بھاگو ان روٹھ گئیں۔ وہ بڑے انہماک سے بچٹ تقریر سن رہی تھیں۔ میری طلب سے چائے کی مانگ یہ کہہ کر سرزد ہو گئی کہ چھوڑو بھی ، کار خسر واں خسران خسران۔ سرکاری حساب کتاب کی بات ہے ، میزان مارنے کے یہ طریقے اور سلیقے آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ وہ چمکیں ، بچٹ تقریر تو میں خوب سمجھ رہی ہوں۔ آپ فرمائیے۔ یہ کار خسر واں خسران خسر واں اور دانست سے کیا مراد ہے۔ یہ بات آسان زبان میں کیوں بیان نہیں ہوئی۔ میں نے کہا ، الفاظ کی بچٹ کے لئے۔ بولیں ، یہ بچٹ بھی بچٹ کے لئے ہے بلکہ بچاؤ کے لئے بھی میں نے کہا وہ کیسے۔ بولیں ! بڑے دعوے ہیں لوگوں کو زبان دانی کے ، اور یہ بھی نہیں معلوم کہ عربی زبان میں ، یعنی خدائی زبان میں ”ٹ“ نہیں ہوتی۔ اس لئے ہر بچٹ عربی تلفظ میں بچٹ ہی ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ قطع نظر اس امر کے کہ حرف ”ٹ“ مذکور ہوتا ہے یا مؤنث ، بھلا بچٹ کو اردو میں کیا کہتے ہیں۔ بس بھڑک اٹھیں۔ وہی کہتے ہوں گے جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے۔ سنتے نہیں ، سود ختم ہو رہا ہے رزقِ حلال کی ضمانت دی جا رہی ہے۔ صدیوں کا نظام بدل رہا ہے۔ وہ کیا جا رہا ہے

ہم نے اپنے گھر کے بجٹ کو متوازن کرنے کے لئے جو سازشیں کیں، مادہ ہماری گھریلو ریاست کے "سٹیٹ سیکرٹ" ہیں جو بچوں کے پوچھنے یا بتانے کے نہیں۔ دورانِ گفتگو انہوں نے نشان دہی کی کہ میری سیاست نے میری فکر کو منفی کر دیا ہے۔ میں اپنی اصلاح کروں ورنہ محض اصطلاح بن کر رہ جاؤں گا۔ اور کچھ نہ کچھ لگائے بغیر گھر نہیں چلے گا، خواہ دفعہ ۱۲۴ ہو۔ کرفیو ہو یا اس سے بھی بڑھ کر کچھ اور۔ میں نے بھی سمجھایا کہ اس بجٹ پر اور آئندہ بجٹ پر بھی جو تنقید ہوگی، وہ صرف اس لئے ہوگی کہ بغضِ سیاست اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ جو بجٹ بنائے، وہ سنائے بھی۔

دورِ سیاست بھی ہوتا تو بھی بجٹ وہی بناتا جو آج سنا رہا ہے اور سناتا وہ جس کو آپ کی طرح میزانیہ کے معنی بھی معلوم نہ ہوتے۔ جھگڑا صرف ٹیلیوژن پر اتنی دیر تصویر آنے کا ہے۔ دیکھ لینا چند دن بعد کوئی صوبائی بجٹ نشر کرے گا۔ اگر وہ یکے از میدانِ سیاست ہوگا تو کوئی تنقید نہیں ہوگی۔ روزے لوگ خاموشی کے بھی رکھ لیتے ہیں۔ کوئی عیدی دینے والا چاہیے..... سمجھایا کہ یہ جو اربوں کا خسارہ ہے ہلکان نہ ہوں، عربوں کا خسارہ نہیں ہے، اپنا ہی ہے۔ پورا ہو جائے گا۔ گرانی بڑھی ہے تو بہت کچھ گھائے میں بھی گیا ہے۔ آخر ملک چلانا ہے۔ کسی منٹے نے چابی والی گاڑی نہیں چلانی۔ اس امر کو قابلِ ستائش جانو کہ اقتصادی نظام بدل رہا ہے آج اگر سود اور ربا میں فرق نہ جانے بغیر کوئی غیر سود مند بجٹ تجویز بھی ہو گیا ہو، اگرچہ پتلا ہر ایسا نہیں ہے۔ تو بے سود جھگڑانے میں فائدہ۔ رُخ بدلا ہے تو راہ بھی بدل جائے گی۔ اور ربا کے حرام قرار دیئے جانے کے بعد اسے عملاً حلال قرار دینے کے لئے زمانہ گزشتہ میں جو توجیحات و توضیحات وضع کی گئیں، اجرت، منافع، شرکت کے پردہ میں جو اقتصادی دیواریں اللہ کے موعودہ فضل کی شاہراہوں پر کھڑی کر دی گئیں، واضح ہونے لگیں گی اور ہم انہیں پھلانگنے کی بجائے توڑنے کے طریقے بھی ڈھونڈ

نکالیں گے۔ شکر ہے کہ مغربی صنم خانوں میں ترشے ہوئے پاسبان ایمان تو لانے لگے۔
 چونکہ واقفِ رازِ درونِ مینجانہ ہیں اس لئے شراب نہ بدلنے اور فقط جامِ بدلنے کی
 ہوشیاری سے بھی باسانی آگاہ ہو جائیں گے۔ قرآن پر طہنے لگے ہیں تو قرآن کا
 وارد ہونا بھی شاید دور نہ ہو۔ جلی کٹی سنانے کے لئے اس بجٹ کو بیوروکریسی کا بجٹ
 بھی کہہ دیا جائے گا، جیسے بعض ماؤں میں ساس بیدار ہو جاتی ہے تو وہ اپنی تخلیق
 کو زن مرید کہنا شروع کر دیتی ہیں۔ مادرِ زاد کا زن مرید ہو جانا ایسے ہی ہے جیسے
 اللہ کی تخلیق پر بندوں کی حاکمیت قائم کر دی جائے۔ جیسے بیمار ساس بڑی طعن پرست
 ہوتی ہے، اسی طرح بیمار سیاست بڑی طنز نواز ہوتی ہے۔ ورنہ کسے نہیں معلوم کہ
 کہ ڈیموکریسی میں بھی بجٹ بیوروکریسی کا تیار کردہ ہی ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ بیوروکریسی
 پری اصل میں ڈیموکریسی ہی کا جڑ ہے۔ سمجھایا، کہ یہ بجٹ خوف زدہ ہے
 احتیاطوں کا ڈسا ہوا ہے۔ اس میں خامیاں اس کی مضحمت بینی کی وجہ سے ہیں۔ یہ
 بجٹ اگر دو ٹوک، بے خوف و بے باک ہوتا تو مزید تعمیری ہوتا۔ تعمیر نو کے لئے
 عمارت گرانا ہو تو دریغ ضیاع وقت ہی نہیں، کوتاہ اندیشی بھی ہے۔ دیکھو نا! اگر
 میں بے دھڑک چائے نہ مانگتا اور آپ کو دکھا کر زبان ہونٹوں پر پھیرتا، مانتھے
 کو دباتا تو شاید آپ اب تک مجھے لٹا کر میرے کانوں میں بادامِ روغن ڈال
 چکی ہوتیں۔ کسی بھی چیز کو پورے کینوس پر نہ دیکھنا اور جزئیات پر تنقید کرتے رہنا
 اس آدمی کا سا عمل ہے جو مور کو پاؤں پر نظر ڈالے روتا دیکھ کر خود بھی رونا شروع
 کر دے یا پوس ماگھ کی شدید سردی میں لحاف اوڑھے گا رہا ہو "ساون آیا،
 تم نہیں آئے،" میں نے سمجھایا۔ یہ بیوروکریسی کا بھی نہیں ٹیکنو کریسی کا بجٹ ہے۔
 صوبوں کا نہیں، منصوبوں کا بجٹ ہے۔ ہر صوبے کو یہ سمجھانے کا بجٹ ہے کہ
 اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی۔ تو اگر میرا نہیں بننا نہ بن اپنا تو بن۔ بلکہ

کر دیا۔ بولیں، بس بس بہت رلبط و ضبط کا مظاہرہ ہو چکا۔ ایک ہی دعا کیوں نہیں
 مانگ لیتے کہ میرے اللہ۔ مجھے میرے سنی پن سے نجات دے۔ پھر بولیں۔ اللہ آپ
 کو شفا دے کہ مجھے سیاہ دوپٹہ پہننا ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ بتائیے آپ کو صحافی کی مونت
 آتی ہے۔۔۔۔۔ وہ سکول ٹیچر کی طرح میرے چہرے کو دیکھ رہی تھیں اور میں بغلیں جھانک
 رہا تھا۔ خفت مٹانے کو میں نے کہا۔ لفظ صدر کی بھی کوئی مونت نہیں ہوتی۔ ہائے اللہ!
 صحافیات کو یہ سوال صدر سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ میں نے کہا۔ خانہ عقل سے جراب
 اتر گئی ہوگی۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟۔۔۔۔۔ اور سن لو! سبب تقریر، رہی سہی بھی گئی۔
 دنیا صدیوں سے کہتی آئی ہے، مونتین کی عقل ٹخنہ میں ہوتی ہے اور اسی لئے شاید
 عورت کو ٹخنہ ڈھانپنے رکھنے کا بھی حکم ہے۔۔۔۔۔ بولیں۔ چلو کہیں ہوتی تو ہے۔
 مردوں کی طرح اس حد تک عاری بھی نہیں ہیں عورتیں کہ عورت کو ماں بھی کہتے ہیں اور
 کم عقل بھی۔ حکومت نے دو چھٹیاں اس لئے کر دی ہیں کہ بے چارے عورتوں سے ہفتہ وار
 عقل سیکھ لیا کریں۔ یقیناً صحبت صالح ترا صالح کنند پیش نظر ہوگا۔ متواتر ۲۸ گھنٹے کی
 قربت سے بچوں سے واقفیت میں اضافہ بھی ہوگا۔ کم از کم دو دن تو دفتری لباس دھونے
 اور استری کرنے سے جان چھوٹے گی۔ کم از کم دو دن تو پوری نیند سولیا کریں گے آپ۔
 دو دن کے متواتر آرام سے کچھ تو چہرہ چڑا پن کم ہوگا۔ ری کری ایشن بھی میسر ہوگی اور
 اپنی کری ایشن کی طرف بھی توجہ دے سکیں گے۔ میں نے کہا کیا مطلب!۔۔۔۔۔ یہی
 آپ کی اولاد۔ ہمارے بچے۔۔۔۔۔ یہ میں نے کری ایٹ نہیں کئے۔ نہ میں ان کا
 کری ایٹر ہوں۔۔۔۔۔ تو کیا بازار سے لائے گئے ہیں یہ۔ سڑکوں پر پڑے ملے تھے ہمیں
 ۔۔۔۔۔ زبان کی تصحیح فرمائیے۔ میں والد ہوں ان کا، خالق نہیں۔ ہم پے رینٹ ہیں
 ان کے۔ کری ایٹر نہیں۔۔۔۔۔ بولیں جو کچھ بھی ہے، ان ہی کی دیکھ بھال کے لئے
 دو چھٹیاں کر دی گئی ہیں، اخبار چکنے کے لئے نہیں، ضرورت رشتہ، برائے فروخت،

کرائے کے لئے خالی، مشتری ہوسٹیاں باس، قتل و اغوا، ٹریفک کے حادثات،
 نہ کوئی کام کی خبر نہ اطلاع۔ لیڈی ڈیانا امید سے ہیں۔ صوبے محرومیت کا شکار ہیں۔
 ہیروئن سمگل ہو رہی ہے۔ سیاست دان صوبہ بدر ہو رہے ہیں۔ فلاں فرکاروں کے
 چنگل سے آزاد ہو گیا۔ چڑیا گھر کے جنگلی جانور انسانی غفلت کا شکار ہو گئے۔ عالم دین اغوا
 ہو گئے۔ تلاش و برآمد کرنے والا تھا نیدرلینڈ خوری میں پکڑا گیا۔ امریکہ میں سردی کی لہر
 آگئی۔ قطب شمالی پر برف گھلنے لگی۔ آج بدھ وار ہے کل کے موسمی حالات یہ ہوں گے۔ بس
 سن لیجئے۔ آئندہ آپ چھٹیوں کے دنوں میں اخبار نہیں پڑھیں گے۔ آپ کو معلوم ہے ما
 امراض قلب کی یہی سنسنی خیز خبریں ذمہ دار ہیں۔ کام کے دنوں میں ہی رات کو سونے سے
 پہلے گزشتہ صبح کے اخبار کی سرخیاں سنا دیا کروں گی۔ میں نے کہا فن صحافت سرخیاں جمانا
 ہی نہیں ماخبر کے آخر میں دو ایک فقرے جمانا بھی ہے۔ جسے فن نہیں آتا وہ صحافی نہیں
 خالی مرد ہے یا عورت۔ صحافت اور ڈپلومیسی جڑواں نہیں ہیں۔ دونوں کی اصل
 دانش پیش الفاظ ہوتی ہے۔ لہذا اخبار کا چکنا مفید نہیں، کریدنا اصل سلیقہ ہے....
 اچھا تو غالب پر یہ شعر بیگم کو اخبار پڑھتے دیکھ کر ہی وارد ہوا ہو گا۔ سہ جلا ہے جسم
 جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا۔ کریدتے ہو اب جو رکھ، جستجو کیا ہے.... اور میں آپ
 سے کہتا ہوں۔ کریدتی ہو اب جو رکھ جستجو کیا ہے.... اے توبہ! آپ کے
 بچوں کی ماں ہوں۔ وکیل مخالف نہیں۔ جو بات بات پر بال کی کھال اتارے چلے
 جا رہے ہیں آپ.... گھر دیلوں سے نہیں چلا کرتے۔ دلوں کی ہم آہنگی سے چلا کرتے
 ہیں۔ فقط دکھ بیان کرنے سے نہیں، دکھ سکھ میں شریک ہونے سے ماحول خوشگوار
 ہوتا ہے۔ اچھا! چھٹیوں میں گھر میں آمد و خرچ کا حساب لکھنا اپنے ذمہ لے لیجئے
 کوئی اور سزا تجویز کر لیجئے۔ میں نے ایک روپے کی پانچ سیر چینی، چار آنے سیر
 گوشت، اڑھائی آنے گز لٹھا اور ملل، سات روپے گز کا ولایتی گرم سوٹ اکپڑا

دس روپے سوٹ بمع سلاٹی، پچاس روپے کی ساہیوال کی بھینس، چالیس روپے کی پوٹھوار کی گائے، اٹھارہ آنے من گندم، چار روپے من کپاس کا زمانہ دیکھا ہے۔ آپ کو اگر مجھے بے ہوش رکھنا ہی پسند ہے تو آج کے بھاؤ سنا دیا کریں۔ چھٹی کے دنوں میں یہی کافی ہوگا۔۔۔۔۔ اور چار آنے یومیہ پر مزدور۔ دو روپے پر کارگر۔ پچاس روپے میں وکیل بھی تو مل جایا کرتا تھا۔ ہمارے نکاح پر آپ کے ابا جان نے نکاح خواں کو ایک روپیہ دیا تو گاؤں میں دھوم مچ گئی۔ پچیس روپے تولہ سونا تھا۔ اور زیور کیا لائے میرے سسرال والے۔۔۔۔۔ اور آپ جہیز میں کیا لائیں، وہ بھی یاد ہی ہوگا۔ سبھی کچھ لائی تھی۔ سولہ روپیہ حق نہر تھا۔ وہ بھی چالاکی سے بخشوا لیا۔ اب کہتے ہیں گاڑی میں ڈیڑھ من سے زیادہ وزنی سواری نہیں بٹھاؤں گا۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔ میں نے پروگرام بنا لیا ہے۔ بغل والا چھوٹا کرہ میرے لئے ٹھیک کروا دیجئے۔ بس میں اور قلم کاغذ۔۔۔۔۔ لو پھوٹ گئے مقدر ماجل گئے نصیب۔ یہ گھر کیوں بنایا تھا، کتب خانہ بنا لیا ہوتا۔ کسی لائبریری میں بس گئے ہوتے۔ بُرا ہوا ان لوگوں کا جو گھنٹوں ان کی تقریر سنتے ہیں اور ان کا بھی جو تحریروں پر سر کھپاتے ہیں۔ گھر میں تو دن بھر میں چار فقرے بولنے کی اوسط نہیں، سسرال والوں کو کبھی چار حرفوں کا خط لکھنا بھی مقدر نہیں ہوا۔ ویسے جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھا رہا ہے۔ اوپر سے یہ دو چھٹیاں وارد ہو گئیں۔ اور تصنیف و تالیف ہوگی۔ مجھے تو اب احساس ہوا، یہ کتنا بُرا ہوا۔ میں نے کہا۔ ایک پیالی چائے ملے گی۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ملے گا۔ ہفتہ میں دو دن کھانا بھی نہیں پکے گا۔ سگریٹ بھی نہیں ملیں گے۔ حقہ بھی نہیں بھرا جائے گا۔ صابن بھی نہیں ملے گا۔ ٹوٹھ پیسٹ بھی نہیں۔ کپڑے بھی نہیں بدلے جائیں گے۔ شیو بھی نہیں ہوگی۔ کوئی ملاقاتی بھی نہیں آگھے گا۔ یہ دونوں دن مکمل بچت کے دن ہوں گے۔ نہ آپ کسی سے بات کریں گے، نہ آپ سے کوئی بات کرے گا۔ بس تصنیف و تالیف ہوگی اور ہو گا سا عالم ہوگا۔ زبان

بند و چشم بند و گوش بند۔ آپ کو دو دن کی چھٹی بھی اور آپ کی دو دن کی چھٹی بھی۔
اگرچہ ہم اس ایک بجٹ اور دو چھٹیوں کی اصلیت و افادیت سے آگاہ ہیں۔ یہ
بھی جانتے ہیں کہ بے وجہ تنقید اور بے اثر تبصرے کیوں کئے جاتے ہیں، کیونکر کئے
جاتے ہیں۔ کارِ خسرواں حیلہ گراں تسخیر کرد پیرا اصرار کیوں ہو رہا ہے۔ کل کے معاون
آج نئے تعاون کیوں تلاش کر رہے ہیں۔ یہ پابندیاں کیوں ہیں، یہ خود سریاں کیا ہیں
کہاں ترقی ہوئی ہے، کہاں تنزل گھات لگائے بیٹھا ہے۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ناقصین
خود وزیرِ خزانہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ لیکن اپنے ہی گھر میں ہماری یہ کیا حالت ہے۔ کوئی بتلاؤ
کہ ہم بتلائیں کیا۔



یا نار کوئی بردا

محترم وزیر باتدبیر راجہ ظفر الحق کی نذر

صاحبو! ساکنانِ گلشنِ قفس آراستہ لاکھ خوگرِ علت ہائے قفس نواز ہو چکے ہوں۔ ہر چند
رودادِ چین اسی پر مکتفی ہو کہ جس پر کل بجلی گری، وہ آشیانِ بے ہم دم تھا۔ نغمہ نگلِ نالیہ بلبل،
چڑیوں کے چمچے تو گنجا "کوؤں کی کایں کایں" اور پتوں کی سرسراہٹ تک کبھی کی
غاموش ہو چکی ہو۔ طوطیوں، قمریوں، عندلیبوں نے رسمِ فغاں فراموش کر ڈالی ہو، ما کوئی سیرگل
کے بہانے بھی زخمیوں کو دیکھنے نہ لگتا ہو، داستانِ ویرانی، حیاتِ چین، روشِ روش
گوشہ بگوشہ بکھری پڑی ہو، گردوں کی آستیں میں بجلیاں لپک رہی ہوں۔ آسمانوں
پر بلاؤں کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس انعقاد پذیر ہو چکا ہو مگر عنادل پر استراحت آشیانوں
میں محو خوابِ غفلت ہوں۔ رات کی ادس پھولوں کی پتیوں پر سارا دن بھی پڑی
رہتی ہو۔ باد نسیم کا ہلکا جھونکا اور معمولی سا سوزِ کرن بھی چین کا مقدر نہ رہا ہو، زندوں
کو دیکھ کر مردوں کو رونا آتا ہو۔ افکارِ تازہ عروسی جوڑوں میں دفن ہو رہے ہوں۔ ہر چند
کہ مردے کفن پیش کر رہے ہوں کہ ہمارے ننگے وارثوں کو دے دینا۔ ہر چند کہ غبارِ
کارواں، میرِ کارواں کی تلاش میں بگولے اڑا رہا ہو۔ گردِ راہ نے قافلہ سالار سے پہلے
منزل کو جا لیا ہو۔ ہر چند کہ ہر تصنیف کے پیش لفظ کے طور پر دعائے نمازِ جنازہ تحریر ہو۔
ہر دسترخوان کے درمیان یہ منہ اور مسور کی دال "رقم ہو ہر" بزرگِ دماغ، سوچ رہا

ہو کہ بھرے بازار میں خدا بک سکتا ہے تو انسان کیوں فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی عصمت خریدی جاسکتی ہے، اس کا گوشت بیچتے وقت اخفا سے کام کیوں لیا جائے۔ ہر چند کہ آج کا قوال بھی مصرعِ غالب ”ستم کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا“ دہراتے وقت محسوس کرتا ہو کہ گلے کی زنجیر ہاتھوں میں لٹک گئی ہے اور واعظِ وقت کے پاس ایک ہی تلقین رہ گئی ہو کہ جب ذبح کرو اللہ کا نام لے کر کرو۔ ہر چند کہ مصرفِ گلہائے چمن صرف یہ باقی رہ گیا ہو کہ کوئی مرتبانِ کلفتِ خالی نہ رہے۔ کھنڈرے روشِ روش کچے پھلوں پر غلیلیں آزمانے پر مٹھ رہوں۔ ہر غنچہ چڑھے ہوئے چلے کی زد میں ہو ہر ذہنِ سیاست کی دائیں کینیٹی پر طمنچہ اور بائیں پر سپتول لٹکا ہوا ہو۔ بوٹ کی ٹو بھی چالو تو سرزنش ہوتی ہو کہ ہمارے فرش پر نہ رینگو۔ ہر چند کہ ادیبوں کی کمر اور گدھوں کے سر دکھ رہے ہوں۔ ہر چند کہ ہر کشتہٴ ستم ہائے حالات و واردات کو مزید سزا صرف اس لئے مل رہی ہو کہ تمہارے تڑپنے سے تخریبی تنقید کا پہلو ننگا ہوتا پایا گیا ہے۔ ہر چند کہ اکھاڑے میں ٹھلتا ہوا ہر ”جھارا“ اخباری نمائندوں کو سمجھا رہا ہو کہ دیکھو، میرا یہ بادام رگڑنے والا تمہاری تنقید کا موجد ہے۔ اس کے پاس ڈنڈا بھی ہے کونڈا بھی رگڑتا بھی ہے۔ مگر بادام اور مصرف میرے لئے، ہر چند کہ پیاء صرف اسی کے ہوں جو صرف ”آپ بڑے وہ ہیں جی“ کی ادا کے ساتھ کارِ عاشق پر تبصرہ کر سکے۔ جو زیر تماشا اقتدار کی گودی سے بل کھا کر نکل جائے اور ”تیرے پیالے پڑوں، موری لاج رکھنا“ کا آسن جمائے تھرکتا اور تھرکتا رہے، وہی آشنائے سیاستِ بالا ہے۔ باقی سب حدودِ سیاستِ آرڈی ننس کے مجرم ہیں۔ احساسِ پابہ زنجیر، تحریرِ پابہ جولان، تقریرِ پابندِ سلاسل اور نظریاتِ دھواں دھواں۔ ہر چند کہ بن برکھا ملہار ”گنواٹی“ جاتی اور شبِ وصل بہاگ ہو سکتا ہو۔ چاند رات میں دپیک اور اماوس کی شب ماہل کونس برپا کیا جا رہا ہو۔ ہر چند کہ ادیب مجھو کے بچے کی طرح بلبلا رہا ہو اور مادرِ خیال میک اپ میں

مصرف غارہ عارض کی سرخیاں ہوا کرتی ہتھم ابلاغ کی آیا کو آواز دے رہی ہو کہ اس کے منہ میں پیل دینا۔ اس کا شور صاحب کو گراں گزر گیا تو شاپنگ کا پروگرام ٹھپ جانو۔ اور آیا زیر لب مسکرا کر کہہ رہی ہو شاپنگ کو تو وہ جائیں گے ہی۔ میں جانوں، انہیں اپنا زیر جامہ بھی تو لانا ہے۔ ادویوں میان آرائش و دوران تبدیل لباس رات پھپے روزنامے۔ روزہ دار ہفت روزے اور بانجھ ماہوار جریدے یوں برآمد ہوتے رہتے ہوں جیسے یکم تاریخ کو بوقت عصر صاحب کی حبیب سے تنخواہ برآمد ہوتی ہے اور صاحب بوجہ برآمدگی ہذا قبل از شام ہی ”لفی خسرا“ ہو کر رہ جاتا اور یوں منہ لٹکالتا ہے۔ جیسے بھیسروں کا انگ لٹک کر لٹک گیا ہو اور گویا جھوٹی کھانسی کھانس رہا ہو۔ ہر چند کہ ایسے منظر العجائب بھی قید وجود میں ہوں کہ دوران حرف گیری CENSOR کو SON - SIR پڑھتے ہیں۔ اور کارسیر، سرکار اور SIR - CAR میں کوئی فرق نہیں جانتے۔ تاہم ہر ذی شعور نظریاتی ادیب کا یہ عقیدہ غیر متزلزل رہے گا کہ آزاد تو کیا، غلام ملک میں بھی برسر اقتدار کی کوتاہیوں کی نشان دہی کروانے سے روکنا برسر اقتدار کے ساتھ بدترین دشمنی کے مترادف ہے۔ تاریخ میں کوئی اقتدار قصیدہ گوؤں کے سہارے قائم نہیں رہا۔ بے جا تعریف و توصیف سے تو بیڈروم آباد نہیں رکھے جاسکتے۔ دبدبہ شاہی اور حفاظت تحت و تاج تو بڑے نازک مسئلے ہیں۔ کسی ادیب کو دشمن جاننے سے خودکشی کر لینا کہیں بہتر ہے کہ کوئی ادیب کبھی بھی اقتدار و تاج و تخت و حکومت کا متمنی نہیں ہوتا۔ وہ صرف سکون، اطمینان، عزت نفس اور احترام انسانیت کا متلاشی ہوتا ہے۔ اپنے لئے بھی اور ہر کسی کے لئے بھی۔ چاہے وہ اس کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ ادیب گلشن پرست ہوتا ہے۔ اسے گل ہی عزیز نہیں ہوتے کانٹوں سے۔ نباہ جانے کا اہل بھی ہوتا ہے۔ کانٹے اگر ادیبوں سے نباہنا چاہتے ہیں تو پھولوں کی حفاظت کرتے رہیں۔ ادیب

انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ادیبوں کو نہ مارو، صرف گالیاں دینے والے باقی رہ جائیں گے۔ وہ! جنہیں پسماندہ ملکوں کے جمہوری سیاست دان کہتے ہیں، نااہل اور جراتِ احتساب سے عاری ابن الوقت قصیدہ گو کارکنوں کے آقا کے لئے بہتر ہے کہ وہ "ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو" کا اچھی طرح سے ریاض کرے کہ بروقت مشق نہ کرنے کی وجہ سے پیشرو بڑی تکلیف میں رہے ہیں۔ جس کے افکار و اعمال کے نتائج سے اُسے باخبر نہ رکھا جائے وہ آدمی ہرگز بشر نہیں رہتا۔ آدمی بشریت سے عاری ہو جائے تو اس کے اعمال کے نتائج اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ جس نے حال کو صحیح نہ جانا، آئندہ کی بشارت اس کے لئے یوں ہی ہے جیسے اندھے کی آنکھوں پر دبیز پٹی باندھ کر اُسے ہدایت کی جارہی ہو کہ چالیس قدم سیدھے چل کر دو قدم دائیں اور پھر دو قدم بائیں چلنا اور ہمارا انتظار کرنا۔ ہم آئندہ راستہ پھر سمجھائیں گے۔ کہ بیوروکریسی اس سے زیادہ سمجھا دے تو "ناٹ مسلم" والی ترمیم لانا پڑتی ہے۔ بیوروکریٹ اُس ماہر امتحانِ قوتِ دید کو کہتے ہیں جو کمزور نظر کے لئے عینک کبھی تجویز نہیں کرتا، پیوں والی کرسی مہیا کرتا ہے اور اس نیتِ مقتدر پر نظر رکھتا ہے جس سے انارکارس کم و بیش ہوتا رہتا ہے اور اس نیت پر بھی جس کے زیر اثر عالم دین مترجم بھی لفظ بشر کا ترجمہ بشارت کے واسطے سے کرنے کی بجائے آدمی کر ڈالتے ہیں اور لکن یوحی ایتی سے مطلق انحراف کر جاتے ہیں۔ بکرہ راہب اور ورقہ نوفل مقام رسولؐ سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ہاشمی و قریشی ابو جہل و ابولہب کو کوستے رہ جاتے ہیں۔ جس قرآن کے نازل ہونے پر پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کی پیش گوئی کی جا چکی ہو، اُسے بغل میں دبائے لوگ مزید سنگ دل ہو جاتے اور طالب علموں کے کمروں میں اسلحہ کے انبار لگوا دیتے ہیں۔ تخریبی تنقید مردہ جانوروں کا گوشت نوحیتی ہوئی گدھوں کے مجمع پر بھونکنے والے سگ ہائے آوارہ

کاشیوہ ہے، مادانثوروں اور ادیبوں کا نہیں۔ محرکات، وجوہات، جواز اور نتائج کو مد نظر رکھ کر اظہار رائے کرنے والے تعمیر پسند ہوتے ہیں، تخریب نواز نہیں۔ ہنگامی فکر و عمل لغزشوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دیکھ کر چلنے والے اور سونگھ کر ٹوٹنے والے مقتدر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ ادیب بوقتِ خطاب بوجہ اخلاص ذات خود ان کے رد و مختلف الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دانشور اور ادیب غلط کار پر ترس کھاتے ہیں۔ وہ حریص اقتدار سیاست دان نہیں ہوتے کہ نفرت کریں یا نفرت پھیلائیں۔ مشکل یہ نہیں ہے کہ ادیب و دانشور نقاد تعمیری تنقید کے اسلوب سے آشنا نہیں، کٹھن یہ ہے کہ زیر اظہار تخریب و تعمیر میں امتیاز کرنے کے سلیقے سے آگاہ نہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اختیار حرف گیری اُن لوگوں کو سونپ دیا گیا ہے جو بیویوں سے آشنائی کے لئے بھی اُن کے لباس کی تعریف کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ اور نہیں جانتے کہ خوبصورت بیوی، خوبصورت ماں، خوبصورت بیٹی، خوبصورت بہن کو دیکھ کر ایک ادیب اپنے احساسات بیان کرنے کے لئے الفاظ کا چناؤ کرتے وقت کن کن اقدار کو پیش نظر رکھتا ہے۔ منصب سنبھالنے والا اگر منصب یا دد لانے والے کو تخریب پسند گردانتا ہے تو دراصل وہ صفحاتِ تاریخ سے اپنا نام خود مٹا رہا ہے۔ تاریخ نے بار بار نشہء اقتدار میں فرائض کے ہاتھ لڑا کھڑاتے دیکھے ہیں اور جس نے بروقت اس صورتحال کی نشان دہی نہ کی، اس سے بڑھ کر تخریب پسند شاید ہی کسی ملک و قوم کی تاریخ پر تھوپا جاسکے۔ ہر وہ قول جو کسی فرد، قوم، ملک یا معاشرہ کی آئندہ تعمیر میں رکاوٹ کی نشان دہی کرے، محرومیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کوتاہیاں جتائے، مزاج نازک اور تاب سخن نہ دارد کے باوجود بھی تعمیری ہی کہلائے گا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی صورت حال سمندروں کے طوفانوں یا زمین کے زلزلوں

کی طرح ان وجوہات سے وقوع پذیر نہیں ہوتی جو انسانوں کے بس میں نہ ہوں۔
ان حالات کی ذمہ دار انسانی عقل و دانش کی محرومیاں اور کوتاہیاں ہی ہوتی ہیں۔
ان مسائل کا لاینحل ہو جانا یا بروقت حل نہ ہونا بھی ان ہی کوتاہیوں کی وجہ سے
ہوتا ہے۔ یہ مسائل چونکہ انسانوں کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اس لئے ان کے نتائج
بھی انسان نے ہی بھگتتے ہوتے ہیں۔ انسان جو دراصل آپ اپنا دشمن ہوتا ہے،
ناکام ہو کر دشمنی کا الزام دوسروں کے سر تھوپ دیتا ہے۔ ادیب اور دانشور
حالات کے تجزیہ کے لئے بھی ہوتے ہیں، حالات کی فاتحہ خوانی ان کا منصب نہیں
اور نہ حالات کی تجارت انہیں زیب دیتی ہے۔ سر راہ اگر کوئی واقف حال یہ گوش
گزار کر بیٹھے کہ کھائی گری ہے اور وسیع بھی، ٹانگ کمزور نظر آتی ہے اور مجروح
بھی ہے، چھلانگ کر پھلانگنا درست نہ ہوگا، تو اسے تخریب نواز قرار دے کر اس
پر وہی کمزور اور مجروح ٹانگ چلانا نہ آج تک عمل صحیح تسلیم کیا گیا، نہ آئندہ کیا جائے
گا۔ دانا لوگ تو فرصت کے اوقات میں خود اپنے پر تنقید کرتے ہیں، آپ اپنے
محتسب ہوتے ہیں۔ کھجور پر چڑھ کر کھجور کھاتے ہوئے بلند مقام کو اگر یہ عرض کیا
جائے کہ گٹھلیاں جیب میں نہ رکھیئے، بوجھل ہو جائیں گی، اور چپک بھی جائیں گی۔
اور وہ ناراض ہو جائے کہ تمہاری نظر میرے حق و اختیار کھجور خوری پر ہے، تم تخریب
پسند ہو۔ تخریبی تنقید کے لئے سزا دار ہو تو زمین پر کھڑے ہموار لوگ کیا فال لکالیں
کہ نشہ قوت خطرناک ہے یا نہیں ہے۔ سہیلیاں اگر دریافت کریں کہ ”ہری تھی،
رَس بھری تھی، راجہ جی کے باغ میں دو سالہ لئے کھڑی تھی“ بتاؤ سکتی وہ کون؟
اور قبل اس کے جواب ملے کہ ایک ادیب کی حالات حاضرہ کی طبع زاد لفظی تصویر
تھی۔ راجہ جی بول اٹھیں کہ استغفر اللہ، وہ تو مکئی کا بھٹا تھی جس کے دانوں
کی تمام سطریں کھانے کے بعد یہ ٹکّا باقی رہ گیا ہے تو کون بوجھے کہ بھٹا آپ نے

ہے۔ ان میں سے کوئی بھی تو چین دشمن نہیں ہوتی۔ یہ نہ ہوں تو چین آباد ہی نہیں کھلا
 سکتا۔ کوئیں، بلبلیں، طوطیاں، قمریاں اور عندلیبیں جب کوک رہی ہوں تو باغبان
 کو گالیاں نہیں دے رہی ہوتیں اور چہک رہی ہوں تو مالی کی قصیدہ خوانی مقصود
 نہیں ہوتی۔ ان کی کوک میں خواہشِ تعمیر اور چہک میں اقرارِ تعمیر ہوتا ہے۔ انہیں پابند
 قفس کرنے والے یہ نہ بھولیں کہ دانہ ڈالتے وقت ہی سہی، دستِ صیاد بھی داخل
 قفس ہوتا رہے گا۔ تسلطِ غیر میں چین کے مالی بھی اتنے ہی آزاد ہوتے ہیں جتنا کہ جیل میں
 قیدیوں کا نمبر دار آزاد ہوتا ہے۔ آگے کاروں پر تنقید کی اجازت دینا اور اہل کاروں کو
 اس سے بالاتر قرار دینا ایک رستی ہوئی بغاوت کا سامان مہیا کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی
 ہے جیسے عسافر عون کے ہاتھ میں دے کر رسی موسیٰ کے گلے میں ڈال دی جیسے آدم
 بہشت میں اشجارِ ممنوعہ کاشت کر رہا ہو۔ جیسے ہابیل و قابیل ملکیتِ اماں خواہ پر جھگڑ
 پڑیں۔ جیسے آلِ نوح کشتیِ نوح میں سوراخ کر رہی ہو۔ جیسے آزر پتھروں سے شبیر
 ابراہیم تراش رہا ہو۔ جیسے ہارون رشید نہر زبیدہ میں برہنہ نہا رہا ہو۔ جیسے ہلاکو
 کھوپڑیوں کے مینا پر سفید جھنڈا لہرا رہا ہو۔ جیسے چنگیز خاں مزید غارت گری کے لئے
 دیوانِ حافظ سے فال نکال رہا ہو۔ جیسے سکندر اعظم حکم دے رہا ہو کہ ارسطو کے حواسِ
 خمسہ مفلوج کر دیئے جائیں۔ جیسے اکبر اعظم مان سنگھ کی چادر و چار دیواری کی حفاظت
 کا دعویٰ کر رہا ہو۔ جیسے بابر بعد از عیش کوشی تزکِ بابر میں مزید اضافے کو رہا ہو۔
 جیسے خاندانِ غلاماں کے بادشاہ قوانینِ تحفظِ تخت و تاج ترتیب دے رہے ہوں۔
 چنانچہ اہل کاروں کو تعمیری تنقید سے بالاتر قرار دینا بدترین تخریبی عمل ہے اور پھر
 جب ملک کی نظریاتی چار دیواری پر بازاری اشتہار تحریر کئے جا رہے ہوں، جب
 نظریاتی شفا خانے متعصن ہو رہے ہوں، نظریاتی سرحدوں میں درے بنا دیئے گئے
 ہوں۔ جب نظریاتی پُل ٹوٹ رہے ہوں، جب نظریاتی دریاؤں کا تعلق جھیلوں سے

منقطع کر دیا گیا ہو تو اس طوطی کے نالوں پر پابندی لگا کر کس کی حفاظت کی جائے گی جس نے آشیان میں بیٹھے خود جُتہ و دستار پوشوں کو گوشہ ہائے چمن میں سامانِ نقب زنی دفن کرتے دیکھا ہو۔ طوطی نہ سہی، کو اہی سہی، کو سے کی آواز میں شیرینی نہ سہی۔ وہ ببل و عندلیب کی طرح دلاویز بھی نہ سہی۔ لیکن اگر وہ صرف اس لئے کائیں کائیں کر رہا ہو کہ کوئی کلیم پوش، سر بسجود، قبلہ رو نیاز لینے نہیں دیگیں چرانے آیا ہے تو اس کی آواز کی کرخنگی کو برداشت کر لینا ہی سود مند ہوگا۔ تاکہ اپنی بلا سے بوم بے یا ہمارے کی نوبت نہ آئے۔ جو اخلاص کی سحت روی اور محاصمت کی ملامت کو بھی نہ جان پائے۔ بھٹک کر راہ زلوں کے ہاتھوں راہ تما بن جانا اس کے ذی شعور ہونے کا ثبوت نہیں ہوتا۔ علی گڑھ سے بالاکوٹ جاتے ہوئے کوئی تھکا ہارا بھوکا مسافر گہری سوچ میں ڈوبا زمین پر انگلیوں سے خانے بنا بیٹھے تو اسے جوار سی گردان کر پکڑ لینا قانون کی پاسداری یا اس کا احترام نہیں ماہر تاریخ پاکستان کے صفحات پر سرخی سیاہی پھیلا نا ہے۔ عمید اللہ سندھی اور شاہ ولی اللہ کے مزاروں پر اگر سرکار انگلشیہ کے ذہنی چوہے بلیں نکالنے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ان کی چوں چوں سے ٹیپ ریکارڈ تیار کر کے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے لئے نصاب تیار کرنا پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کوئی قابلِ تعریف کاوش نہیں۔ نامعلوم ہمیں یہ احساس کیوں نہیں ہوتا۔ کہ حب الوطنی کے حصار کی کوئی دیوار نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ محبِ وطن پر کوئی کمنڈ نہیں ڈالی جاسکتی۔ محبِ وطن کے ہاتھ قطبین کے انجماد تک پھیلے ہوتے ہیں۔ اس کے ذہن و قلب میں سمندروں کی وسعتیں ہی نہیں، ان کی گہرائیاں اور طوفان بھی ہوتے ہیں۔ ان پر حدیں قائم کرنا بحرِ اوقیانوس کو بچھڑے مردار میں سمونے کی کوشش کرنا ہے۔ ذوقِ منو کے انجام کو حب الوطنی نہیں کہا کرتے۔ وطن کی حدود کو پھیلنے سے روکنا حب الوطنی نہیں

ہے۔ نظریات بسیط ہونے کے لئے ہوتے ہیں ماحیط ہونے کے لئے نہیں۔ جو اپنی
نظریاتی اور جغرافیائی حدود کو دنیا کے آخری کناروں تک پھیلتا ہوا دیکھنے کا متمنی
نہیں ہے، اس کی حب الوطنی محض ڈپلومیٹک ہے۔ نا خوب کو بتدریج خوب تسلیم کر
لینے اور کروالینے والے اپنے ذہن کے تعمیری ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ تعمیر اسی
کا حصہ ہے جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہو، ان کا نہیں جو خرابی بسیار کے
ذمہ دار ہوں۔



”ترامیم = آئین کے آئینہ میں“

”آئینہ ایام = ترامیم کے جلو میں“

۱۹۷۳ کے آئین میں ترامیم اور ان پر محروم و میسر افراد کے لاگ دار تبصروں پر بے لاگ غور و فکر کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں آئین سازی کے اصولوں سے ناواقفیت، حقائق و حالات سے چشم پوشی اور خود غرض دانش و سیاست سنگسار کر رہی ہے۔ ہم حق و باطل کی آمیزش کے گنہ گار رنگے ہاتھوں بیچ بازار پکڑے گئے ہیں اور اس بے شعوری کے باعث ذہنی طور پر رجم ہو رہے ہیں۔ نظام اسلام کے نفاذ کے لئے اس نوع کے انتخابات جن کی بنیاد ہی پیشہ ور، اجارہ دار، سرمایہ کار سیاسی مکتبہ فکر نے اٹھائی ہو، منعقد کروانا اور تفریق و تقسیم کی ضرب سے بچے رہنے کی امید ہونا کسی کو ہوش میں لانے کے لئے خواب آور گولیاں کھلانے کے مترادف ہے۔ ہم تو رجعت پسند تھے ہی، وہ ترقی زدہ جو میکا ولی، روسیو اور شیلے کو الہ دانش کا حامل گردانتے اور مغربی جمہوری طریق انتخاب کے شیدائی تھے، حالیہ انتخاب کی کار فرماٹیوں، سرمایہ کے اسراف کی فسوں کاری، ساعری اور کثیر اقلیت نمائندوں کے منتخب ہو جانے پر آنکھیں بند کر کے سوچتے تو ضرور ہوں گے کہ سیاسی پابندیوں اور جماعتی عدم شرکت و بائیکاٹ کے باوجود جمہوریت کا بچپن یوں کھل کھیلا ہے تو جوانی کس قیامت کی ہوگی۔ انتخابات میں حکومت

نے غیر جانبدارانہ ناطق تماشائی کا کردار اگرچہ بڑی متانت سے بطریقِ احسن
 نبھایا، تاہم سوچتی تو ہوگی کہ اگر یہ کمائی واقعہ خون پسینہ کی تھی، تو کس کس کا،
 لہو پانی ہوا ہوگا۔ اور اگر سرمایہ سہل تھی تو کن کن مشکلات کو وجود میں لائے گی۔ عوام
 کی دانشِ عام پر بھی مشاورت اور جمہوری انتخابات میں فرق و امتیاز نمایاں تو ضرور
 ہوا ہوگا۔ کھجلی تکلیف دہ مرض سہی مگر کھجلا نے میں بھی ایک مزہ تو ہوتا ہی ہے
 فی الحال یہی سہی۔ مستورات تک سوچتی ہیں، بچے دریافت کرتے ہیں کہ یوں خرچ
 کرنے والوں کے نمائندگی کے علاوہ اور کچھ مقاصد بھی لازماً ہوں گے اور ان اغراض
 کو برلانے کے لئے جوان و تازہ خون سیاسی رگوں میں دوڑا تو کیا ہوگا؟ بزرگ
 منجمد خون گہما گیا تو سیاست و کاروبارِ سلطنت کی شریاؤں کا کیا ہوگا؟ آثار واضح
 ہیں کہ مغربی جمہوری طریقِ انتخاب کی قباحتوں کے نمائندہ نتائج بھگتنے کے لئے عوام
 کو ہی نہیں، حکومت کو بھی مورچہ بند ہونا پڑے گا اور حالیہ ترامیم کا عمل آپریشن کے
 کے اوزار کے سپرٹ میں ڈبوں کے عمل کا سا ہی ہوگا کہ مریض تھیٹر میں آیا ہی
 چاہتے ہیں۔ شوق شہادت کے لئے گنگنائے، رقص کرتے، مسکراتے ہوئے۔
 یہ گروہ بندیاں، وزارتوں کے لئے گٹھ جوڑ، وفا کی قسمیں اور دغا کے ارادے کیا
 مثبت نتائج ہیں۔ کسی ارتقائی سیاست کی سرخیاں ہیں، حب وطن کے عنوان
 ہیں۔ کارِ طفلان ہی تمام نہیں ہوگا۔ کارِ مکتب کا بے تہ بھی بندھ جائے گا۔ بجا!
 کہ جو ہوا عمداً نہیں ہوا۔ سہواً بھی تو نہیں ہوا۔ مجبوراً یا مصاحمتاً ہوا ہوگا۔ ایسا
 ہے تو درتوبہ بھی بند نہیں ہوا ہوگا اور عوام اس امید پر زندہ رکھے جاسکتے ہیں کہ
 آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ ابھی باور کر لیا جائے کہ نظام کی تبدیلی کے بغیر
 نہ حالات بدلے جاسکتے ہیں نہ طبائع اور طبیعتیں طبع نہیں ہوا کرتیں، تابع ہوا کرتی
 ہیں یا تباہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بہر حال سانپ گزر بھی جائے تو فقط لکیر پیٹنے پر

چونکہ مثبت عمل نہیں ہوتا لہذا ضروری ہے کہ آئین میں حالیہ ترامیم کا ان کے سیاق و سباق اور احوال ماضی و حال و مستقبل کے حوالہ سے جائزہ لیا جائے۔ نیتوں اور نہ ہفتہ ارادوں کا علم تو فقط اللہ تعالیٰ کو ہی ہے اور بدگمانی تعمیری شیوہ نہیں۔ محض مفروضوں کی بنا پر شک نہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ایسے شک کا فائدہ کسی مدعی یا ملزم کو دیا جاسکتا ہے۔ لہذا فی الوقت ان ترامیم کا فقط محتاط جائزہ ہی لیا جاسکتا ہے۔ اس امر سے تو کسی کو الکار نہ ہوگا کہ اس آئین کی عملداری میں فکری تضادات، مغربی جمہوری اقدار، سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ قوت استبداد نے وہ گل کھلائے کہ روش روش دہائی دے اٹھی ”یہ وہ سحر تو نہیں“، اور بالآخر ایک تحریک برپا ہوئی کہ ہم ان اصلاحات و رعایات و حقوق سے باز آئے جن کے مزے میٹھے اور اثر خواب آور ہے لہذا ہمارا تقاضا ہے کہ نظام حکومت، نظام مصطفیٰ ہو۔ گولیان محبان رسول کے سینوں اور مخصوص مفادات سیاسی لیڈروں کے دماغوں میں پیوست ہو گئے۔ آئین بمع آرٹیکل نمبر چھ کے معطل ہوا۔ اور انعام معطلی سربرائی مملکت قرار پایا۔ عوامی تحریک کی ایمان افزوی کے زیر اثر موجودہ حکومت نے لفاظی نظام اسلام کے اپنے جزو ایمان ہونے کا اعلان کیا اور ایمان فروش مغربی سیاست کی تمام دکانوں پر نالے پڑ گئے۔ آہستہ آہستہ احساس ندامت کم ہونے لگا تو اقتدار کے رقیبوں نے تحریک بحالی جمہوریت کی بنا ڈالی۔ جسے محرک کرنے کے حربے ناکام ہوتے چلے گئے تو منفی و متدد سیاست کو مشعل راہ بنا لیا گیا۔ اور محرومیت مصنوعی و علیحدگی پسندی کی آگ کو دہکانے کے لئے بیرونی مخالف ممالک سے پھونکوں کی فرمائش کی جانے لگی۔ سیاسی جماعتوں کو نظام اسلام ایک آنکھ تو گجائے آنکھ بھی نہیں بھاتا کہ اس مکتبہ فکر میں تفریق کی گنجائش ہی نہیں۔ لہذا ترک اسلام کئے بغیر سیکولرزم کے قشتے دہکانے لگئے اور مغربی جمہوریت

کی زنا رہا تھیں لیے سجائی آئین کے شبہ چپے جانے لگے۔ یوں بُدِ صدیق ظہور پذیر ہوا۔ اور غیر سیاسی انتخابات اور اس کے بائیکاٹ نے میدان سنبھال لیا۔ نئے سیاسی بحران کی تلخ رو اور تند خو لہریں کنار سیاست سے ٹکرائے لگیں اور منفی ارادے بے تابی سے انتظار کرنے لگے کہ اعلانِ انتخاب کے قدرتی نتیجہ میں جب موجودہ حکومت کی گرفت کا دم خم محتاجِ احتیاط ہو جائے تو امن عامہ پر بھرپور وار کیا جائے اور کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ جن انتخابات کے فوجی نگرانی میں کروائے جانے کا مطالبہ پاکستان قومی اتحاد نے کیا تھا، ان کا التوا اس وقت تک منعقد رہے جب تک ہمارے منتخب ہونے کا انتظام و انصرام ہمارے ہی سپرد نہ ہو۔ ہم منتخب ہو جائیں تو آئندہ انتخاب کے لئے صدر ہمارے رحم و کرم پر ہوں اور ہمیں رحم و کرم نصیب ہی نہ ہو۔ یہ ارادے آئینہ رو تھے کہ پہلے نیشنل سیکورٹی کونسل نے تقاضا کر ڈالا کہ سیاست کے اس بیوٹی پارلے پر کچھ اختیارات موجودہ اقتدار کے بھی ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو شرکتِ اقتدار محض تو تمہاری سیاست کی گوارا کی جاسکتی ہے۔ انتقالِ اقتدار کی کوئی دستاویز تمہارے ہاتھوں میں نہیں تھمائی جاسکتی، کہ تجربہ و مشاہدہ یہی ہے کہ تمہارے ہاتھوں یہ تھمتی ہی نہیں۔ تم تو پگڑی نہیں سنبھال سکتے۔ اتنی اہم دستاویز جس میں قوم کی تمام امانتیں درج ہیں، کیوں کر یقین کر لیا جائے کہ سنبھال لو گے۔ جواب ملا، ہم ہر ایسا الجھریاں روئیہ اپنائیں گے کہ بہ طور ”لا“ صفر ہی کے مساوی ہوگا۔ چنانچہ ریفرنڈیم اپنے سوالات کئے احتیاطی، دفاعی، امتناعی کارروائی کے اظہار لئے اور تیوری سنوارے وار دہو گیا اور صدر مملکت نے آئندہ پانچ سال کے لئے اقتدار میں رہنے کا فیصلہ عوام سے حاصل کر لیا، کہ لو! اب دیکھیں گے کون کس کا دست نگر ہوتا ہے۔ کافر جمال والے انکار کرتے اور کرواتے رہے، ایمان لانے والے ایمان لے

آئے۔ اور صدر مملکت نے آئندہ پانچ سال اقتدار میں رہنے کا فیصلہ عوام سے حاصل کر لیا۔ دانش و دانست ہوتی تو سیاست جان گئی ہوتی کہ باب انتقال اقتدار کی پیشانی پر تحریر ہو چکا کہ کوچہ رقیب ہی سہی، دریا پھر دریا رہے اور وہیں واقع ہے لہذا سر کے بل چلو۔ شناسائی ہوئی بھی۔ آزادی ملاقات بھی متیا ہوئی مگر بڑا ہوسرص اقتدار کا، کہ پورا نملے تو احساسِ محرمی سے نجات ہی حاصل نہیں ہوتی چنانچہ بات ڈھاک کے تین پات تک ہی رہی۔ اور بالآخر صدر مملکت نے جو نظام اسلام کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کر چکے تھے، بحالیِ جمہوریت کا فرض بھی اپنے ہی ذمہ لے لیا کہ تم نیم جانوں سے شاید یہ بھی نہ ہو سکے۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ منتخب شدہ صدر کا اعلان انتخاب پارلیمنٹ کے صدر کی بجائے بلا واسطہ منتخب شدہ اس صدر کا اعلان تھا جس نے نظام اسلام کے نفاذ کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی اور بحالیِ جمہوریت کا فرض بھی سنبھال لیا تھا۔ لہذا غالباً یہ طے کیا گیا کہ مغربی جمہوری طریق انتخاب کے واسطے سے ایسی پارلیمنٹ وجود میں لائی جائے جو مغربی جمہوری نظام کی بجائے نظام اسلام کے نفاذ کے لئے ممد و معاون ہو۔ گویا طریق کار نہ بدلا گیا مگر مقاصد بدل گئے۔ صدر مملکت، وزیر اعظم اور پارلیمنٹ کی ذمہ داریاں مغربی جمہوری تصورات و عوامل سے جدا گانہ ہو گئیں۔ صدر کی آئندہ حکومت کا منشور واضح تھا۔ کسی امیدوار نے اپنا کوئی علیحدہ منشور نہیں دیا۔ لہذا مجموعی طور پر پارلیمنٹ کا دائرہ کار اسی منشور پر عمل پیرا ہونا ہے۔ ۱۹۷۳ کے آئین کا پارلیمنٹ کا صدر ہونے کا تصور کم از کم آئندہ پانچ سال کے لئے ختم ہو چکا ہے۔ نظام اسلام کا احیا پارلیمنٹ کی ذمہ داری قرار پا چکی ہے۔ اس عرصہ میں کسی کا عرصہ حیات ختم ہو چکا ہوگا اور کسی کا عرصہ سیاست۔ انتخابات کو امر جان، عہدہ طلبی، مہم جوئی کی قطعی نفی کر کے انتخابی قوانین مشاورتی اصول پر تشکیل دیئے

جاتے تو وہ قباحتیں بھی جو باوجود منصفانہ ہونے کے جانب دار اور پہلو دار ہو گئیں کالعدم ہو جاتیں۔ نصیب دشمنان بھی کچھ اور ہوتا اور نصیب دوستان بھی وہ کچھ کہا اور سنا نہ جاتا جو کہا اور سنا جا رہا ہے۔ چونکہ مارشل لاء سے براہ مغربی جمہوریت نظام اسلام کی طرف سفر لازم کر لیا گیا اس لئے ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم ضروری ہو گئیں۔ ورنہ ریفرنڈم کے نتائج کو آئینی حیثیت دینا، قرارداد مقاصد کو جو بے مقصد ہر آئین کے ساتھ چسپاں رہی، کسی طرح آئین کا مؤثر حصہ بنایا جانا، اللہ کی حاکمیت کے عملی نفاذ اور مغربی جمہوری یا دیگر مکاتب فکر کی مکمل نفی کرتی ہوئی اس قرارداد کے آئینی طور پر مؤثر و محرک ہو جانے کے بعد کیا انسانی اقتدار و اختیارات کا کوئی تصور بھی قانونی طور پر ممکن رہے گا۔ تبصرہ نگاروں کے غور کرنے کی بات ہے اور آئین ساز ترمیم کار ادارہ کی بھی کہ اگر آئین کی باقی ضمانت کو جوں کاتوں رکھا گیا تو ایسا تو نہیں ہو گا کہ قرارداد مقاصد اور آئین کے مقاصد جو اس سے پیشتر متنازع و متضاد تھے، اب متصادم ہو جائیں گے، آئینی ضمانتی زور آزمائی شروع ہو جائے گی۔ کیا لازم نہیں ہو جائے گا کہ پارلیمنٹ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے مؤثر اور ترجیحی اقدام کرے تاکہ اس ذمہ داری کو جو قوم اور صدر کی طرف سے ڈالی گئی ہے، حسب توقع سرانجام دیا جاسکے۔ یہ ترامیم صدر مملکت کے خصوصی اختیارات کے تحت اس لئے ضروری ہو گئیں کہ یہ ابتدائی اقدام اگر آئین پارلیمنٹ کے لئے اٹھا رکھا جاتا تو صحیح سمت متعین کرنے میں کوتاہی بھی ہوتی، دیگر کارپارلیمان کا التوا بھی ہوتا اور پارلیمنٹ کے اندر کی گروہ بندی عمدہ طلبی اور ہم جوئی پر بائیکاٹ کنندگان جاں بھی پھیلانے رکھتے۔ پارلیمنٹ کو یک سو و یک جہت رکھنا اور تفرقات میں اُلجھنے نہ دینا اس قدر مشکل کام ہے کہ مغربی جمہوری طریق انتخاب کو رو رکھنے کے بعد اس صورت حال سے کامیابی کے ساتھ نپٹنا اللہ تعالیٰ کی مدد خاص

کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ مغربی طرز فکر کے قمار بازوں کے طلسم کو توڑنے کے لئے جس
 جرأت اور قوت ایمان کی ضرورت ہے، اللہ کرے، دائم ہوتی چلی جائے۔ ہر کسی نے
 دیکھا اور سنا کہ ادھر انتخابات ہوئے ادھر ترمیم ہوئی اور ادھر مغربی
 جمہوریت نوازوں نے شور برپا کر دیا کہ ۱۹۷۳ کا آئین لٹ گیا، بے موت مارا
 گیا۔ حالانکہ خوف صرف یہ لاحق ہو رہا ہے کہ اس آئین کے لات و غزی کے مفادات
 غیر محفوظ نہ ہو جائیں، سیاسی تجارت خسارہ نہ کھا جائے۔ امر واقع یہ ہے کہ یہ محض
 خدشات ہیں۔ مفادات غیر محفوظ نہیں ہوئے۔ فقط ذرا حفاظت غیر محفوظ و
 غیر مسلح ہوئی ہے۔ عمدہ برآئی تو موجود ہے۔ ذرا عہدوں کی برائی کا یونانی علاج
 شروع ہوا ہے اور مریض ہیں کہ نسخہ بڑھ کر ہی چلا اٹھے ہیں۔ ایک شور برپا
 ہے۔ مگر جو بات حقیقتاً رُلا رہی ہے، اس کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔ وارنٹ برپا کیا گیا
 ہے کہ وزیر اعظم اور صدر کے اختیارات میں توازن کے بہانے صدر کے اختیارات
 بہت زیادہ کر دیئے گئے ہیں۔ اپنی بات کو زیادہ مؤثر کرنے کے لئے لفظ "بہت"
 کو خوب لمبا کر کے پڑھا اور بولا جاتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں، جنہوں نے اپنی غائڈنگ
 کے چٹکے کو طویل کرنے کے لئے تمام اختیارات وزیر اعظم کو دے کر تالیاں بجائی
 تھیں کہ آئین متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اُس وقت بھی رو دینا چاہیے تھا، اب
 کیوں روتے ہیں۔ اس لئے کہ اقتدار کے لئے رونے والے ہمیشہ بہانے بنا کر روتے
 ہیں۔ اصل معاملہ وزیر اعظم کے اختیارات کی کمی بیشی کا نہیں، تمہارے بائیکاٹ
 کی وجہ سے محروم رہنے کا ہے۔ جب آئین میں "صدر تمام شد" کے علاوہ او
 کچھ درج نہ تھا۔ اس وقت کے صدر سے تو کوئی ہمدردی نہ ہوئی، وزیر اعظم کے
 اختیارات نے ہاتھ دکھایا تو صدر پر ترس آنے لگا۔ ناقدین پر افسوس اس
 لئے ہے کہ وہ اختیارات، صوابدید، فرائض اور متوازن کے آئینی معانی سے

قصداً قطع نظر کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اس امر سے بھی کہ عوام کے منتخب صدر کو عوام کی نہیں اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ منزل تک قوم کو لے جانے کی ذمہ داری نبھانے کے لئے جس نگہبانی کی ضرورت ہے، لازم ہے کہ اس کے لئے قواعد متعین کئے جائیں۔ توازن کا مطلب و مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ترازو کے ایک پلڑے میں باٹ ہوں اور دوسرے میں ہم وزن گندم، تو اسی لئے لایا جائے کہ توازن بگڑ گیا۔ ایک پلڑے میں باٹ ہی باٹ اور دوسرے میں گندم ہی گندم، لہذا بڑا ظلم ہو گیا ہے۔ ہر چند کہ ڈنڈی بالکل سیدھی ہے، توازن قائم نہیں ہے۔ توازن اس وقت بگڑا کرتا ہے جب دائرہ کار متعین کرتے وقت قومی مفادات کی بجائے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھا جائے یا ایک دوسرے کے اختیارات میں دخل اندازی کے مواقع ناجائز طور پر یوں فراہم کر دیئے جائیں کہ ایک دوسرے پر نہ لگا رہے نہ قابو۔ اگر آئینی ادارے اپنے اپنے دائرہ کار میں با اختیار رہیں تو نہ کاروبار حکومت غیر متوازن ہوتا ہے نہ عمدہ داروں کے اختیارات۔ جب تک صدر پارلیمنٹ کے دائرہ کار میں مغل نہ ہوں، توازن کا بگڑ جانا قرار نہیں پا سکتا۔ مغربی جمہوری طریق انتخاب اور نظام اسلام کے نفاذ کے لئے پارلیمنٹ کے انتخاب کے پیش نظر ضروری تھا کہ پارلیمنٹ کے منشور سے انحراف کرنے، بے راہ یا بے عمل ہونے کی مسلسل و متواتر نگہبانی قائم رکھی جائے اور صدر کے اپنے فرائض سے غافل ہو جانے کی صورت میں صدر کی علیحدگی کا کوئی نظام فراہم کیا جائے۔ جو ہر دو نظام فراہم کر دیئے گئے۔ جبکہ سابقہ ضمانت میں وزیر اعظم کو مطلق العنان اور غیر جوابدہ بنانے کا مؤثر اہتمام موجود تھا اور آئین پر دستخط کرتے وقت کسی کو اعتراض کرنے کی حمیت میسر نہ آئی۔ کیا تسلیم کر لیا جائے کہ اس وقت کے نمائندوں اور نمائندہ سیاسی جماعتوں نے اپنی قومی اخلاقی و آئینی ذمہ داری نبھائی۔

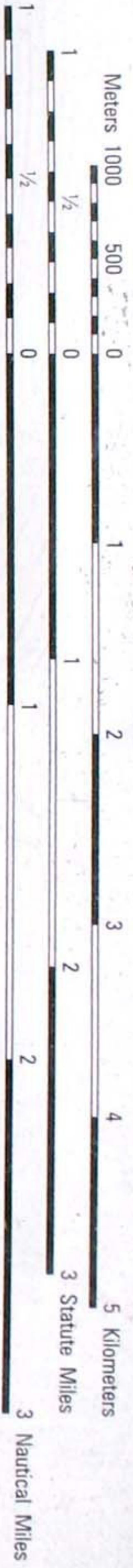
پارلیمنٹ کو بے راہ روی سے روکنے کے لئے ترمیم کے ذریعے محتاط اور موہوم
سی کوشش ضرور کی گئی مگر اس عمل کو مکمل اور موثر نہیں کہا جاسکتا۔ کاش
کوئی یہ کہہ سکتا کہ نظام اسلام کی ذمہ داری کو نبھانے کے لئے تعاون طلب تو
ہوں مگر کسی رکاوٹی عمل کو برداشت نہیں کروں گا۔ دیوار سایہ دار ہوں، سائے
کی دیوار نہیں ہوں۔ کاش ترمیم سازیہ جانتے کہ مغربی جمہوری پارلیمانی نظام میں
وزیر اعظم کا مقام ذہن پر ساز کا ہوتا ہے اور مقام صدر قلب حق آگاہ کا۔ اسلام
میں قلب و ذہن کے تضاد کی اجازت ہی نہیں۔ اسی لئے آئین اسلام میں صرف
ایک ہی عہدہ ہوتا ہے، امیر ریاست اسلام کا۔ دانش قلب حکمران ہوتی ہے،
تدبیر ذہن نہ قلب سے آزاد ہوتی ہے، نہ حکمران نہ قلب کے احکام سے باغی و
منکر نہ متصادم۔ یہ مغربی جمہوری نظام ہی کا خاصہ ہے کہ قلب و ذہن کے تضاد
کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ جہاں خالص پارلیمانی جمہوریت ہوتی ہے، وہاں قلب خوابیدہ
ہو جاتے ہیں، مکر دیئے جاتے ہیں۔ فقط ذہن بیدار رہتا ہے اور پارلیمنٹ سپریم ہو
جاتی ہے، حاکمیت اعلیٰ کی مالک۔ ریاست اسلام میں حاکمیت اللہ ہی کی ہوتی
ہے اور قلب حاکم پر اس ہی کی حکمرانی۔ اسی کو اتقا کہتے ہیں۔ معاشرتی رگوں کے
خون کو صاف کرنا اور معاشرتی سانس کو اکھڑنے نہ دینا صدر کی ذمہ داری ہوتی
ہے۔ وزیر اگر بتدبیر نہ ہو تو معاشرے کے لئے ناگوار بوجھ کے سوا کچھ بھی نہیں
ہوتا۔ اور قلب اس کو نہیں کہتے جو ذہن کے خوف سے دھڑکتا ہے، اُسے
کہتے ہیں جو ذہن کو خطاؤں کے انجام سے آگاہ کرتا رہے۔ معمولی جلسے کا صدر
بھی صرف اسی لئے ہوتا ہے کہ جلسے کی کارروائی بطریق احسن جاری رہے۔ کرسی
صدارت اور اپاہج کی وہیل چیر میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ ورنہ ریاست اپاہج
معاشرہ کا ہسپتال دکھائی دینے لگے گی اور سیاسی معاشرہ بزرگ ہاتھیوں

کا چرٹا یا گھر بن کر رہ جائے گا۔ قراردادِ مقاصد کے آئین کا مؤثر حصہ بن جانے کے
 بعد اگر مقصد یہی ہے کہ یہ عدالتی راہ نما اصول قرار پائے تو صدر تو پابند ہو گیا،
 مطلق تو نہ رہا۔ غور طلب امر تو یہ ہے کہ قراردادِ مقاصد کے اس عمل کے بعد ۱۹۷۲ء
 کے کس کس ضمن کی تین سات کو معروف قرار دو گے اور کس کس کو باطل و زھوقا
 قرار دینا پڑے گا۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ان حالات میں اگر نیشنل سکیورٹی کونسل
 نہ ہو تو کیا آئینی ان سکیورٹی کا عمل جاری نہ ہو جائے گا۔ پاس رہے کہ ہر آئینی
 سربراہ کو خراب نیت و غلط کار فرض کر کے تجزیہ کرنا کسی با شعور تجزیہ کا عمل نہیں
 کہلائے گا۔ مفروضات کو نیا قرار دے کر تجزیہ کرنا آئین شکن عمل ہے۔ آئین معاشرہ
 کے پرورش کنندہ ہوتے ہیں، معشوق بے وفا نہیں۔ اور سیاسی جماعت نامراد
 و مایوس عشاق کے جھگڑے کو نہیں کہتے۔ آئینی معاملات میں فقط یہ یقین و اعتماد
 حاصل کرنا ہوتا ہے کہ اس میں بے راہ روی کا علاج موجود ہے۔ اگر نہ ہو تو وہ
 دستاویزہ آئین ہے نہ دستور فقط حکم حاکمان ہے اور مرگِ مفاہات۔





Scale 1:50,000

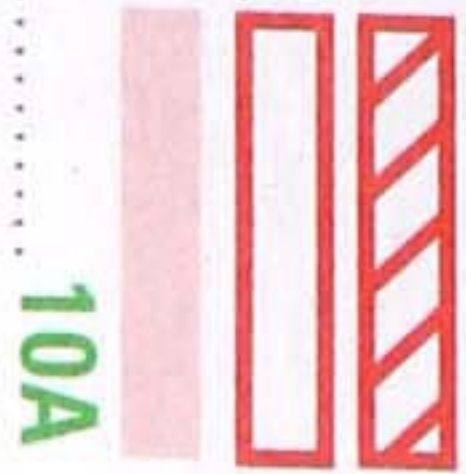


LITARY LEGEND

NT INFORMATION AS OF 3-99

ELEVATIONS IN METERS
CONTOUR INTERVAL 10 METERS

Access areas
 Areas
 10A



MA 7

.....
 MCB 3
 618

ED SOLELY TO BE A TRAINING AID
 ON. IT IS NOT INTENDED FOR
 OR ANY OTHER TYPE OF TRAINING
 OR ANY PURPOSE OTHER THAN
 DISTRIBUTION LIKE THE ORIGINAL

ELLIPSOID WORLD GEODETIC SYSTEM 1984 /
 GEODETIC REFERENCE SYSTEM 1980
 GRID 1,000 METER UTM ZONE 18
 PROJECTION TRANSVERSE MERCATOR
 VERTICAL DATUM NATIONAL GEODETIC VERTICAL DATUM OF 1929
 HORIZONTAL DATUM WORLD GEODETIC SYSTEM 1984 /
 NORTH AMERICAN DATUM 1983
 PRINTED BY NIMA 4-00

COORDINATE CONVERSION WGS 84 / NAD 83 TO NAD 27
 Grid: Subtract 32m.E., Subtract 213m.N.
 Geographic: Add 1.1" Long, Subtract 0.2" Lat.



100,000 M. SQUARE IDENTIFICATION

THUH

200

100 METER REFERENCE

1. Read large numbers labeling the VERTICAL grid line left of point and estimate tenths (100 meters) from grid line to point: 12 3
2. Read large numbers labeling the HORIZONTAL grid line below point and estimate tenths (100 meters) from grid line to point: 45 6

Example: 123456

WHEN REPORTING ACROSS A 100,000 METER LINE, PREFIX THE 100,000 METER SQUARE IDENTIFICATION IN WHICH THE POINT LIES.

Example: TH123456

1995
 G-M ANGL
 8 1/2° (150 M)

TO CONVE
 MAGNETIC AZ

